مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

اگست 2012

PDFBOOKSFREE.PK

کلام اللہ

کی اعجاز آفرینیاں

اوّل تو ہم قرآن کو سمجھ کر پڑھتے نہیں، اگر پڑھتے ہیں تو عمل نہیں کرتے
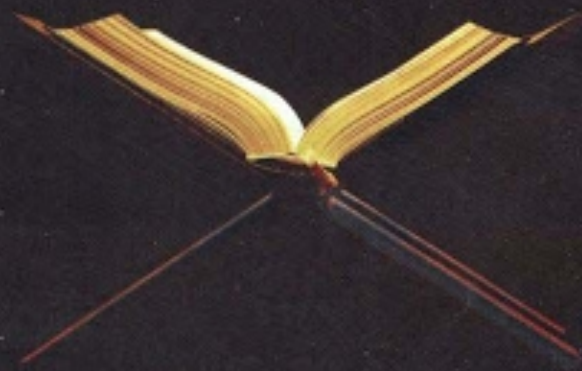
القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا، اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں۔

(آیات ۷۲ تا ۷۵)(حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزہ داروں کیلئے (جنت کا دروازہ) ریان ہے

سیدنا سہل رضی اللہ عنہ، نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک دروازہ ہے جسے "ریان" کہتے ہیں، اس دروازہ سے قیامت کے دن روزہ دار داخل ہوں گے ان کے سوا کوئی (بھی اس دروازے سے) داخل نہ ہوگا۔ کہا جائے گا روزہ دار کہاں ہیں؟ پس وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے ان کے سواء کوئی اس دروازے سے داخل نہ ہوگا پھر جس وقت وہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر لیا جائے گا غرض اس دروازہ سے کوئی داخل نہ ہوگا۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں

اظہار خیال

اسے المیہ کہیے یا......؟

مجی جناب کامران صاحب، مدیر منتظم ''سیارہ ڈائجسٹ''! السلام علیکم، سیارہ ڈائجسٹ شمارہ جولائی اعزازی ملا۔ جو، اب مطالعہ کی زینت بن کر میرے لیے باعث طمانیت ہے۔ اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا نہ کروں تو بخیل کہلاؤں۔ ''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں'' دنیائے ادب سے منتخب اقتباسات کا سلسلہ پچھلے کئی سال سے سیارہ ڈائجسٹ میں چھپتا آرہا ہے۔ کبھی کبھی معزز قارئین اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتے ہیں جس سے مجھے ایک گونا خوشی ہوتی ہے۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کا اعتراف ہے۔

اظہار خیال کے صفحات پر صفحہ 11 کو دیکھا تو کمپوزر صاحب نے ''نیرو'' کو ''نہرو'' کمپوز کر دیا جس سے مفہوم بدل گیا۔

جاوید چودھری اپنی کتاب ''زیرو پوائنٹ'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے اقتصادی پالیسیاں بنانے والوں سے پوچھا تھا کہ آپ لوگوں کو دودھ کی قیمت معلوم ہے؟ تو وہ گھبرا گئے، میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے کہا کہ ہماری بدقسمتی ملاحظہ کیجیے کہ ہماری اقتصادی پالیسیاں وہ لوگ بناتے ہیں جنہیں دودھ کے ریٹ تک معلوم نہیں اور یہ وہ چیز ہے جو پاکستان کے تقریباً 15 کروڑ عوام روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں بتایا کہ مہاتما گاندھی نے نہرو کو وصیت کی تھی کہ تم جب تک بھارت میں آٹے، سائیکل اور سینما کے ٹکٹ کی قیمت نیچے رکھو گے تمہاری حکومت چلتی رہے گی۔ ''نہرو'' نے گاندھی سے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ وہ اشیاء ہیں جو اس ملک کے غریب شہری استعمال کرتے ہیں۔ نہرو نے یہ بات پلے باندھ لی تھی لہٰذا وہ موت تک بھارت کا وزیراعظم رہا۔ ہمارے حکمران قیامت تک حکمران رہنا چاہتے ہیں مگر وہ غریب کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ آخر کیوں؟

مجلّہ کے ٹائٹل پیج پر عزب مآب جناب چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب اور ان کے بیٹے ڈاکٹر ارسلان کی تصاویر کے درمیان بحریہ ٹاؤن کے مالک ریاض حسین دکھائی دیتے ہیں جو کسی اور نادیدہ شخصیت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہیں اور نیچے پاکستانی کرنسی کے انبار لگے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم کب تک دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بنے رہیں گے۔ آج ہمیں آزاد ہوئے 65 سال ہو گئے لیکن قائداعظم کے بعد آج بھی ہمیں کسی مخلص لیڈر کی تلاش ہے۔ پاکستان بننے کے بعد تو قائداعظم محمد علی جناح نے فرما دیا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں پھر ان ہی لوگوں نے 1971ء میں پاکستان کو دولخت کر دیا۔ اس طرح مشرقی پاکستان بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان پاکستان کہلایا۔ آج بنگلہ دیش کی معیشت ہم سے مستحکم ہے......

یوسف رضا گیلانی صاحب ہمارے وزیراعظم تھے۔ انہوں نے سوئس حکام کو خط نہ لکھ کر اپنے جیالا ہونے کا ثبوت دیا۔ اس وجہ سے وہ گئے۔ ان کی جگہ پرویز اشرف صاحب آئے ہیں۔ کیا ان کے

آنے سے ہمارے ملک کے حالات بہتر ہوں گے؟ کیا وہ لوڈشیڈنگ پر قابو پالیں گے؟ کیا وہ بے لگام مہنگائی کو کنٹرول کر لیں گے؟ کیا وہ سوئس حکام کو خط لکھ دیں گے؟ کیا وہ کراچی اور بلوچستان میں لگی آگ بجھا پائیں گے......؟؟؟

12-12-12 کے متعلق قیاس آرائی ہے کہ یہ دنیا کے لیے بھاری ہوگا۔ لکھنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن یہ وقت کا ضیاع ہے۔ دنیا میں ہمیشہ ان قوموں نے ترقی کی جنہوں نے وقت کی قدرومنزلت کو جانا۔ آج وہ لوگ بام عروج پر ہیں جنہوں نے اپنی کل کی غلطیوں سے سبق سیکھا۔ پہلے سکول کالج اور یونیورسٹی کے طلباء فارغ وقت میں اپنے اسباق پر بحث و مباحثہ کرتے تھے آج وہ اپنے اپنے موبائل پر ایک دوسرے سے نئی نئی ٹیون شیئر کرتے ہیں۔ اسے المیہ کہیے یا......!!!

(قلندر حسین سید۔ احمد پور شرقیہ)

جادو، خواتین اور اسلام

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ کے خصوصی نمبر اس کی پہچان بن چکے ہیں۔ قرآن نمبر، رسول نمبر، عکس سیرت نمبر، انبیاء کرام نمبر، خلفائے راشدین نمبر اور بے شمار دیگر خصوصی اسلامی نمبرز لاکھوں قارئین کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کر رہے ہیں۔ حال ہی میں شائع ہونے والا خصوصی نمبر ''جادو، خواتین اور اسلام'' بھی قابل قدر کاوش ہے اور یقیناً وقت کی اہم ضرورت بھی۔ ان دنوں جس طرح نام نہاد عاملوں اور جادوگروں نے گلیوں، بازاروں میں اپنے کاروباری اڈے قائم کر رکھے ہیں اور گھروں کو برباد کر رہے ہیں اس کے لیے ضروری تھا کہ اس طرح کا خصوصی نمبر شائع کر کے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست کی طرف لایا جاتا۔ خاص طور پر ہماری خواتین اس قدر زیادہ جادو ٹونے کے چکروں میں پڑ چکی ہیں کہ گھر گھر تعویذات اور جنوں بھوتوں کے چکر چلتے نظر آتے ہیں اور لوگ بے چارے علم اور عمل نہ رکھنے کے باعث جھوٹے عاملوں کے چکروں میں پڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ یہ خصوصی نمبر یقیناً ہر گھر کی ضرورت ہے۔

(اشفاق حسین، لاہور)

چند غلطیاں

مکرمی جناب! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ ایک ادبی، سنجیدہ اور باوقار رسالہ ہے جو کہ بہت پڑھے لکھے اور باوقار لوگوں کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اس لیے اسے ہر غلطی سے مبرا ہونا چاہیے جبکہ ''ذخیرہ الفاظ بڑھائیے'' میں اس قدر غلطیاں تھیں کہ پڑھنے والے بدمزہ ہوئے ہوں گے اور آپ نے میرا افسانہ ''معجزے بھی بے شمار ہوتے ہیں'' شائع نہیں کیا۔ کیا وہ آپ کے معیار پر پورا نہیں اُترا؟ دراصل وہ میری قلبی واردات تھی جسے میں نے فرضی کردار لکھ کر افسانہ کا نام دے دیا تھا۔ اگر آپ شائع کر دیتے تو میرے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔

(تسنیم انور سلیمی، رحیم یار خان)

☆ تسنیم انور صاحبہ! غلطیوں کی نشاندہی اور تصحیح کا شکریہ۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ غلطیوں سے حتی الامکان بچا جائے تاہم بعض اوقات کمپوزنگ کی غلطیاں رہ جاتی ہیں جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ آپ کا افسانہ اس ماہ شامل اشاعت ہے!

سیکھنے کا عمل

محترم جناب کامران امجد صاحب! السلام علیکم، امید ہے آپ اور ادارے کے تمام اراکین خیریت سے ہوں گے۔ خوبصورت معلوماتی فکری، اصلاحی اور تفریحی تحریروں سے سجا جولائی کا سیارہ ڈائجسٹ سامنے ہے۔ اس بار ٹائٹل دلچسپ لگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ اور ادارے کے تمام اراکین کو ہمت اور تندرستی دیئے رکھے تاکہ آپ سب مل کر اسی طرح رسالے کی آب و تاب اور دلچسپی کو قائم رکھ سکیں۔ اس رسالے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جس کمال مہربانی سے نئے لکھنے والوں کو جگہ دیتے ہیں وہ لائق تحسین ہے۔

جب بھی کوئی نیا رائٹر لکھنا شروع کرتا ہے تو اس کی تحریر میں جا بجا خامیاں نظر آتی ہیں۔ ابتدائی تحریروں سے ہی کوئی بہترین رائٹر نہیں بن جاتا کہ وہ برگزیدہ سخن ور لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جائے "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک"

جب پرانے لکھنے والے حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے ہیں تو ایک لکھاری ترقی کی منازل زینہ بہ زینہ طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ سیکھنے کا عمل تو ساری زندگی قائم رہتا ہے۔

(عصمت اقبال عین، منگلا ڈیم)

رمضان المبارک اور قیمتوں میں اضافہ

جناب محترم کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ ماہ جولائی 2012ء کا شمارہ سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ کہانیوں، مضامین اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ تحریروں کو جگہ دینے کا شکریہ۔

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، اس ماہ مبارک کی برکتوں، رحمتوں اور مغفرتوں کو سمیٹنے کا ہمیں پھر موقع نصیب ہوا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کریں وہ کم ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس مبارک مہینے کی آمد سے قبل ہی تمام اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ایک مسلمان ملک میں انتہائی قابل مذمت عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مبارک مہینے کے مقصد کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

(ایس۔ امتیاز احمد، کراچی)

"چن لیا میں نے تجھے......"

جناب کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم، اللہ آپ کو صحت تندرستی دے۔ جون کا شمارہ دلچسپ اور قابل قدر تحریروں سے مزین تھا تاہم اندر کے صفحہ پر ماہ "مئی" لکھا ہے حالانکہ ٹائٹل پر "جون" ہے۔ صفحہ 220 پر شوکت افضل صاحبہ کی کہانی میں لکھا ہے: "کیونکہ ابھی دو عشرے قبل مدبر حسن نے خود مان لیا تھا کہ وہ جو کریں گی اسے منظور ہو گا" دو عشرے کا مطلب ہے بیس سال جبکہ مدبر حسن ابھی زیادہ سے زیادہ 26 سال کے ہوں گے، اس کا مطلب ہے مدبر نے چھ سال کی عمر میں شادی کے لیے ماں سے ہاں کہہ دی تھی۔ بہرکیف "چن لیا میں نے تجھے" مجموعی طور پر اچھی کہانی ہے۔

(اقبال تبسم، راولپنڈی)

پالیسی سے مطابقت

جناب کامران امجد خان صاحب، مدیر منتظم! ایک تحریر ارسال خدمت ہے، اس تحریر کو آپ کی خدمت میں ارسال کرنے سے پہلے میں نے اس میں کافی قطع و برید پہلے سے کر لی ہے تاکہ اسے کسی

بھی قسم کے تنازعہ کا باعث بننے سے بچایا جا سکے خاص طور پر آخری دو صفحے میں نے بدل دیئے ہیں۔ میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ کوئی بات آپ کی مرتب کردہ پالیسی سے تجاوز نہ کر پائے! اگر مجھ سے بھول چوک ہو گئی ہو تو مجھے معاف فرماتے ہوئے غلطی کو درست یا حذف کر دیجیے گا۔ بے حد شکریہ۔

(رشید قادری، کراچی)

رمضان المبارک اور عید بہانہ بن جائے

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! سدا خوش رہیں، السلام علیکم، جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بڑا اچھا لگا۔ سرورق پسند آیا۔ اسی حوالے سے اندرونی صفحات کی تحریریں بھی اچھی لگیں۔ معلومات میں بے حد اضافہ ہوا۔ ایسی باتوں کا بھلا ہم جیسوں کو کیسے علم ہو سکتا ہے۔ یہ صرف سیارہ ڈائجسٹ ہی بتا سکتا ہے۔

"یہ قربتیں یہ فاصلے"، بہترین تحریر رہی۔ "زندہ قبر" بھی اچھی تھی۔ "ظالم مہمان" نے بھی متاثر کیا۔ بزم شاعری ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگی۔ اظہار خیال میں موقع دینے کا شکریہ۔ غزل کی اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔

باقی سکول میں نہم کے داخلوں کے سلسلے میں ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔ سمر کیمپ بھی ہیں یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں چھٹیاں ہیں۔ ہماری دسمبر کی چھٹیاں بھی دہم کے داخلوں کی نذر ہوتی تھیں اب بھی کام کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ فارغ ہو کر دوبارہ لکھوں گی۔ البتہ آنے والے رمضان المبارک اور عیدالفطر کی تمام قارئین اور اہل ایمان کو بہت بہت مبارکباد۔ اللہ کرے کہ یہ ماہ مبارک ہمارے لیے "ایک" بن جانے کا بہانہ بن جائے اور ہم تمام اختلافات بھلا کر ملکی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کر سکیں (آمین، ثم آمین)

(یاسمین کنول، پسرور)

صلاحیتوں کے اظہار کا موقع

جناب مدیر اعلیٰ صاحب! السلام علیکم، روزانہ ہی سینکڑوں یا شاید اس سے بھی زیادہ تعداد میں آپ کو خط موصول ہوتے ہوں گے۔ کچھ جان پہچان والوں کے اور زیادہ تر انجان لوگوں کے، گویا میرا خط آخر الذکر شمار ہوا۔ میں نعمان اسحاق ضلع مظفر گڑھ سے تعلق رکھتا ہوں اور Air University اسلام آباد میں الیکٹریکل انجینئرنگ کا طالبعلم ہوں۔ میں آٹھویں جماعت سے ہی شاعری کر رہا ہوں۔ شاعری میرا فن اور افسانہ نگاری میرا شوق ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ پہلی بار ورق گردانی سے گزرا جو کئی ماہ سے چاچو کے گھر بلاناغہ آ رہا ہے۔ بہت مزہ آیا۔ سب سے اچھی بات یہ لگی کہ نئے ٹیلنٹ کو سراہنا اور اسے منظر عام پر لے کر آنا اس کا مقصد ہے جو واقعی ایک شاندار اور قابل ستائش قدم ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کسی اور رسالے یا ڈائجسٹ کو یہ خیال آیا ہو۔ مجھے دنیائے ادب میں خود کو متعارف کرانے کے لیے ایک پلیٹ فارم چاہیے تھا جو کل تک میری دسترس میں نہیں تھا مگر آج "سیارہ ڈائجسٹ" کی صورت میں میرے سامنے میرے ہاتھ میں ہے۔ اپنی تازہ نظم اور غزل بھیج رہا ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی اور امید ہے کہ "اس ماہ کا شاعر" کے معیار پر پورا بھی اُترے گی۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو ایک گزارش ہے کہ شائع کر دیجیے گا۔ آپ کی نوازش ہو گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

(نعمان اسحاق، مظفر گڑھ)

رمضان مبارک

پہلا عشرہ رحمت

نام ایام	رمضان المبارک	جولائی	منتہائے سحر	وقت افطار
ہفتہ	1	21	3:35	7:09
اتوار	2	22	3:36	7:08
پیر	3	23	3:37	7:07
منگل	4	24	3:38	7:07
بدھ	5	25	3:39	7:06
جمعرات	6	26	3:40	7:06
جمعہ	7	27	3:41	7:05
ہفتہ	8	28	3:42	7:04
اتوار	9	29	3:43	7:04
پیر	10	30	3:44	7:03

دوسرا عشرہ مغفرت

نام ایام	رمضان المبارک	جولائی	منتہائے سحر	وقت افطار
منگل	11	31	3:45	7:02
بدھ	12	اگست	3:46	7:01
جمعرات	13	2	3:47	7:00
جمعہ	14	3	3:48	6:59
ہفتہ	15	4	3:49	6:58
اتوار	16	5	3:50	6:57
پیر	17	6	3:51	6:56
منگل	18	7	3:52	6:55
بدھ	19	8	3:53	6:54
جمعرات	20	09	3:54	6:53

تیسرا عشرہ نجات

نام ایام	رمضان المبارک	جولائی	منتہائے سحر	وقت افطار
جمعہ	21	10	3:55	6:52
ہفتہ	22	11	3:56	6:51
اتوار	23	12	3:57	6:50
پیر	24	13	3:58	6:49
منگل	25	14	3:58	6:48
بدھ	26	15	3:59	6:47
جمعرات	27	16	3:59	6:47
جمعہ	28	17	4:00	6:46
ہفتہ	29	18	4:00	6:46
اتوار	30	19	4:01	6:45

لاہور سے دوسرے شہروں کا فرق

شہر	فرق
گوجرانوالہ:	2 منٹ بعد
جہلم:	4 منٹ بعد
ملتان:	11 منٹ بعد
گجرات:	3 منٹ بعد
اٹک:	10 منٹ بعد
بوریوالا:	8 منٹ بعد
سیالکوٹ:	3 منٹ بعد
پشاور:	13 منٹ بعد
میاں چنوں:	10 منٹ بعد
چکوال:	6 منٹ بعد
کراچی:	29 منٹ بعد
اوکاڑہ:	2 منٹ بعد
ڈیرہ غازی خان:	15 منٹ بعد
راولپنڈی:	6 منٹ بعد
ساہیوال:	3 منٹ بعد
سرگودھا:	6 منٹ بعد
مری:	4 منٹ بعد
وہاڑی:	10 منٹ بعد
فیصل آباد:	10 منٹ بعد
قصور:	1 منٹ بعد

دستک

کامران امجد خان
Editorsayyara@yahoo.com
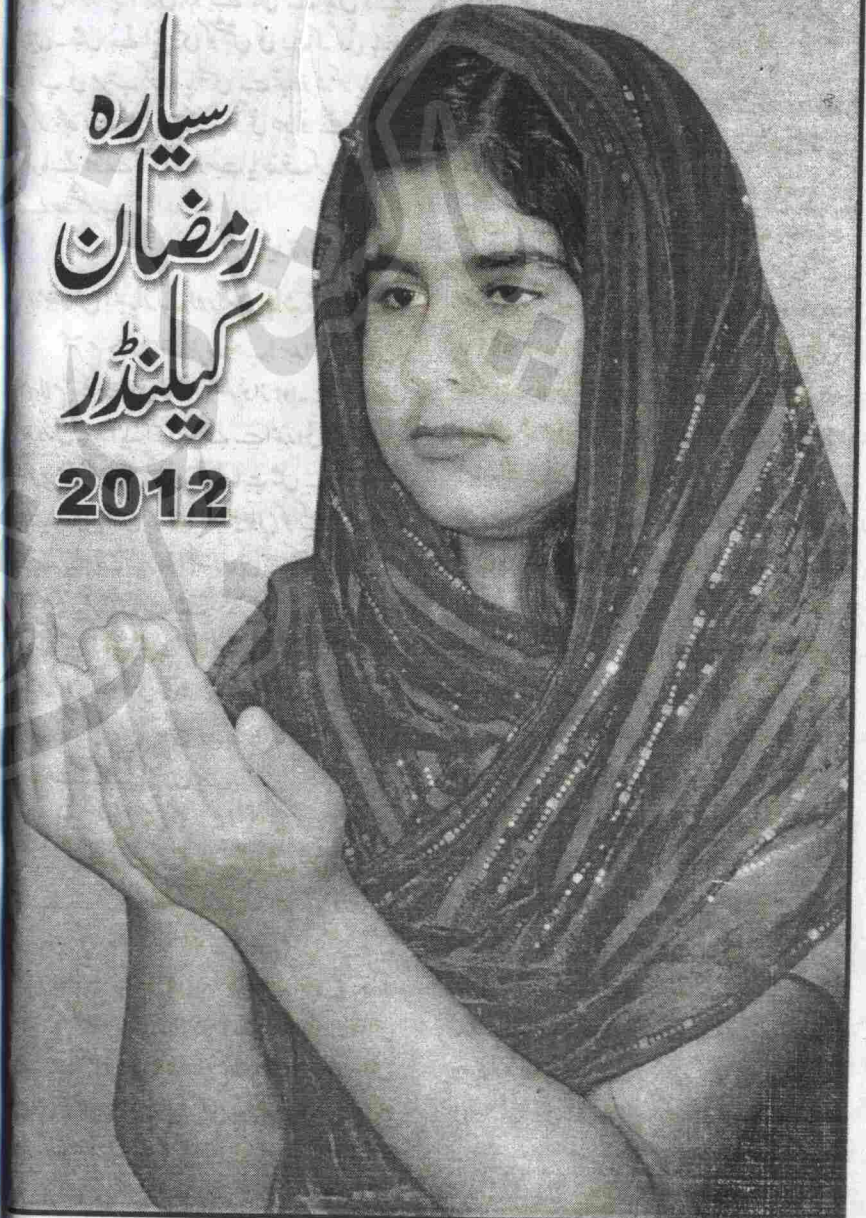
قائد اور اقبال کے خواب کی حقیقی تعبیر

ملک ایک بار پھر بحرانوں کی زد میں ہے، ہمارے یہاں سیاستدانوں کا عجب وطیرہ ہے کہ ملک کے مستقبل کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن مسند اقتدار پر قبضہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ حالانکہ دنیا کی تمام جمہوری مملکتوں میں اب یہ روایت ایک مضبوط اصول کی شکل اختیار کر چکی ہے کہ اگر حکمران جماعت کے سربراہ یا اس جماعت کے کسی بھی اعلیٰ عہدیدار کی ذات پر کوئی ایسا الزام لگتا ہے کہ جس سے ملک اور عوام کسی طور متاثر ہوتے ہوں تو وہ فوری طور پر استعفیٰ دے دیتا ہے بلکہ مغربی ممالک تو اس سطح پر پہنچ چکے ہیں کہ کسی بھی اہم عہدے پر فائز شخص پر معمولی سا الزام لگتے ہی وہ اخلاقی بنیادوں پر استعفیٰ پیش کر دیتا ہے اور خود کو اپنے عہدے سے الگ کر لیتا ہے لیکن ہمارے یہاں یہ کلچر فروغ نہیں پا سکا۔ خاص طور پر یہ سیاستدان ملکی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی وجہ سے ملک بحرانوں کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔

پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت بھی ملک کو بحران در بحران کی کیفیت سے دوچار کیے ہوئے ہے لیکن نئے انتخابات کروانے پر تیار نہیں۔ ایک وزیراعظم کی قربانی اور عدلیہ اور مقننہ (پارلیمان) کے درمیان محاذ آرائی کی پالیسی سے ملک کو جو نقصان ہو رہا ہے اس کی انہیں قطعاً پرواہ نہیں بلکہ آصف علی زرداری ہر قیمت پر سوئس اکاؤنٹس کو بچانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ خواہ اس کے لیے انہیں کئی وزیراعظم قربان کرنا پڑیں یا نت نئے بحرانوں اور آئین سے متصادم قوانین ہی کیوں نہ تشکیل دینے پڑیں۔ یہ بات واضح ہے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اعلیٰ عدلیہ سے محاذ آرائی پر تلی بیٹھی ہے۔ توہین عدالت سے استثنیٰ کا حالیہ بل اسی سلسلے کی کڑی ہے جس کی رو سے صدر، وزیراعظم، گورنر اور چند دیگر اعلیٰ شخصیات کو عدالت کی توہین کی کھلی چھٹی دینے کا بل منظور کروا لیا گیا ہے۔ حکمرانوں نے اپنے تئیں ایک اور این آر او منظور کروا لیا ہے لیکن حقیقت میں یہ محض خود کو ڈھکوسلے دینے والی بات ہے کہ سپریم کورٹ واضح کر چکی ہے کہ ملک میں آئین کی تشریح کا اختیار اعلیٰ عدلیہ کو حاصل ہے اور پارلیمنٹ آئین سے متصادم قوانین تشکیل نہیں دے سکتی۔ اس کے باوجود اس بل کا پیش کیا جانا اور اسے منظور کرنا دراصل پیپلز پارٹی کے رویے کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ہر صورت اپنے موقف پر قائم رہنا چاہتی ہے کہ سوئس حکام کو خط نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ صدر کو استثنیٰ حاصل ہے۔ چنانچہ اس کے لیے نئے وزیراعظم کو قربانی سے بچانے کے لیے یہ قانون تشکیل دیا گیا ہے۔

توہین عدالت سے استثنیٰ اور صدر کے استثنیٰ کے معاملے کا کسی بھی اخلاقی یا اصولی معیار پر دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کیسی سوچ ہے کہ ملک میں چند مخصوص لوگوں کو قانون توڑنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے، بالخصوص ان لوگوں کو جو اقتدار کے منصب پر فائز ہوں۔ یہ سوچ نہ صرف انصاف اور اخلاقی اقدار کے خلاف ہے بلکہ ہمارے مذہب اور آئین سے بھی متصادم ہے کہ جن کی رو سے ہر شخص کے لیے یکساں قانون کا لاگو ہونا ضروری ہے مگر ہمارے سیاستدان ایسی کسی اخلاقی، اصولی یا مذہبی دلیل کو نہیں مانتے، ان کے نزدیک ملک اہم ہے اور نہ ہی اصول اور ضابطے...... ان کیلئے تو بس اپنا اقتدار اور سرمایہ بچانا اہم ہے۔ پھر چاہے ملک دولخت ہو یا مارشل لاء لگ جائے، انہیں کوئی سروکار نہیں۔ بس ان کی ذات اور ان کی دولت محفوظ رہے۔

پیپلز پارٹی عدلیہ اور فوج کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی روش اپنائے ہوئے ہے کہ یہ دونوں ادارے ملک میں جمہوری نظام کو قائم رکھنے کے لیے صبر و تحمل اور برداشت کی روش اپنائے ہوئے ہیں، وگرنہ گزشتہ چار برس میں ایسے کئی مواقع اور بحران آئے جب اعلیٰ عدلیہ فوج کو طلب کر کے حکمرانوں کے خلاف ایکشن کے لیے کہہ سکتی تھی یا فوج خود میموگیٹ، آئی ایس آئی کے خلاف سازشوں اور کرپشن کے علاوہ دیگر کئی معاملات کو بنیاد بنا کر مارشل لاء یا ایمرجنسی نافذ کر سکتی تھی کہ اس سے قبل کہیں کم سنجیدہ نوعیت کے معاملات کو بنیاد بنا کر ایسا کیا جاتا رہا ہے لیکن ان دونوں اداروں نے ملک کے مفاد اور جمہوری نظام کو قائم رکھنے کے لیے صبر و برداشت کا دامن تھامے رکھا لیکن پیپلز پارٹی کی قیادت آئندہ انتخابات میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے سیاسی شہادت کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ فوج اور عدلیہ ان کے خلاف انتہائی قدم اٹھائیں تاکہ انہیں آئندہ انتخابات میں مظلوم بننے اور دوبارہ عوام کی ہمدردیاں سمیٹنے کا موقع مل سکے۔

سپریم کورٹ نے وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کو سوئس حکام کو خط لکھنے کے لیے 25 جولائی تک کی مہلت دی ہے اور واضح کیا ہے کہ اگر اس تاریخ تک خط نہ لکھا گیا تو سپریم کورٹ کوئی بھی کارروائی کر سکتی ہے۔ حکم میں سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی حکم عدولی اور ان کو سزا دیئے جانے کا

حوالہ بھی دیا گیا ہے تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ اب یہ پیپلز پارٹی پر منحصر ہے کہ وہ ایک اور وزیراعظم قربان کرنے اور ملک کو انتہائی خطرناک بحران سے دوچار کرنے کو ترجیح دیتی ہے یا پھر اعلیٰ عدلیہ کے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔ اب تک کی روش بالخصوص توہین عدالت سے استثنیٰ کے قانون کی منظوری اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ پیپلز پارٹی عدالتی احکامات کی تعمیل کسی صورت نہیں کرنا چاہتی۔ نتیجتاً ملک کو ایک انتہائی خطرناک اور گمبھیر بحران کا سامنا ہے جس کے نتائج اس قوم کو بھگتنا ہوں گے۔ سیاستدانوں کو ملک کی پرواہ ہے نہ عوام کی لہٰذا اس ملک کے عوام جو 1947ء سے اب تک سیاستدانوں کے ''کرتوتوں'' کا انجام بھگت رہے ہیں ایک بار پھر اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔

ملک پر اقتدار اور سرمائے کو ترجیح دینے والوں کو جان لینا چاہیے کہ یہ ملک ہے تو سب کچھ ہے، ان کا اقتدار اور حکمرانی بھی اسی ملک اور اس کے عوام کی مرہون منت ہے۔ ملک بچانے کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ عدلیہ سے تصادم کی روش کو ترک کر کے فوری طور پر نئے انتخابات کروا دیئے جائیں اور فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ ملک اب ایک اور سنگین بحران کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ہے۔ اسی ماہ مبارک میں ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا اور نوید ہے کہ اس بار یوم آزادی یعنی 14 اگست برسوں بعد ایک بار پھر شاید ستائیس رمضان المبارک کو ہی آ رہا ہے۔ اس عظیم رات اور یادگار موقع پر ہم سب کو ایک نئے اور روشن پاکستان کے لیے دل سے عہد کرنا ہوگا۔ سیاستدانوں کو غلطیاں نہ دہرانے اور ذاتی مفاد پر ملکی مفاد کو ترجیح دینے کا عہد کرنا ہو گا...... جبکہ عوام کو بھی اب یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہمیں وقتی اور ذات برادری جیسے معمولی مفادات کو پس پشت ڈال کر آئندہ نسلوں کیلئے مضبوط اور ترقی یافتہ پاکستان کی بنیاد رکھنی ہے اور اس کے لیے حقیقتاً مخلص اور کچھ کر دکھانے کے جذبے سے سرشار قیادت کو منتخب کرنا ہوگا جو قائد اور اقبال کے خواب کی حقیقی تعبیر ہمیں دے سکے! انشاء اللہ!

سیارہ رپورٹ

کلام اللہ کی اعجاز آفرینیاں

اول تو ہم قرآن کو سمجھ کر پڑھتے نہیں، اگر پڑھتے ہیں تو عمل نہیں کرتے!

ہم روزانہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں، ہم عام زندگی میں آیات بھی دہراتے ہیں لیکن ہم ان آیات سے اثر نہیں لیتے، ہم قرآن مجید پڑھنے کے باوجود بدعنوان بھی ہیں، چور بھی، دھوکے باز بھی، ظالم بھی، بے انصاف بھی، شدت پسند بھی، کوتاہ بھی، کم فہم بھی، علم دشمن بھی، منافق بھی، فرقہ پرست بھی، بدحال بھی، غریب بھی اور بیمار بھی، کیوں؟ قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے، یہ تو اقوام عالم کے لیڈر ہونے چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں! ایسا کیوں نہیں؟

سید قطب شہید (مصری)

ابھی میں چھوٹا بچہ ہی تھا کہ میں قرآن پڑھنے لگا۔ اس کے مضامین کے گوشوں تک میرے ادراکات کی رسائی نہ تھی اور نہ ہی اس کے بلند اغراض کو میرا فہم احاطہ کرسکتا تھا۔ تاہم میں اس کے کچھ اثرات اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ میرا سیدھا سادہ ذہن تلاوت قرآن کے دوران بعض خیالی صورتیں اخذ کرتا جو بظاہر بڑی معمولی سی ہوتیں لیکن میرے نفس میں اشتیاق اور حواس میں لذت پیدا کرتی تھیں۔ میں دیر تک فرحت و نشاط کے ساتھ ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ ان سادہ تصاویر میں سے جو اس وقت میرے ذہن میں مرتسم ہوا کرتی تھیں ایک وہ تصویر ہے جو اس آیت کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں منقش ہوا کرتی تھی۔

ترجمہ آیت: ”اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر سے کرتا ہے، پس اگر اسے بھلائی پہنچے تو وہ اس (عبادت) پر مطمئن رہتا ہے، لیکن اگر اسے کوئی

آزمائش پیش آجائے تو وہ (عبادت سے) اپنا منہ موڑ لیتا ہے۔ ایسا آدمی دنیا و آخرت دونوں طرف سے خسارے میں رہا۔“ (الحج۔۱۱)

اس خیالی تصور کو اگر میں کسی کے سامنے پیش کروں تو شاید وہ اس کی ہنسی اُڑائے۔ یہ تصویر یوں بنی کہ میں ایک گاؤں میں رہتا تھا اور گاؤں کے قریب ہی وادی کا ایک خاص ٹیلہ میری نگاہ میں تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ گویا ایک شخص ہے جو ایک جھکے ہوئے بلند مکان کے کنارے پر یا تنگ سے ٹیلے کی چوٹی پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے، لیکن وہ اپنی حالت قیام پر قابو نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنی ہر حرکت کے دوران میں یوں کانپ رہا ہے گویا کہ گرا ہی چاہتا ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں، اس کی حرکات پر غور کرتا ہوں اور عجیب کیف و نشاط محسوس کرتا ہوں۔ ایسی ہی سادہ اشکال میں سے ایک تصوراتی منظر وہ ہے جو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۶ کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں جاگزین ہوا تھا۔

ترجمہ آیت: ”اور (اے نبی!) ان کو پڑھ کر سنایئے اس شخص کا حال کہ جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں، اور وہ ان میں سے بھاگ نکلا، پھر اسے اپنے پیچھے لگا لیا شیطان نے اور وہ گمراہوں میں شامل ہوگیا۔ اگر ہم چاہتے تو ہم اسے ان آیات کے ذریعے بلندی عطا کرتے، لیکن وہ تو خود ہی زمین سے چپک کر رہ گیا، اور اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑ گیا۔ سو (اب) اس کی مثال ایک کتے کی سی ہے۔ اگر تُو اس پر کوئی بوجھ ڈالے تو زبان لٹکا دے، یا اگر اسے چھوڑ دے تو بھی زبان لٹکا دے۔“ (الاعراف ۱۷۶)

میں اس آیت کے مضامین اور اغراض کو تو نہ سمجھتا تھا لیکن یہ نقشہ میرے خیال میں ضرور آتا تھا کہ ایک شخص ہے جس کا منہ کھلا ہوا ہے، زبان لٹک رہی ہے اور وہ کتے کی طرح مسلسل ہانپ رہا ہے۔ میری نظریں اس سے نہ ہٹتی تھیں لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں اس کے قریب جانے کی جرأت بھی نہ کرسکتا تھا۔ اس طرح کی مختلف صورتیں میرے کوتاہ ذہن میں منقش ہوتی تھیں اور میں ان میں غور و فکر کرتے ہوئے لطف اندوز ہوتا۔ اس وجہ سے میرا دل قرآن کریم کی تلاوت کا مشتاق رہتا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے وقت اس کی وادیوں میں ایسی تصاویر کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ یہ دن وہ تھے جو انہی عمدہ یادوں اور سادہ تخیلات کے ساتھ بیت گئے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب میں نے علمی اداروں میں تحصیل علم کا آغاز کیا اور تفاسیر کی کتابوں سے قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اساتذہ سے قرآن کی تفسیر سنی لیکن اس پڑھنے اور سننے میں مجھے وہ بے مثال لذت حاصل نہ ہوتی جو مجھے بچپن میں حاصل ہوتی تھی۔ افسوس! قرآن میں حُسن کے وہ سب نشانات مٹ گئے اور لذت و اشتیاق سے قرآن خالی ہوگیا۔ کیا یہ دو قرآن ہیں؟ ایک بچپن کا قرآن جو شیریں، سہل اور شوق افزا تھا اور دوسرا جوانی کا قرآن، جو مشکل، پیچیدہ اور بظاہر غیر مربوط! شاید یہ

تاثرات مقلدانہ اندازِ تفسیر کا کرشمہ تھے۔

میں نے اب قرآن کو تفاسیر کی مدد سے پڑھنے کے بجائے خود قرآن کی مدد سے پڑھنا شروع کیا تو پھر مجھے وہی محبوب اور دل خوش کن قرآن میسر آ گیا۔ قرآن سے شوق و محبت پیدا کرنے والی وہی سرور آفریں تصاویر مجھے پھر مل گئیں لیکن اب یہ پہلے کی طرح سادہ نہ تھیں، کیونکہ میرے فہم میں تغیر آ گیا تھا۔ اب میں ان کے اغراض و مقاصد کو سمجھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ وہ زندگی میں پیش آنے والے بعض واقعات کی مثالیں ہیں جو نمایاں کی جا رہی ہیں، لیکن ان کی اثر آفرینی اور جاذبیت لازوال اور دائمی ہے۔

الحمدللہ میں نے قرآن کو پالیا!

اب میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں اس پہلو سے کچھ بحثیں بطور نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ مجلّہ ''المقتطف'' میں ۱۹۳۹ء کو ''التصویر الفنی فی القرآن'' کے عنوان سے میں نے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں میں نے قرآن کی چند تصاویر حقائق لے کر منعکس کیں اور ان کے فنی حسن و جمال کو واضح کیا اور خدائے قادر کی عظیم قدرت کی نشاندہی کی جو الفاظ کی وساطت سے ایسی مصوری کرتی ہے کہ جس سے رنگین مؤقلم اور کیمرے عاجز ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مضمون ایک مستقل کتاب کے لیے موضوع بحث بن سکتا ہے۔ کئی سال گزر گئے اور قرآن کی یہ تصاویر میرے خیالات میں بنتی جا رہی تھیں اور ان میں فنی اعجاز نمایاں نظر آتے تھے اور جب میں ان کو بغور دیکھتا تو میرا یہ خیال پختہ ہو جاتا کہ میں اس کام کو اپنے ذمے لوں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں اور جہاں تک ممکن ہو اسے وسعت دوں۔ وقتاً فوقتاً میں قرآنی مطالعہ میں منہمک رہا اور اس سے بے عدیل تصاویر اخذ کرتا رہا اور اس موضوع کو زیر بحث لانے کا شوق میرے ذہن میں اور زیادہ پختہ ہوتا گیا لیکن اس معاملے میں کچھ ایسے موانع بار بار پیش آ جاتے کہ یہ چیز بس ایک دلی حسرت اور ذہنی اشتیاق بن کر رہ جاتی۔

آخرکار پورے پانچ سال بعد مجلّہ ''المقتطف'' میں اس سلسلہ کی پہلی کڑی شائع کرنے کا موقع ملا۔ میں نے بحث کا آغاز کیا تو میرا پہلا کام یہ تھا کہ میں قرآن میں سے فنی تصاویر کو جمع کروں، انہیں پیش کروں اور پھر اس ادبی مصوری کی خوبیوں کو اُجاگر کروں اور خصوصاً فنی پہلوؤں کو واضح کروں کیونکہ اس مبحث میں میرا مقصد دیگر قرآنی مباحث و مطالب پیش کرنا نہ تھا بلکہ خالص فنی پہلو زیر توجہ تھا۔

مگر اب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نئی حقیقت ہے جو میرے سامنے اُبھر کر آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ قرآنی تمثیلات قرآن کے دیگر اجزاء و عناصر سے کوئی مختلف حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ قرآن کریم کا اسلوب بیان ہی ادبی تصویر نگاری ہے۔ یہ ایسا اسلوب بیان ہے جسے سوائے تشریعی احکام بیان کرنے کے، باقی تمام امور کی وضاحت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اب میرے سامنے چند ادبی تصاویر کے جمع کر دینے اور

ان کو مرتب کر دینے کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ سرے سے اصول تعبیر ہی کی ایک نئی راہ اجاگر کرنا میرا موضوع بن گیا۔ توفیق الٰہی سے، ایک غیر مترقبہ نعمت تھی جو میرے لیے مقدر ہوگئی۔

سو اسی بنیاد پر اس کتاب کے مباحث کا آغاز ہوا۔ اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ اسی متذکرہ نظریہ کو واضح کرنے کے لیے ہے اور طریق تعبیر قرآنی کی ایک اہم خصوصیت کو کھول کر بیان کرنا مقصود ہے۔

جب یہ مقابلہ میں نے مکمل کر لیا تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے قرآن میرے دل میں نئے روپ کے ساتھ اُترا ہے۔ میں نے قرآن کو اس طرح پایا جس طرح پہلے کبھی نہ پایا تھا۔ قرآن میرے دل میں ایک حسین وجمیل شکل میں تھا۔ ہاں بالیقین وہ پہلے بھی ایسے ہی حسین وجمیل تھا، لیکن منتشر ومتفرق حالت میں اور آج وہ میرے سامنے ایک مربوط مجموعہ کی حیثیت سے ہے جو ایک خاص مضبوط بنیاد پر قائم ہے...... ایک ایسی بنیاد جس میں عجیب وغریب ربط ہے...... جس کی مجھے پہلے سمجھ بوجھ نہ تھی...... جس کا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا، اور شاید کسی اور کے تصور میں بھی ایسا نہ ہو۔

اگر مجھے ان قرآنی تصاویر کو منتقل کرنے اور پیش کرنے میں اپنے ذاتی تصورات اور ضمیر کے احساس کی پوری ترجمانی کرنے کی توفیق حاصل ہو جائے، تو پھر یہی چیز بلاشبہ اس کتاب کی مکمل کامیابی کی ضامن ہوگی۔

(مقدمہ ''تصویر الفنی فی القرآن'' ترجمہ مولانا عبدالرشید ارشد)

میری امی! مجھے یاد ہے کہ گاؤں میں رمضان کا پورا مہینہ جب ہمارے گھر پر قاری حضرات، دل نشیں انداز میں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے تو آپ گھنٹوں کان لگا کر پوری محویت کے ساتھ پردے کے پیچھے سے سنا کرتی تھیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھا جب شور کرتا، جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے، تو آپ مجھے اشاروں کنایوں سے چپ رہنے کی تلقین کرتی تھیں، اور پھر میں بھی آپ کے ساتھ قرآن سننے میں شریک ہو جاتا۔ میں اگرچہ اس وقت مفہوم سے ناواقف تھا مگر میرا دل الفاظ کے معجزانہ سخن سے محظوظ ہوتا۔

پھر جب آپ کے ہاتھوں میں پروان چڑھا تو آپ نے مجھے بستی کے ابتدائی مدرسہ میں بھیج دیا۔ آپ کی سب سے بڑی آرزو ہوتی کہ اللہ میرے سینے کو کھول دے اور میں قرآن حفظ کر لوں، نیز اللہ مجھے خوش الحانی کی نعمت سے نوازے...... اور پھر میں آپ کے سامنے بیٹھا ہمہ وقت تلاوت کیا کروں۔ چنانچہ میں نے قرآن حفظ کر لیا، یوں آپ کی آرزو کا ایک حصہ پورا ہو گیا۔

میری امی! آپ کا وہی معصوم پیارا بچہ، آج آپ کے خورد سال لخت جگر کی حیثیت میں آپ ہی کی تعلیم وتربیت کا ثمرہ آپ کی خدمت میں ہدیۂ پیش کر رہا ہے۔ اگر حسن ترتیل

کے پہلو سے وہ کچھ کوتاہ ہے، تو حسن تاویل کی نعمت سے ضرور بہرہ مند ہے۔

(انتساب ''تصویر الفنی فی القرآن'')

تین سوال

قیصر روم نے ایک دفعہ خلیفہ منصور کے حضور میں اپنا وزیر اس غرض سے بھیجا کہ وہاں کے علماء و فضلاء کو جمع کر کے ان سے تین سوالات دریافت کرے۔ اگر وہ ان کے مسکت اور تسلی بخش جواب دے دیں تو فبہا، ورنہ خلیفہ کو آئندہ خراج ادا کرنا ہوگا۔ چنانچہ خلیفہ منصور نے دربار لگایا اور علماء وفضلاء کو جمع کیا۔ ان میں امام ابوحنیفہ بھی شامل تھے۔ رومی وزیر منبر پر بیٹھا اور اپنے سوال پیش کیے۔ مختلف اصحاب علم نے جواب دیئے مگر بات قاطع نہ ہو سکی۔ آخر امام ابوحنیفہؒ نے خلیفہ سے جوابات دینے کی اجازت چاہی۔

امام ابوحنیفہؒ (رومی وزیر سے): تم اس وقت سائل کی حیثیت میں ہو......، اور میں مجیب (یعنی جواب دینے والا) ہوں۔ پس منبر پر بیٹھنا سائل کا نہیں، بلکہ مجیب کا منصب ہے۔

خلیفہ: ہاں، یہ بات بہت درست ہے۔ (اس پر رومی وزیر منبر سے اُتر آیا اور امام ابوحنیفہؒ اس کی جگہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اس ڈرامائی صورتِ واقعہ سے مجلس کا ماحول تبدیل ہو گیا)

امام ابوحنیفہؒ (رومی وزیر سے): اب اپنے سوالات پیش کرو۔

رومی وزیر: میرا پہلا سوال یہ ہے کہ خدا سے پہلے کیا چیز تھی؟

امام ابوحنیفہؒ: تم ایک، دو، تین، چار، پانچ کی گنتی تو جانتے ہو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ ایک سے پہلے کونسا عدد ہے؟

رومی وزیر: ایک سے پہلے کوئی عدد نہیں، یہی سب سے پہلے ہے۔

امام ابوحنیفہؒ: تو پھر جب محض حسابی عدد ''ایک'' کا حال یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی عدد کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو خدا سے جو حقیقت میں واحد (ایک) ہے، اس سے پہلے کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے؟

رومی وزیر: میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ خدا کا منہ کس طرف ہے؟

امام ابوحنیفہؒ: پہلے یہ بتاؤ کہ چراغ کی روشنی کا منہ کس طرف کو ہوتا ہے؟

رومی وزیر: چاروں طرف۔

امام ابوحنیفہؒ: اب سوچو کہ آگ جو عارضی نور ہے، جب اس کے لیے کوئی خاص سمت متعین نہیں کی جا سکتی کہ اس کا منہ فلاں طرف کو ہے تو پھر اس اصلی نور کے لیے کوئی خاص رُخ کیوں کر معین ہو سکتا ہے؟

رومی وزیر: میرا تیسرا سوال یہ ہے کہ خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟

امام ابوحنیفہؒ: اس وقت وہ اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ ایک کام یہ بھی انجام دے رہا ہے کہ اس

نے تمہیں اُتار کر میرے سامنے کھڑا کر رکھا ہے اور تمہاری جگہ مجھے منبر پر بٹھایا ہے۔

....

کلام اللہ کی اعجاز آفرینیاں

یہاں تاریخ سے چند ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن میں قرآن کے چند کلمات نے ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا کئے جو معجزانہ نوعیت رکھتے ہیں۔ وہ مشہور واقعات ان کے علاوہ ہیں جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے متعلق ہیں کلام الٰہی کا کوئی جز سنتے ہی ان ہستیوں کے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی۔

ضبط، عفو، احسان

حضرت امام حسنؓ کے ہاں معززین مکہ مدعو تھے۔ ایک لونڈی دسترخوان پر کھانا چننے میں مصروف تھی، جب وہ شوربے کا پیالہ حضرت امام حسنؓ کے سامنے رکھنے لگی تو اچانک اس کا پاؤں پھسلا جس سے تمام شوربا حضرت امام حسنؓ کے اوپر گر گیا...... امام حسنؓ نے قہرآلود نظروں سے لونڈی کی طرف دیکھا۔ لونڈی تھر تھر کانپنے لگی۔ اس خوف کی حالت میں اس کے منہ سے قرآن کے یہ الفاظ نکلے۔

والکاظمین الغیظ (جو لوگ غصے کو پی جاتے ہیں)۔

حضرت امام حسنؓ نے لونڈی سے فرمایا: ”میں نے اپنے غصے کو روک لیا۔“

پھر لونڈی نے کہا: والعارفین عن الناس (اور جو لوگوں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں)۔

حضرت امام حسنؓ نے فرمایا: ”میں نے تمہاری خطا معاف کر دی۔“

اس کے بعد لونڈی نے آیت کا آخری حصہ پڑھا: واللہ یحب الحسنین (اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے)۔

یہ سن کر حضرت امام حسنؓ نے فرمایا: ”جاؤ، میں نے تمہیں آزاد کر دیا۔“

روزن سے آواز

ایک وقت تھا جب فضیل بن عیاضؒ ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ ڈاکو بھی اس درجہ کے تھے کہ پہلے سے اعلان کر کے ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ ایک رات وہ اسی نیت سے مکانوں کی چھتوں سے گزر رہے تھے کہ کسی روزن سے ان کو کچھ آواز سنائی دی۔ انہوں نے رُک کر روزن سے کان لگا دیئے۔ کوئی شخص اپنے گھر میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا...... فضیل بن عیاضؒ کے لمحۂ سماعت کے وقت یہ آیت پڑھی گئی:

ترجمہ: کیا ابھی تک ایمان لانے والوں کے لیے وہ گھڑی نہیں آئی کہ ان کے دل ذکر الٰہی کے لیے گداز ہو کر جھک جائیں۔“

ان کلماتِ مبارکہ نے کیا عجیب تاثیر دکھائی، تیر کی طرح فضیل کے دل میں اُتر گئے۔ ایک دم نعرہ مارا...... ”ہائے میرے اللہ!“...... اور پھر اسی لمحے چوری، ڈکیتی سے توبہ کر لی بلکہ اپنی ایسی اخلاقی اصلاح کی اور روحانی منازل طے کیں کہ آج ان کا شمار ذی مرتبہ صلحائے امت میں ہوتا ہے۔

نقشہ بدل گیا

حضرت ذوالنون مصریؒ مشہور بزرگان دین میں سے ہیں۔ جوانی کے دنوں میں ایک عیش پرست عرب کے ہاں ملازم تھے جہاں دور جام چلتا رہتا۔ ایک دن انہوں نے کسی شخص کی زبان سے ایک آیت (متذکرہ بالا واقعہ کی آیت) سنی، اور اسے سنتے ہی نہ صرف تمام مناہی سے توبہ کر لی بلکہ زندگی کا رُخ ہی بدل گیا اور خدا کے پسندیدہ بندوں میں درجہ پایا......

حضرت ذوالنونؒ کا اثر دربار بغداد پر بہت تھا۔ خلیفہ متوکل آپ کی تشریف آوری پر تعظیم کے لیے خود اُٹھ کھڑا ہوتا اور وزراء اور درباری سبھی حد درجہ احترام کرتے۔ ایسی صورتحال میں بالعموم حاسد بھی اُبھر آتے ہیں چنانچہ کچھ لوگوں نے حضرت ذوالنونؒ کے حق میں بدگوئی کی اور خلیفہ کے کان بھرے۔ باتیں ایسی تھیں کہ خلیفہ نے حضرت کو مصر سے بلوایا۔ آپ دربار میں داخل ہوئے تو سرِ مجلس اس مختصر سی آیت کی تفسیر نہایت ہی پرسوز انداز میں بیان کی:

ترجمہ: بعض بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔

انداز کلام ایسا پرسوز تھا کہ جس کے اثر سے خلیفہ کا دل پگھل گیا اور وہ بے اختیار سر دربار رونے لگا۔ ظاہر بات ہے کہ اس سیل گریہ میں وہ تمام چغلیاں بہہ گئیں جو بعض لوگوں نے کان میں ڈالی تھیں۔

قیامت کے دن

سلیمان بن عبدالملک شام سے حج کے لیے مدینہ منورہ گیا تو حضرت ابو حازمؒ سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے:

سلیمان: روز قیامت بندوں کی ملاقات پروردگار سے کس صورت میں ہوگی؟

ابو حازم: اگر بندہ دنیا میں نیکی کر کے گیا تو اس طرح ہوگی جیسے کوئی شخص مدت کے بعد سفر کر کے اپنے گھر واپس پہنچے، اور بہت سامال و اسباب ساتھ لائے۔ اہل خانہ اس کی آمد سے خوش ہوں اور خوب خاطرداری کریں۔ اور اگر وہ بدی کر کے گیا تو اس کا سامنا ایسے ہوگا جیسے کسی کا غلام چوری کر کے بھاگ گیا ہو، اور آقا نے اس کی تلاش اور گرفتاری کے لیے پیادے دوڑائے ہوں اور وہ اس کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ اور گلے میں طوق ڈال کر آقا کے حضور لائیں۔ وہ اس وقت آقا کے سامنے کتنا شرمسار اور قابل لعنت ونفرین ہوگا!

سلیمان: (آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے) کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اپنا حال جان لیتا کہ ان دونوں صورتوں میں سے کس صورت میں مالک کے سامنے میری پیشی ہوگی!

ابو حازم: یہ معلوم کرنا تو بالکل آسان ہے۔ قرآن نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔

سلیمان: کس آیت میں؟

ابو حازم نے جو آیت پڑھی اس کا ترجمہ یہ ہے: بے شک نیک لوگ (جنت کی) نعمتوں میں ہوں

گے اور بدکار جہنم میں۔

ابوحازم: اب تم خود ہی اپنے اعمال کا جائزہ لے لو کہ آیا تم ابرار میں سے ہو یا فجار میں سے؟

سلیمان: اگر انجام کار اعمال پر منحصر ہے تو پھر رحمت کیا ہوئی؟

ابوحازم: یہ بات بھی قرآن مجید سے پوچھ لو۔

سلیمان: کس آیت سے؟

ابوحازم نے جو آیت پڑھی اس کا ترجمہ یوں ہے: یقیناً اللہ کی رحمت احسان کیش لوگوں سے قریب ہے۔

سلیمان: (خوف کی حالت میں روتے ہوئے بے حال ہو کر اُٹھتا ہے اور کہتا ہے) تمہاری اس قسم کی باتیں سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔

عدالت جھک گئی

ایک عالی مرتبہ بزرگ خاتون کو عدالت میں ایک مرد اور ایک عورت کے ہمراہ گواہی دینے کے لیے جانا پڑا۔ قاضی نے دونوں عورتوں کے بیانات جدا جدا لینے چاہے۔ بزرگ خاتون نے الگ گواہی دینے سے قرآن کی آیت کی بنا پر انکار کر دیا اور عدالت سے کہا کہ خدا نے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر اس غرض سے قرار دی ہے کہ اگر ایک کوئی بات بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ ظاہر ہے کہ جدا جدا گواہی سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

قاضی نے اس قرآنی استدلال کو قبول کر لیا اور دونوں خواتین کی گواہی ایک ہی ساتھ لی۔

یہ بزرگ خاتون حضرت امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ تھیں۔

انی امر اللہ

مامون الرشید نے وزیر سلطنت فضل برمکی کی بیٹی سے نکاح کیا جو دولت حسن و جمال سے مالا مال تھی۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ تنہائی کی اولیں ملاقات کے وقت مامون کا اضطراب شوق حد سے فزوں تھا۔ دوسری طرف وہ پیکر وقار تھی جس نے شرم وحیا سے نظریں نیچے کیے ہوئے ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے: اللہ کا امر آ پہنچا، پس اب جلدی نہ مچاؤ!

مامون یہ انتہائی برمحل اور معنی خیز آیت سنتے ہی ٹھٹک گیا اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ واضح رہے کہ فی الاصل یہ آیت انتباہ تھی مخالفین حق کے لیے کہ دیکھو اب خدا کا فیصلہ صادر ہونے والا ہے۔ اب بہت زیادہ عجلت پسندی نہ دکھاؤ۔

میرے لیے یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے

تقریباً ستر اسی برس پہلے کا واقعہ ہے کہ خواجہ احمد دین امرتسری، مولینا ثناء اللہ امرتسری اور مولینا غلام اللہ ابن مولینا غلام علی قصوری (ثم امرتسری) ایک مجلس میں اکٹھے ہوئے۔ دوران گفتگو مولینا ثناء اللہ

مرحوم نے خواجہ صاحب سے پوچھا کہ جن لوگوں کی زبان میں کوئی کتاب نازل ہوئی ہو، ان کا فہم سند ہے یا غیر اہل زبان کا؟ خواجہ صاحب نے کہا، کہ اہل زبان کی زبان ولغت تو سند ہے، لیکن ان کا فہم سند نہیں۔ مولینا نے اس کی دلیل طلب کی۔ خواجہ صاحب نے یہ آیت پڑھی:

ترجمہ: بدوی عرب کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں اور یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان احکام کو سمجھ سکیں جو رسول پر نازل ہوئے ہیں۔

مولینا ثناء اللہ نے فرطِ حیرت میں فرمایا: میرے لیے یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے۔

مسجد بچ گئی

قاضی سید محمد (متوفی ۱۰۷۰ ہجری، مدفون بمزار بیجاپور) اہل اللہ کی صف میں مقام رکھتے تھے۔ ان کو اطلاع ملی کہ بیجاپور کے ایک دولتمند نے اپنے مکان میں متصلہ مسجد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ عام مسلمان بیچارے اس کی دولت وقوت کی وجہ سے دم بخود ہیں۔ قاضی صاحب نے اس کو ایک خط لکھا جس میں یہ آیت درج کی:

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ کی مساجد میں رکاوٹ ڈالی کہ ان میں خدا کے نام کا ذکر کیا جائے، اور ان کو اُجاڑنے کے در پے ہو۔

اس آیت کا اثر یہ ہوا کہ اس دولت مند نے مسجد کو اپنے مکان سے الگ کر دیا۔

یداللہ!

حکیم زاہد علی اکبر آبادی کی روایت ہے کہ نادر شاہ کے عہد میں حضرت علیؓ کا روضہ نجف میں تعمیر کیا گیا تو اس کے اوپر سونے کا پنجہ نصب کرنے کی تجویز ہوئی۔ اس پنجے پر کوئی مناسب عبارت کندہ کرانے کا مسئلہ اٹھا۔ عمارت کا منتظم درّۂ نادرہ کے مصنف مرزا مہدی علی خاں کے پاس آیا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا لکھا جائے؟ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ بادشاہ (نادر شاہ) کی سخت مزاجی کا تمہیں علم ہے لہٰذا پہلے ان کے پاس جاؤ، وہ یہ کام میرے ذمے لگائیں تو غور کروں گا۔ منتظم بادشاہ کے حضور میں پہنچا، اور عرض مدعا کیا کہ پنجے پر کیا لکھا جائے؟ بادشاہ کی زبان سے بے اختیار یہ آیت صادر ہوئی:

ترجمہ: ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔

منتظم عمارت نے یہ قصہ آ کر مرزا مہدی علی خاں کو سنایا تو وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے کہ غیر عالم بادشاہ کے منہ سے ایسی بہترین چیز کافی البدیہہ ادا ہونا ضرور کسی غیبی اثر سے ہے۔ مرزا صاحب نے منتظم سے کہا کہ دیکھو تم چند دن کے بعد پھر اس بارے میں پوچھنا کہ آپ نے کیا فرمایا تھا تو وہ لاعلمی کا اظہار کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں پوچھنے پر بادشاہ کے ذہن میں وہ بات نہ آسکی اور حکم دیا کہ جاؤ جا کر مرزا مہدی سے دریافت کر لو۔

فیصلہ

حضرت شیخ مجدد سرہندیؒ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے درمیان ''مکتوبات'' کے سلسلے میں کچھ نزاع چل رہی تھی۔ شیخ عبدالخالق سرہندیؒ لکھتے ہیں کہ میں ایک دن شیخ عبدالحقؒ کی خدمت میں گیا اور گفتگو کے دوران میں یہ کہا کہ:

''بزرگان دین میں عداوت ٹھیک نہیں۔ ہمارا آپ کا منصف قرآن ہے۔ آیئے، وضو کریں، اور قرآن پاک کو کھولیں۔ پھر جو آیت آغازِ صفحہ میں نکل آئے، اس کو شیخ احمد امجدؒ کے حال کی فال سمجھ لیجیے۔''

مولینا نے یہ تجویز قبول کر لی اور ہم دونوں نے وضو کر کے دوگانہ ادا کیا، اور پھر نہایت ادب واحترام سے قرآن پاک کھولا۔ صفحے کی پہلی آیت یہ نکلی:

ترجمہ: وہ ایسے مرد ہیں کہ جنہیں کوئی کاروبار اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

مولینا نے اس آیت کے پڑھتے ہی حضرت مجددؒ کی مخالفت سے توبہ کر لی اور آخر عمر تک اس پر قائم رہے۔

تاب ہے تو سنو!

ایک ملاقات میں محمود غزنوی نے حضرت ابوالحسن خرقانیؒ سے کہا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے احوال واقوال میں سے کچھ فرمایئے۔

خرقانی: اچھا، تاب ہے تو سنو! وہ فرماتے ہیں جس نے مجھے دیکھا وہ بدبختی سے بے خطر ہو گیا۔

محمود: لیکن آنحضورﷺ کو ابوجہل، ابولہب اور کتنے ہی منکروں نے دیکھا اور وہ بدبخت کے بدبخت ہی رہے۔ پھر کہا حضرت بایزید بسطامیؒ کا درجہ پیغمبر سے بھی بڑھ گیا کہ ان کو دیکھتے ہی بدبختی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

خرقانیؒ: محمود! قطعی طور پر سمجھ لو کہ آنحضورﷺ کو ان کے چار یار اور اصحابِ کبار (یعنی ایمان لانے والی ہستیاں) کے سوا کسی نے حقیقی معنی میں دیکھا ہی نہیں۔ پھر خرقانی صاحب نے یہ آیت پڑھی:

ترجمہ: اور تو ان کو دیکھتا ہے کہ وہ تیری جانب دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ دیکھنے سے محروم ہیں۔

ابراھیمی انداز

ایک مرتبہ مغل اعظم شہنشاہ اکبر (موجد دین الٰہی) نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی مہر پر ''اللہ اکبر'' کا کلمہ کندہ کروانا چاہتا ہے۔ درباریوں سے پوچھا کہ اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ خوشامد پیشہ امراء نے ہاں میں ہاں ملائی لیکن ایک بزرگ حاجی ابراہیم بھی موجود تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ

''اللہ اکبر'' کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا بڑا ہے، دوسرا یہ کہ اکبر خدا ہے۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس کے بجائے فلذکر اللہ اکبر نقش کرائیں۔ یہ قرآن کی آیت ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ بادشاہ نے اس صاف گوئی کو پسند کیا مگر حاجی صاحب سے یہ سوال کیا کہ تم اس کے معنی دوسری طرف کیوں لے گئے؟ حاجی ابراہیم نے عرض کیا کہ میں نے دونوں امکانی معنی بیان کر دیئے ہیں۔ بادشاہ نے معذرۃً کہا کہ صرف مناسبت لفظی ہے اور کوئی خاص بات نہیں۔ حاجی ابراہیم اس پر بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ:

''لیکن خدا کو ایسی مناسبت اور شرکت پسند نہیں۔''

آیت کی ہیبت

عبداللہ بن حنظلہ ؒ کے سامنے ایک شخص نے آیت پڑھی:

ترجمہ: ان (یعنی کفار) کے لیے دوزخ ہی (کی آگ) کا بچھونا ہے اور اسی سے اوڑھنے کا سامان۔

حضرت عبداللہ ؒ پر گریہ طاری ہو گیا۔ پھر یوں معلوم ہوا کہ ان کی روح پرواز کرنے کو ہے۔ پھر وہ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے۔ حاضرین نے کہا کہ آپ بیٹھ جائیں۔ کہنے لگے کہ اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے سے روکے ہوئے ہے......

جواب لکھنے کا ارادہ

یحییٰ بن حکم اندلس کا مشہور فصیح و بلیغ گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے بطور امتحان سورۂ اخلاص شریف کا جواب لکھنا چاہا۔ میں نے ارادہ کیا ہی تھا کہ میرے دل پر یکایک ہیبت طاری ہو گئی اور اچانک ایسا گداز پیدا ہو گیا کہ میری آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ میں نے اسی وقت توبہ کی۔

....

جناب احمد ندیم قاسمی

میں نے اپنی تعلیم کا آغاز ہی قرآن مجید سے کیا۔ چار برس کی عمر تھی جب گاؤں کی مسجد میں درس لینا شروع کیا۔ ابتدائی پانچ پارے پڑھے تھے کہ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پرائمری تعلیم کے بعد جب میں مڈل میں داخلے کے لیے اپنے سرپرست چچا کے ہاں پہنچا تو انہوں نے خود ہی قرآن کی تعلیم دینا شروع کی۔ یہ تعلیم قرآن کو ناظرہ پڑھنے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ متن کے اردو ترجمے کے علاوہ مفصل تفسیر بھی شامل تھی۔ یہ تفسیر حقانی تھی۔ پھر پانچویں جماعت سے بی اے تک میں نے عربی کی تعلیم حاصل کی اور یوں قرآن مجید کی تفہیم میں خاصی مدد ملی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قرآن کے متعدد تراجم اور تفسیری نسخے زیر مطالعہ رہے لیکن اب میرا طریق یہ ہے کہ ترجمے کی صحت معلوم کرنی

ہو تو مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ دیکھ لیتا ہوں اور کسی آیت کی تفسیر پیش نظر ہو تو مولانا ابوالکلام آزاد سے استفادہ کرتا ہوں۔

قرآن مجید کے متعلق مجھے یہ واقعہ کبھی نہیں بھولے گا کہ ایک گاؤں میں ایک نوجوان کسی الزام میں پکڑا گیا۔ معاملے سے تھانے کو مطلع کرنے کی بجائے گاؤں کی ناموس کے نام پر معززین کی ایک پنچایت کے سامنے پیش کیا گیا تھا،...... پنچایت نے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ نوجوان قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے کہ اس پر الزام غلط ہے تو دعویٰ واپس لے لیا جائے گا۔ نوجوان نے بھی یہ دعوت قبول کر لی۔ قرآن مجید کا ایک نسخہ منگوایا گیا اور جب نوجوان سے کہا گیا کہ وہ اسے چھو کر قسم کھائے تو وہ ایک قدم آگے بڑھا بھی، مگر پھر جیسے سناٹے میں آ گیا۔ اس کے سارے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اور آخر اس نے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

محترمہ مریم جمیلہ بیگم

قرآن مجید تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے عجیب اور پیچیدہ راستے اختیار کرنے پڑے۔ چونکہ میں منزل پر بڑے احسن طریق سے پہنچی، اس لیے مجھے اپنے تجربات پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا۔

عہد طفولیت ہی سے مجھے موسیقی بڑی اچھی لگتی تھی۔ خصوصاً وہ استادی گانے تو مجھے بہت ہی پسند تھے جنہیں دیار مغرب میں بلند ثقافت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ سکول میں موسیقی میرا پسندیدہ مضمون تھا اور اس میں اکثر مجھے اچھے نمبر حاصل ہوتے تھے۔ جب میں گیارہ سال کی ہوئی تو مجھے ریڈیو پر عربی موسیقی سننے کا اتفاق ہوا جو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے پھر سننے کا فیصلہ کر لیا۔ جب بھی میں عربی موسیقی سنتی، مغربی موسیقی کے لیے میرے دل میں کشش باقی نہ رہتی۔ میں نے والدین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک دن میرے والد مجھے نیویارک کے شامی علاقے میں لے گئے۔ جہاں سے میں نے اپنے گراموفون کے لیے بہت سے عربی ریکارڈ خریدے۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ وہ اُم کلثوم کا وہ ریکارڈ تھا جس میں اس نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تھی۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ یہ عورت آئندہ کس بُرے راستے پر گامزن ہونے والی ہے لیکن مجھے اس کی سریلی آواز اور عقیدت بڑی پسند آئی۔ انہی ریکارڈوں کی بدولت میں عربی موسیقی کی گرویدہ بن گئی۔ حالانکہ میں عربی الفاظ کا مطلب بالکل نہ جانتی تھی۔ عربی موسیقی کی اس بنیادی قدر و منزلت کے بغیر میرے دل میں تلاوت کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ حالانکہ یہ ایک مغربی باشندے کے لیے اجنبی تھی۔ میرے والدین، رشتہ دار اور احباب عربی اور عربی موسیقی کو ازحد دقیانوسی اور تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب میں ریکارڈ بجانے لگتی تو ان کا ہمیشہ یہی مطالبہ ہوتا کہ میں تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لوں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ ۱۹۶۱ء میں قبول اسلام کے بعد، نیویارک کی مسجد میں بیٹھ کر جب مشہور و

معروف مصری قاری عبدالباسط کی تلاوت کا ٹیپ ریکارڈ سنتی تو مسحور ہو جاتی لیکن ایک نماز جمعہ میں امام صاحب نے ریکارڈ نہ بجایا کیونکہ اس دن ایک مہمان خصوصی آیا ہوا تھا۔ یہ ایک پستہ قامت معمولی لباس میں ملبوس سیاہ فام نوجوان تھا جو زنجبار کا ایک طالبعلم تھا۔ جب اس نے سورہ الرحمٰن کی تلاوت شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اتنی شاندار تلاوت کبھی نہیں سنی۔ قاری عبدالباسط بھی اس کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ اس سیاہ فام افریقی نوجوان کی آواز نہایت سریلی تھی۔ یقیناً حضرت بلال حبشیؓ کی آواز بھی بہت کچھ اس سے ملتی ہوگی!

دس سال کی عمر ہی سے میں نے عربوں کے متعلق وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو مجھے سکول یا اپنے فرقے کی لائبریریوں سے حاصل ہو سکیں۔ خصوصاً وہ کتب جن میں یہودیوں اور عربوں کے تاریخی تعلقات کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق اپنے تجسس کی تسلی کرنے میں نو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ آہستہ آہستہ جب بلوغت کی عمر کو پہنچی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام کو عربوں نے اس بلند مرتبے پر نہیں پہنچایا بلکہ اسلام نے عربوں کو صحرائی بادیہ نشینوں سے دنیا کا حکمران بنا دیا۔ جب تک میرے دل میں اس انقلاب کی وجوہات دریافت کرنے کا شوق پیدا نہ ہوا، اس وقت تک قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔

۱۹۵۳ء کے موسم گرما میں، کالج میں بہت سے مضامین کا کورس اختیار کر لینے سے میرے دل و دماغ پر سخت دباؤ پڑا۔ اگست میں علیل ہو گئی اور میں نے سلسلہ تعلیم منقطع کر دیا۔ ایک شام جب میری والدہ پبلک لائبریری جانے لگیں تو مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کوئی کتاب منگواؤ گی۔ میں نے کہا کہ مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ لا دیں۔ ایک گھنٹہ بعد جب وہ لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ تھا جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایک عیسائی عالم اور مبلغ جارج سیل نے کیا تھا۔ چونکہ اس کی زبان بڑی فرسودہ قسم کی تھی اور اس میں عیسائی نقطۂ نگاہ سے متن کو بگاڑنے کے لیے حواشی میں البیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیئے گئے تھے، اس لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس زمانے میں اپنے ناپختہ دماغ کی وجہ سے قرآن کو تورات کے مانوس قصص کی مسخ شدہ اور محرف شکل کے سوا کچھ نہ سمجھتی تھی۔ میں تین دن رات تک مسلسل اس کے مطالعے میں منہمک رہی اور جب میں نے اسے ختم کر لیا۔ تو میری تمام توانائی ختم ہو کر رہ گئی۔

میری عمر اس وقت صرف ۱۹ سال تھی اور میرا حال یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو ایک اسی سالہ بڑھیا کی طرح کمزور محسوس کرنے لگی۔ اس کے بعد میری پوری توانائی کبھی بحال نہ ہو سکی۔

میں قرآن کے متعلق اپنی اس رائے پر قائم رہی۔ ایک دن میں نے ایک دکان پر محمد مارما ڈیوک پکھتال کے انگریزی ترجمۂ قرآن کا ایک سستا ایڈیشن دیکھا۔ جونہی میں نے اسے کھولا، وہ میرے لیے ایک عظیم انکشاف ثابت ہوا۔ اس کی فصاحت و بلاغت نے میرے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیئے۔ پکھتال

نے اپنے دیباچے کے پہلے پیراگراف میں لکھا تھا:

''اس ترجمہ کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں اور قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ معقولیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا جو مسلمان ہے۔ بعض تراجم میں ایسی تفسیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لیے دل آزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ یہ قدیم شیوخ کا اور میرا عقیدہ ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے لیکن یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو بے مثل و بے عدیل ہے۔ اس میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے اور وجد میں آ جاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی۔ یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ میرا یہ مقصد ہے......''

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیل کا ترجمہ کیوں اتنا ناموزوں لگا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کا اور دوسرے غیر مسلموں کا ترجمۂ قرآن پڑھنے سے انکار کر دیا۔ پکھتال کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں نے عبداللہ یوسف علی، محمد علی لاہوری اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تراجم کا مطالعہ کیا اور مجھ پر فوراً انکشاف ہوا کہ یوسف علی اور محمد علی کی تفسیر غیر موزوں ہے۔ اس کی وجہ ان کا لہجہ اور دور از کار اور غیر معقول کوشش تھی جو انہوں نے ان آیات کی تشریح میں کی تھی جو جدید فلسفے اور سائنسی تصورات سے متصادم ہوتی ہیں۔ ان کا متن کا ترجمہ بھی کمزور تھا۔ گو مولانا دریابادی نے اپنے ترجمے میں تورات کے شاہ جیمز کے ترجمے کے نمونے پر قدیم اندازِ بیان اختیار کیا ہے مجھے ان کی تفسیر عمدہ معلوم ہوئی۔ خاص کر اس کا وہ حصہ جس میں مختلف مذاہب کا ذکر ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔ بہر کیف پکھتال کا ترجمہ مجھے بہت پسند آیا۔ اور آج کے دن تک مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور انداز بیاں نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لیے ''گاڈ'' کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے لیکن پکھتال نے ہر جگہ ''اللہ'' ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لیے بڑا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک میں ہسپتال میں صاحب فراش

رہی پکتھال کا ترجمہ مسلسل میرے زیر مطالعہ رہا۔ میں نے اسے بار ہا پڑھا۔ میں نے اس کے چھ عدد نسخے خراب کیے۔ اللہ تعالیٰ پکتھال پر برکات نازل کرے جس نے امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کے لیے قرآن کی تعلیمات کا مطالعہ آسان بنا دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں اس سے لاعلم رہتی اور اس کی قدر نہ کر سکتی۔

۱۹۰۹ء میں ہسپتال سے باہر آنے کے بعد، میں فرصت کے اوقات میں نیویارک پبلک لائبریری کے مشرقی شعبے میں بیٹھ کر اسلام کے متعلق کتب کا مطالعہ کرتی۔ یہیں مجھے مشکوٰۃ المصابیح مترجمہ الحاج مولانا فضل الرحمٰن کلکتوی کی چار ضخیم جلدوں کا پتہ چلا اور مجھے اس بات کا علم ہوا کہ قرآن مجید کو موزوں اور مفصل طور پر سمجھنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک متعلقہ حدیث کا پتہ نہ ہو کیونکہ نبی اکرمﷺ کے اسوہ اور فرمودات کے سوا قرآن حکیم کی تفسیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے جن پر یہ نازل ہوا تھا! وہ لوگ جو منکرِ احادیث ہیں وہ منکرِ قرآن ہیں۔

مشکوٰۃ کے مطالعے کے بعد میں نے قرآن کو الہامی کتاب مان لیا۔ جس چیز نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا کہ قرآن منجانب اللہ ہے اور محمدﷺ کی تصنیف نہیں۔ وہ اس کے تسلی بخش اور معقول جوابات ہیں جو اس نے زندگی کے تمام اہم مسائل کے متعلق دیئے ہیں اور یہ ایسے ہیں کہ مجھے کسی دوسری جگہ نہیں ملے۔

میں بچپن میں موت سے بڑی خوفزدہ رہا کرتی تھی۔ خاص کر اپنی موت کے خیال سے اتنا ڈرتی تھی کہ بعض مرتبہ خواب دیکھنے کے بعد آدھی رات کو چیخنے لگتی اور والدین کو جگا دیتی۔ جب میں ان سے دریافت کرتی کہ میں کیوں مروں گی اور موت کے بعد میرا کیا بنے گا تو وہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ وہ ناگزیر ہے اور مجھے اسے قبول کرنا ہوگا اور چونکہ طبی سائنس ترقی کر رہی ہے شاید میں ایک سو سال تک زندہ رہوں۔ میرے والدین، خاندان کے باقی افراد اور تمام دوست احباب بڑی نفرت کے ساتھ حیات بعد الممات، روزِ حشر، جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزا کو توہم پرستی اور فرسودہ عقائد سمجھتے تھے۔ تورات کے انبیاء، بطریق اور اولیاء کے متعلق بھی معلوم ہے کہ انہیں سزا و جزا اسی دنیا میں ملی تھی۔ حضرت ایوبؑ کی کہانی مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام پیاروں کو تباہ کر دیا، ان کی املاک برباد کر دیں۔ انہیں ایک اذیت ناک مرض میں مبتلا کر دیا تاکہ ان کے ایمان کی آزمائش کی جائے۔ حضرت ایوبؑ نے رو رو کر خدا سے فریاد کی کہ اس نے کیوں ایک نیکوکار انسان کو مصائب میں مبتلا کیا۔ کہانی کے خاتمے پر اللہ تعالیٰ ان کے تمام دنیاوی نقصانات کی تلافی کر دیتے ہیں لیکن اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کی حیات بعد الممات میں انہیں کیا سزا ملی۔ میں نے انجیل میں بھی اس کا ذکر دیکھا اور اس کا مقابلہ قرآن مجید سے کیا۔ انجیل کا بیان مبہم ہے۔ میں نے قدیم یہودیت میں بھی مسئلہ موت کا کوئی حل نہیں پایا کیونکہ تالمود کی تعلیم یہ ہے کہ بہترین موت سے بدترین زندگی اچھی ہے۔ میرے والدین کا فلسفہ یہ تھا

کہ موت کے خیال کو دل میں ہرگز جگہ نہ دینا چاہیے اور زندگی کی عطا کردہ مسرتوں سے مقدور بھر لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں زندگی کا مقصد یہ تھا کہ انسان خوش و خرم اور مسرور رہے، اپنے خاندان سے پیار کرے۔ دوست احباب سے تعلقات بڑھائے اور ان تفریحات میں منہمک رہے جن کی امریکہ میں فراوانی ہے۔ وہ زندگی کی اس مصنوعی شکل کے سختی سے قائل تھے۔ گویا یہ ان کی مسرت اور خوش قسمتی کی ضامن تھی۔ میں نے تلخ تجربے سے معلوم کیا کہ ان باتوں سے پریشانی نصیب ہوتی ہے اور ذاتی قربانی اور جدوجہد کے بغیر کوئی قابل قدر چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔

میں اپنے بچپن ہی سے اہم اور بڑے بڑے کام کرنا چاہتی تھی۔ سب سے زیادہ میں اس بات کی خواہشمند تھی کہ اپنی موت سے پہلے مجھے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ میں نے اپنی زندگی کے ایام پر معصیت اعمال میں ضائع نہیں کیے۔ میں زندگی بھر سنجیدہ مزاج رہی ہوں۔ میں نے ہمیشہ عصر جدید کی ثقافت سے نفرت کی ہے جس کا بڑا چرچا ہے۔ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے یہ کہہ کر سخت پریشان کر دیا کہ دنیا میں کوئی چیز بھی مستقل قدر کی حامل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم جدید رجحانات کو ناگزیر سمجھیں اور اپنے آپ کو ان کے سانچے میں ڈھال لیں۔ لیکن میں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی کہ کوئی ایسی چیز حاصل کروں جو تا ابد قائم رہے اور یہ بات میں نے صرف قرآن مجید سے سیکھی کہ ایسا ممکن ہے۔ اگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی نیک عمل کیا جائے تو وہ ضائع نہیں ہوتا۔ اگر اسے دنیاوی انعام نہ بھی ملے تو اسے زندگی کے بعد ضرور ملے گا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو اخلاقی اقدار سے راہنمائی حاصل نہیں کرتے اور آزادی سے من مانی کرتے ہیں انہیں اس دنیا میں کتنی کامیابی اور دولت حاصل کیوں نہ ہو جائے اور وہ اپنی مختصر زندگی کو کتنی ہی حسرتوں میں کیوں نہ بسر کریں، قیامت کے دن ضرور گھاٹے میں رہیں گے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد پورا کرنے پر پوری توجہ دیں اور ایسے تمام اعمال اور سرگرمیوں کو ترک کر دیں جو ہمیں اس راستے سے بھٹکاتی ہیں۔ قرآن کی ان تعلیمات کو احادیث نے اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے اور میں نے انہیں اپنے مزاج کے عین مطابق پایا ہے۔

جب میں آغوش اسلام میں آئی۔ میرے والدین، رشتہ داروں اور دوست احباب نے مجھے دیوانی سمجھا کیونکہ میں اس کے بغیر کسی اور بات کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا جس میں دوسرے اشغال کی طرح ترقی کی جا سکتی تھی لیکن جب میں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسلام کسی لہو و لعب کا نام نہیں ہے۔ اسلام زندگی کی محض ضرورت ہی نہیں، بلکہ خود زندگی ہے!

سن بلوغت کے آغاز سے، ۲۸ سال کی عمر میں پاکستان آنے تک میں معاشرتی لحاظ سے مکمل طور پر ناموزوں رہی۔ میں ایک سنجیدہ دل و دماغ کی دوشیزہ تھی۔ ہر وقت لائبریری میں کتابوں کے ڈھیر میں

غرق رہتی تھی۔ میں سینما، رقص اور موسیقی سے متنفر تھی۔ مجھے مخلوط پارٹیوں سے نفرت تھی۔ مجھے رومان، شان و شوکت، سنگار، زیورات، فیشن ایبل لباس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے مجھے اس سرد مہری کی پوری سزا ملی۔

میرے جیسی ہستی کے لیے امریکہ میں کوئی جگہ نہ تھی اور میں مستقبل سے مایوس تھی، میں وہاں سے نکلی اور پاکستان پہنچ گئی۔ گو پاکستان کی فضا ہر دوسرے مسلم ملک کی طرح، یورپ اور امریکہ سے آنے والے خطرناک گرد و غبار سے آلودہ ہے۔ پھر بھی نیک مسلمانوں کی کمی نہیں ہے جن کی بدولت ایک فرد کو ایسا ماحول میسر آ جاتا ہے جس میں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض اوقات میں ان باتوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے لیکن میں نے اپنی کمزوریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے قرآن و سنت کی دوراز کار تاویلات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ میں جب بھی کسی غلطی کی مرتکب ہوتی ہوں، فوراً اس کا اعتراف کر لیتی ہوں اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ مسرت جو مجھے اپنی حیاتِ نو کے طفیل نصیب ہوئی ہے سراسر اس حقیقت کی مرہون احسان ہے کہ نسوانی کردار کی ان صفات کو اسلام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جنہیں مغربی معاشرے میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

....

ہم پر قرآن اثر کیوں نہیں کرتا

(جاوید چودھری)

امیر تیمور دنیا کے دس بڑے فاتحین میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ازبکستان کے ایک معمولی زمیندار کا بیٹا تھا لیکن یہ جب فوت ہوا تو یہ دنیا کے نامور بادشاہوں میں شمار ہوتا تھا، یہ تاریخ کا ایک حیران کن کردار تھا، یہ بیک وقت دونوں ہاتھوں سے لڑ سکتا تھا، اس نے قرآن مجید سیدھی اور اُلٹی دونوں ترتیب سے حفظ کر رکھا تھا، یہ ال م سے والناس تک سیدھا قرآن مجید بھی پڑھ سکتا تھا اور والناس سے ال م تک اُلٹا بھی اور یہ علم کا بھی شیدائی تھا، یہ مفتوح ممالک کے تمام علماء، ہنرمندوں اور اساتذہ کو امان دے دیتا تھا اور ان کے ساتھ کئی کئی دن تک علمی بحث کرتا تھا لیکن یہ اس کے ساتھ ساتھ انتہائی سفاک بھی تھا، یہ اپنے مفتوح شہروں کو جلا کر راکھ کر دیتا تھا، مردوں کے سر اُتار کر کھوپڑیوں کے مینار بناتا تھا اور عورتیں اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا، یہ انتہائی حریص بھی تھا، یہ دنیا جہاں کی دولت لوٹ لینا چاہتا تھا مگر اپنی ان تمام متضاد خصوصیات کے باوجود امیر تیمور دنیا کا بڑا فاتح تھا۔ جنگوں میں بارود کا استعمال اس نے شروع کیا تھا، دنیا بھر میں رائفلوں کا دستہ لکڑی کا ہوتا ہے، اس روایت کا بانی بھی امیر تیمور ہے، اس نے ایک ایسی کمان تیار کرائی تھی جو رائفل کی طرح چلتی تھی اور اس سے انگلی کے برابر تیر نکلتا تھا، اس کمان کا دستہ لکڑی کا تھا اور یہ کمان بعد ازاں رائفل یا بندوق بنی۔ امیر تیمور نے اپنی 69 سالہ

زندگی میں 42 ممالک فتح کیئے، اس کی سلطنت سمرقند سے دہلی، کوئٹہ سے دمشق، حلب سے بغداد اور تبریز سے قوینہ تک پھیلی تھی، امیر تیمور نے ان فتوحات کے علاوہ ایک کتاب بھی لکھی، یہ کتاب اس کی خودنوشت تھی اور یہ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے مکمل کی، امیر تیمور کی سلطنت اس کے بعد 42 سال تک قائم رہی، اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شاہ رخ مرزا جانشین بنا، اس نے 1405ء سے 1447ء تک حکومت کی اور 42 سال بعد اس کی سلطنت کا وجود تک ختم ہو گیا لیکن امیور تیمور کی لکھی ہوئی کتاب آج تک موجود ہے، یہ کتاب 1783ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور آج 229 برس سے مسلسل چھپ رہی ہے، اس کا چالیس زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ میں یہ کتاب سترہ اٹھارہ بار پڑھ چکا ہوں اور یہ مجھے ہر بار زندگی کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو دکھاتی ہے، امیر تیمور یہ کتاب مکمل نہیں کر سکا تھا، یہ 1405ء میں آخری مہم کیلیئے چین روانہ ہوا، راستے میں اس پر سکتہ طاری ہوا اور یہ انتقال کر گیا۔ یوں اس کی کتاب ادھوری رہ گئی۔ کتاب قلمی نسخہ تھا جو مختلف لوگوں سے ہوتا ہوا یمن کے بادشاہ جعفر پاشا تک پہنچ گیا، یمن کے کسی کاتب نے اس کی نقل تیار کی، یہ نقل ہندوستان آئی، یہ یہاں مختلف بادشاہوں، راجاؤں اور نوابوں کی لائبریری میں دھکے کھاتی رہی، انگریز آئے تو یہ کتاب کسی انگریز فوجی کے ہاتھ لگ گئی، وہ اسے لندن لے گیا، لندن میں ڈیوی اور پروفیسر وائٹ نام کے دو پروفیسروں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، آکسفورڈ پریس نے 1783ء میں یہ کتاب شائع کر دی اور یوں تاریخ کے قبرستان میں دفن تیمور دنیا کے سامنے آ گیا۔

دنیا میں امیر تیمور کی سلطنت، اس کا خزانہ اور اس کی آل اولاد ختم ہو چکی ہے لیکن اس کی کتاب آج بھی زندہ ہے اور یہ کتاب شاید دنیا کی آخری سانس تک باقی رہے گی کیونکہ یہ کتاب ہے اور دنیا میں کتابیں نہیں مرتیں، آپ کو اگر یقین نہ آئے تو آپ انسانی تاریخ کو مزید ماضی کی طرف لے جایئے، آپ کو دنیا میں آج ہومر کی سلطنت نہیں ملے گی لیکن اندھے ہومر کی لکھی کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ افلاطون کا یونان بھی ختم ہو گیا، سقراط کو موت کی سزا دینے والے جج اور بادشاہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ارسطو کے شاگردوں کی سلطنتیں بھی مٹ گئیں مگر افلاطون کے لکھے ہوئے لفظ، سقراط کی بولی ہوئی دانش اور ارسطو کی سوچ کا جادو آج بھی قائم ہے۔ روم کی پانچ ہزار سالہ سلطنت بھی تباہ ہو گئی، فرعون کے اہرام بھی ریت میں دفن ہو گئے لیکن اس عہد کی تحریریں آج بھی قائم ہیں۔ ہندوستان کے کورے اور پانڈے آئے اور چلے گئے، ٹیکسلا کی تہذیب بھی تاریخ کی راکھ میں دفن ہو گئی اور اشوکا کی عظیم سلطنت بھی ماضی کا قصہ بن گئی لیکن کوروں اور پانڈوں کے عہد میں لکھی گئی کتابیں اور اشوکا کے پتھروں پر لکھے فرمودات اور چانکیہ کی ارتھ شاستر آج بھی زندہ ہے۔ کتاب سولائزیشن کی واحد نشانی ہے جس میں سولائزیشن کی موت کے بعد بھی زندگی برقرار رہتی ہے، یہ کتابی حرف کی حرمت ہی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان سے مخاطب ہونے کے لیے کتاب کو ذریعہ بنا دیا، دنیا میں ایک لاکھ 24 ہزار انبیاء

اور چار رسول آئے، انبیاء اپنے ساتھ صحیفے لائے جبکہ چاروں رسولوں پر کتابیں نازل ہوئیں۔ آج دنیا میں زیادہ تر انبیاء کی قبریں پردے میں ہیں، ہم نبی اکرم ﷺ کے سوا دیگر رسولوں کے مزارات کے بارے میں کوئی حتمی دعویٰ نہیں کر سکتے لیکن ان چاروں رسولوں کی عنایت کردہ کتب آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ انسان اور اس کائنات کی معراج علم ہے، ہمارا شرف اس وقت شروع ہوا تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جانوروں، پودوں اور درختوں کے نام سکھا کر انہیں جنوں اور فرشتوں سے ممتاز کر دیا تھا اور یہ علم ہی تھا جس کی مدد سے بنی آدم نے اس بنجر، بے آباد اور ناقابل برداشت زمین کو جنت میں بدل دیا، یہ حقیقت ہے کہ اگر ہمارے پاس علم نہ ہوتا تو ہم آج اپنی مرضی کے ٹمپریچر میں زندگی نہ گزار رہے ہوتے، ہم ہواؤں اور فضاؤں میں اُڑتے ہوئے مریخ تک نہ پہنچ پاتے اور ہم ٹیسٹ ٹیوب میں زندگی پیدا نہ کر پاتے، کتابوں نے ہمارے علم کو امانت کی شکل دی، یہ ایک نسل کے تجربوں، سوچ اور سلجھی ہوئی گتھیوں کو دوسری نسل تک پہنچاتی ہیں اور دوسری نسل ان کتب میں اپنے حصے کا سلجھاؤ، اپنے حصے کی سوچ اور اپنے حصے کے تجربے ڈال دیتی ہے اور یوں انسانیت کا شرف آگے سے آگے سفر کرتا رہتا ہے،

کراچی میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں' خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

گلستان نیوز ایجنسی

فریر مارکیٹ۔ فریر روڈ کراچی سے رابطہ کریں۔ ☎: 021-32733755

Email: sayyaradigest@gmail.com

پتہ لاہور آفس: 240 'مین مارکیٹ ریواز گارڈن ۔ ☎ : 042-7245412

اگر گستاخی نہ ہو تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تعریف، کتاب اور گھر تین ایسی چیزیں ہیں جن کی اللہ تعالیٰ کو بھی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سے اپنی تعریف کا تقاضا کرتا ہے اور ہم اگر اللہ کی تعریف میں بخل کرتے ہیں تو ہمارا ایمان کمزور رہ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کتاب کو انسان سے رابطے کا ذریعہ بنایا اور رہ گیا گھر تو اللہ تعالیٰ نے زمین پر بیت المقدس اور خانہ کعبہ کی شکل میں اپنے دو گھر بنائے لہٰذا ہم جب تک اپنے ملک میں اپنے لئے گھر نہیں بناتے، ہم جب تک کتب کیلئے زندگی کا دروازہ نہیں کھولتے اور ہم جب تک دوسرے لوگوں کی کامیابیوں، مہربانیوں اور صلاحیتوں کی تعریف کرنا نہیں سیکھتے، ہم اس وقت تک اچھی اور مطمئن زندگی نہیں گزار سکتے، ہم تعریف (ایپری سی ایشن) اور گھروں کی اہمیت پر پھر کسی وقت بحث کریں گے، ہم سردست صرف کتب کی بات کریں گے، کتابیں علم ہوتی ہیں اور علم کیا چیز ہے آپ اس کیلئے سیرت کا ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے۔

آپ نے سیرتوں کی کتاب میں پڑھا ہوگا، نبی اکرم ﷺ بچپن میں حضرت ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر پر گئے، یہ قافلہ شام کے راستے میں بصریٰ نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں رُکا، قافلے کی قیام گاہ کے سامنے ایک چرچ تھا، چرچ کا راہب بحیرہ انتہائی پڑھا لکھا شخص تھا، اس کے پاس دینی اور دنیاوی دونوں علوم تھے، اس نے 12 سال کے محمد ﷺ کو دیکھا اور فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ آپ ﷺ دنیا کے آخری نبی ہیں، بحیرہ نے حضرت ابوطالب سے عرض کیا "آپ اس بچے کو ہرگز ہرگز شام نہ لے کر جائیں، شام کے یہودی اور عیسائی اسے نقصان پہنچائیں گے۔" حضرت ابوطالب نے بحیرہ کی بات سے اتفاق کیا اور آپ نبی اکرم ﷺ کو راستے سے واپس لے آئے۔ آپ علم کا کمال دیکھئے کہ بحیرہ جیسے عیسائی پادری نے 12 سال کے بچے میں نبوت کی نشانیاں دیکھ لیں جبکہ مکہ کے وہ کفار جو چالیس سال تک دن رات نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رہتے رہے اور ان میں نبوت کے آثار نہ بھانپ سکے اور آپ ﷺ نے چالیس سال کے بعد جب نبوت کا اعلان کیا تو یہ لوگ اپنے کفر پر ڈٹ گئے، بحیرہ اور ان لوگوں میں علم کا فرق تھا، بحیرہ پڑھا لکھا اور صاحب مطالعہ شخص تھا چنانچہ وہ نبوت اُترنے سے 28 سال پہلے آپ ﷺ کے اندر نبوت کے آثار کو بھانپ گیا جبکہ مکہ کے لوگ جاہل تھے چنانچہ انہوں نے اعلانِ نبوت، معراج اور شق القمر کے واقعے کے بعد بھی نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔ علم وہ نعمت ہے جس کی کمی ہو تو انسان نبی کو بھی تسلیم نہیں کرتا خواہ وہ اس کے ساتھ ہی کیوں نہ رہ رہا ہو اور اگر علم ہو تو بحیرہ جیسے عیسائی کو بچے میں نبوت کی نشانیاں نظر آ جاتی ہیں۔

علم کی ایک اور مثال حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں، یہ یہودی ربی اور اپنے دور کے عالم تھے، یہ آپ ﷺ کے پاس تین سوال لے کر آئے اور ایک منٹ میں اسلام قبول کر لیا، وہ سوال ذیل میں درج ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ یہودی تھے، یہ مدینہ کے سب سے بڑے ربی بھی تھے، یہودی ان کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ یہ انتہائی پڑھے لکھے اور صاحب مطالعہ شخص تھے۔ نبی اکرم ﷺ مدینہ تشریف

لائے تو یہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا "میں آپ ﷺ سے تین سوال پوچھوں گا، میں جانتا ہوں کہ ان کے جواب نبی کے سوا کسی کے پاس نہیں ہو سکتے، آپ ﷺ نے اگر ان کے درست جواب دے دیئے تو میں فوراً ایمان لے آؤں گا ورنہ دوسری صورت میں آپ ﷺ نبی نہیں ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "پوچھیے۔" حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے پوچھا "قیامت کی پہلی نشانی کیا ہوگی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "مشرق سے مغرب تک آگ پھیل جائے گی۔" حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے فوراً عرض کیا "آپ ﷺ درست فرما رہے ہیں۔" حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے دوسرا سوال پوچھا "جنتیوں کی پہلی خوراک کیا ہوگی؟" آپ ﷺ نے فوراً جواب دیا "مچھلی کے جگر کا اضافی حصہ جنتیوں کی پہلی خوراک ہوگا۔" حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے تصدیق میں سر ہلایا اور تیسرا سوال پوچھا "بچے کے خدوخال اپنے والد پر ہوتے ہیں یا والدہ پر، اس کا اصول کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ازدواجی تعلقات کے دوران باپ پہلے نارمل ہو جائے تو بچے کی شکل والد جیسی ہوتی ہے اور اگر والدہ سبقت لے جائے تو بچے کے خدوخال ماں پر چلے جاتے ہیں۔" حضرت عبداللہ بن سلامؓ اپنی جگہ سے اُٹھے، دست مبارک پر بوسہ دیا اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ آپ غور کیجئے کہ مدینہ کے سب سے بڑے ربی کو اسلام قبول کرنے میں صرف ایک منٹ لگا جبکہ مکہ کے کفار نے نبی کریم ﷺ کی 53 سال کی رفاقت (چالیس سال نبوت سے پہلے اور 13 سال نبوت کے بعد) اور 13 سال کی تبلیغ کے باوجود اسلام قبول نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور کفار مکہ میں کیا فرق تھا؟ ان دونوں میں علم کا فرق تھا، کفار مکہ جاہل تھے، وہ ان پڑھ بھی تھے اور فکر اور مطالعہ سے بھی دور تھے چنانچہ یہ نبی ﷺ کے گرد رہتے ہوئے بھی ان کے وجود کے منکر رہے جبکہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ پڑھے لکھے، عالم اور وسیع المطالعہ شخص تھے، ان کے پاس سوال تھے اور یہ جانتے تھے کہ ان کے جواب نبی کے سوا کوئی شخص نہیں دے سکتا چنانچہ یہ آئے، آپ ﷺ کے پاس بیٹھے، تین سوال کئے، جواب پائے اور ایک منٹ میں اسلام قبول کر لیا۔

دنیا میں کسی شخص کو ماننے کے تین طریقے ہوتے ہیں۔ ایک، آپ اس کے انتہائی قریب ہوں، آپ نے اسے خلوت اور جلوت میں دیکھا ہو اور آپ نے دونوں میں اسے صاحب کردار پایا ہو چنانچہ آپ اسے مان لیتے ہیں۔ دو، آپ نے زندگی کے تیس چالیس سال کتابوں کو دیئے ہوں اور آپ کے ذہن میں بے شمار ایسے سوال پیدا ہو گئے ہوں جن کے جواب آپ کو لائبریریوں، پروفیسروں اور دانشوروں سے نہ ملے ہوں اور آپ کسی ایسے اللہ والے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں جس پر اللہ کا کرم ہو، وہ شخص آپ کے اُبلتے ہوئے دماغ کو چند لمحوں میں سیراب کر دے اور آپ اسی وقت اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے اور تیسرا طریقہ طاقت ہوتی ہے، انسانوں کا ایک بڑا طبقہ آپ کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک آپ انہیں فتح نہیں کر لیتے، نبی اکرم ﷺ کو ماننے والوں میں تینوں قسم کے لوگ شامل تھے۔ آپ ﷺ پر حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت بلالؓ جیسے وہ لوگ

بھی ایمان لائے جنہوں نے آپ ﷺ کو خلوت اور جلوت دونوں میں دیکھا تھا اور آپ ﷺ کو ہر حال میں صاحب کردار پایا تھا، آپ ﷺ پر حضرت عبداللہ بن سلامؓ جیسے وہ لوگ بھی ایمان لائے جن کا علم سوال بن چکا تھا اور وہ اس کا جواب چاہتے تھے اور آپ ﷺ پر وہ لوگ بھی ایمان لائے جو طاقت کو علم اور کردار سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ آپ فتح مکہ کا احوال پڑھ لیجئے، آپ کو اس دن وہ تمام لوگ ایمان لاتے نظر آئیں گے جو فتح مکہ تک آپ ﷺ کا انکار کرتے رہے لیکن فوقیت بہر حال پہلی اور دوسری قسم کے لوگوں ہی کو حاصل ہے۔

ہم اب قرآن مجید کی طرف آتے ہیں، قرآن مجید دراصل عالموں، محققوں اور سائنسدانوں کی کتاب ہے۔ ہم جیسے سطحی مطالعے، معمولی علم اور محدود دانش کے لوگ قرآن مجید کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہم اس کے مطالب تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں لائبریریوں، لیبارٹریوں، تحقیق، جستجو اور نامعلوم کو معلوم کرنے کی تڑپ میں گزار دی ہوں، جو کینسر کے خلیوں پر کام کر رہے ہیں، جو کائنات کو پھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جو مریخ پر پانی کے آثار تلاش کر رہے ہیں، جو یہ واچ کر رہے ہیں کہ انسان کو سنگل سیل سے چھ فٹ کا باشعور انسان بننے میں 9 ارب سال لگے اور اللہ تعالیٰ 9 ارب سال کا یہ ارتقائی عمل ماں کے پیٹ میں چھ ماہ میں مکمل کرتا ہے، جو روز حیات کو پانی میں پیدا ہوتے دیکھتے ہیں، جو یہ مطالعہ کر رہے ہیں کہ نیک انسان کے بچے بد کیوں ہو جاتے ہیں اور بد کردار لوگوں کے بچے نیک کیوں ثابت ہوتے ہیں، جو سیاروں سے آنے والی لہروں کا تجزیہ کر رہے ہیں، جو زندہ اجسام کو مشینوں کے ذریعے ہزاروں میل دور منتقل کرنے کے تجربے کر رہے ہیں، جو مصنوعی سیاروں کے ذریعے دنیا کے ایک ایک شخص کی حرکات و سکنات نوٹ کر رہے ہیں، جو لاکھوں سال پرانی لاشوں کے ڈی این اے سے لیبارٹری میں پورا انسان بنانا چاہتے ہیں اور جو کشش ثقل کے نئے نئے اصول دریافت کر رہے ہیں، قرآن مجید دراصل ان لوگوں کی کتاب ہے لہٰذا حضرت عبداللہ بن سلامؓ جیسا کوئی عالم یہودی، عیسائی، ہندو، سکھ، بودھ یا کمیونسٹ جب بھی قرآن مجید پڑھتا ہے وہ چند لمحوں میں اسلام قبول کر لیتا ہے اور ہم سے بہتر مسلمان ثابت ہوتا ہے۔ آپ دنیا کے تمام نومسلموں کے پروفائل نکال کر دیکھ لیجئے، آپ کو ان میں نوے فیصد لوگ عالم، سائنسدان، پروفیسر اور لیڈرز اعلیٰ تعلیم یافتہ ملیں گے، یہ صاحب مطالعہ ربی، پادری یا پنڈت ہوں گے، یہ لوگ بنیادی طور پر حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں، علم ان کے اذہان میں سوال پیدا کرتا ہے اور یہ ان سوالوں کے جواب میں جب بھی قرآن مجید سے رجوع کرتے ہیں یا پھر ڈاکٹر حمید اللہ جیسے اصلی عالموں سے رابطہ کرتے ہیں تو انہیں اسلام قبول کرنے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو لگا تھا، مجھے یقین ہے جس دن بل گیٹس، نیلسن منڈیلا یا سٹیفن ہاکنگ قرآن مجید پڑھیں گے، یہ اسلام بھی قبول کر لیں گے اور یہ ہم سے اچھے مسلمان بھی ثابت ہوں گے بالکل، ان نومسلموں کی طرح جنہوں نے

علم کی بنیاد پر اسلام قبول کیا اور ہم سے بہت آگے نکل گئے۔

ہم روزانہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں، ہم عام زندگی میں آیات بھی دہراتے ہیں لیکن ہم ان آیات سے اثر نہیں لیتے، ہم قرآن مجید پڑھنے کے باوجود بدعنوان بھی ہیں، چور بھی، دھوکے باز بھی، ظالم بھی، بے انصاف بھی، شدت پسند بھی، کوتاہ بھی، کم فہم بھی، علم دشمن بھی، منافق بھی، فرقہ پرست بھی، بدحال بھی، غریب بھی اور بیمار بھی، کیوں؟ قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے، یہ تو اقوام عالم کے لیڈر ہونے چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں! ایسا کیوں نہیں؟ اس کی واحد وجہ جہالت ہے، ہم علم کے بغیر قرآن مجلد پڑھ رہے ہیں لہٰذا ہم اس سے اثر نہیں لے پاتے اور ہم میں سے اگر کوئی سائنسدان، کوئی محقق، کوئی دانشور یا کوئی عقل مند دنیادار قرآن مجید پڑھ لے اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی آیات کھول دے اور وہ کوئی نئی بات، کوئی نئی سوچ بیان کر بیٹھے تو ہم جیسے جاہل لوگ تلواریں نکال لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب انسانوں کی راہنمائی، بھلائی اور فکر کے لیے بھیجی تھی لیکن ہم نے چند لوگوں کو اس کا ٹھیکیدار بنا دیا اور اب یہ لوگ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم نے قرآن مجید کس طرح پڑھنا ہے اور ہم نے اس میں سے کون کون سا مطلب نکالنا ہے؟ قرآن مجید ایک آزاد کتاب ہے اور یہ دنیا کے ہر اس شخص کی امانت ہے جس نے نزول قرآن کے بعد آنکھ کھولی اور جو مستقبل میں کھولے گا لیکن اس کے اصل وارث وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ علم اور شعور کی دولت سے نوازتا ہے یا جو لوگ شعور اور علم کا سہارا لے کر قرآن مجید تک پہنچتے ہیں۔

ہم اگر قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں، ہم اگر اپنی ذات پر اس کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن مجید کھولنے سے قبل علم سیکھنا ہوگا، ہمیں ہومر سے لے کر سٹیفن ہاکنگ تک ان کتابوں سے دوستی کرنا ہوگی جو سولائزیشن کا سرمایہ ہیں، ہمیں ان لوگوں کو پڑھنا ہوگا جو دن رات فکر جمع کرتے ہیں اور یہ فکر بعدازاں کتاب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

وہ شخص جو مطالعے کو روزانہ تین گھنٹے نہیں دیتا وہ پڑھا لکھا نہیں ہوسکتا خواہ اس کے پاس درجنوں ڈگریاں کیوں نہ ہوں اور آپ اگر پڑھے لکھے نہیں ہیں تو آپ قرآن مجید کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ قرآن مجید کی آیات کو جاہلوں سے حیا آتی ہے، یہ کبھی جاہلوں کو اپنے مطالب کا رُخ انور نہیں دکھاتیں، یہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ جیسے لوگوں کیلئے اُترتی ہیں لہٰذا یہ ہر دور میں ان کا انتظار کرتی ہیں۔

نوٹ: یہ تحریر میری (جاوید چودھری کی) ذاتی رائے ہیں، ان کے غلط ہونے کے سو فیصد امکانات موجود ہیں، میرے الفاظ یا کوئی لفظ آپ کی دل آزاری کا باعث بنا ہو تو میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مجھے سیدھا راستہ بھی دکھائے اور غلطیوں کی تصحیح بھی فرمائے کیونکہ ہم انسان ہیں اور کسی انسان کی رائے حتمی نہیں ہوسکتی۔

(ترجمہ) ''پس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا تا کہ وہ (لوگ) نصیحت حاصل کریں۔''
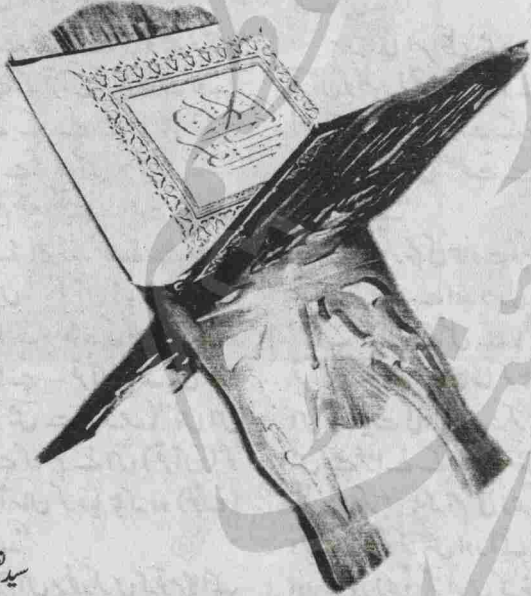
سید نعیم احمد ادیب جعفری

آدابِ تلاوتِ قرآن

رمضان المبارک میں دیگر عبادات کی طرح تلاوت قرآن پاک کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اس کو سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ ذرا سوچئے کہ قرآن کریم صرف اونچے طاقوں میں سجانے کے لیے ہے یا پھر سرسری تلاوت اس کا حق ہے؟...... نہیں ہر گز نہیں!!

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لیے رہبری و ہدایت کی آخری و دائمی کتاب ہے۔ اس کتاب مقدس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اُٹھایا ہے۔ قرآن مجید ہر آنے والے، بیتے ہوئے اور موجودہ دور کی کامل و اکمل ترین کتاب ہے۔ اس میں نوع انسانی کے وقار، فلاح، سلامتی کے آفاقی اصول وضوابط موجود ہیں جن پر انحصار کر کے انسانیت نجات، آسودگی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید کی عملی وکلی تصویر وتفسیر ہمیں آقائے

دو جہاں ﷺ کے اخلاق و اعمال حسنہ میں نظر آتی ہے۔ آداب و تشریحات قرآن حکیم ہمیں آقائے دو جہاں ﷺ کے وجود با سعود سے ملتی ہیں۔

رمضان المبارک میں دیگر عبادات کی طرح تلاوت قرآن پاک کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اس کو سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ ذرا سوچئے کہ قرآن کریم صرف اونچے طاقوں میں سجانے کے لیے ہے یا پھر سرسری تلاوت اس کا حق ہے؟...... نہیں ہرگز نہیں!!......

اس طرح سے تو ہم مقصد تخلیق انسانیت و کائنات سے ہم آہنگ ہوئے بغیر دُور ہوتے چلے جائیں گے اور جا رہے ہیں...... قرآن مجید ہم سے کچھ تقاضے کرتا ہے۔ آداب و مطالعہ کی نکتہ آفرینیوں کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے...... قرآن پاک میں سورۃ الدخان آیت ۵۸ میں ہے: (ترجمہ) ''پس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا تا کہ وہ (لوگ) نصیحت حاصل کریں۔''

قبل ازیں کہ ہم اس پر غور کریں کہ قوم کا ایک حصہ قرآن پاک کی تلاوت و مطالعہ کو کن کن غلط طریقوں سے استعمال کر کے اس کے فوائد سے محروم ہے، بہتر ہے کہ ہم یہ دریافت کرلیں کہ قرآن پاک کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی۔ جب کوئی طبیب کوئی نسخہ لکھتا ہے تو طریقۂ استعمال بھی بتا دیتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کا صحیح طریقہ بھی ہمیں قرآن مجید میں ہی ملنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے کہ (ترجمہ) ''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

مزید درج ہے کہ (ترجمہ) ''اس کو کما حقہ پڑھتے ہیں اور وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔''

پھر ایک جگہ درج ہے (ترجمہ) ''کیا ان لوگوں نے ہمارے ارشاد (قرآن) پر غور نہیں کیا۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۱ میں ہے (ترجمہ) ''اور جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے (ترجمہ) ''اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس مصلحت سے اُتارا کہ تم وقتاً فوقتاً مہلت کے ساتھ اسے لوگوں کو پڑھ کر سناؤ اور اسی مصلحت سے ہم نے اسے رفتہ رفتہ اُتارا ہے۔''

قرآن کریم کی تلاوت و مطالعہ کا طریقہ خود قرآن شریف سے اور رسول اللہ ﷺ سے اور اصحاب اجمعینؓ کے عمل سے بالکل واضح ہے......

قرآن حکیم ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم صرف اس کی آیات کی تلاوت نہ کریں بلکہ ان آیات میں چھپے خزانے کے معانی و مفاہیم پر غور و فکر اور عمل بھی کریں تا کہ ہم عملی زندگی میں ان اصول و قواعد کو لاگو کرسکیں اور ایک ایسی اچھی، جامع اور بھرپور زندگی گزاریں کہ خالق بھی راضی ہو جائے اور خود اپنا ضمیر بھی مطمئن۔ ایسی زندگی گزارنے کے لیے ہمارے پاس رول ماڈل شخصیت، عظیم ترین ہستی سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے اور ان کے پرتو صحابہ کرامؓ کی زندگیاں ہمارے لیے سنگ میل اور سرمایۂ حیات ہیں کہ جنھوں نے اپنی زندگیاں رسول خدا اور تعلیمات قرآنی کے تابع گزاریں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ قرآن مجید کے حق کو سمجھتے تھے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ قرآن مجید کا مطالعہ و تلاوت ایسے انداز میں کریں جیسے کہ حق ہے۔ یہی حقیقی راہ نجات کا آغاز ہے۔

احمد فراز

شایان انیق اختر

پاکستان کا ہونہار سپوت

انٹرنیشنل کمپنیاں اس کی بنائی ہوئی گیمز اور پراڈکٹس کو نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ کر ڈالروں میں خریدتی ہیں۔ مائیکروسافٹ نے شایان کی ذہانت اور صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے باقاعدہ اپنی کمپنی میں 200 ڈالر ماہانہ تنخواہ پر باضابطہ کام کرنے کی دعوت دی جسے شایان نے اعزاز سمجھ کر قبول کرلیا!

قدرت جب کسی قوم پر مہربان ہوتی ہے تو اس قوم میں ایسے ہنرمند، باصلاحیت اور ذہین افراد پیدا کرتی ہے جو اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے ذریعے پوری قوم کو زمین کی پستیوں سے نکال کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے ہی باصلاحیت اور حیرت انگیز صلاحیتوں کے حامل نوجوان کا نام شایان انیق اختر ہے۔ یہ 17 سالہ نوجوان پنجاب کے دارالحکومت لاہور سے 180 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹے اور قصباتی شہر ''حویلی لکھا'' تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ کا

رہنے والا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ذہانت اور ترقی کے راستے بڑے شہروں میں کھلتے ہیں لیکن شایان انیق اختر نے مائیکروسافٹ پروفیشنل سرٹیفکیشن میں 98.7 فیصد نمبر لے کر دنیا بھر میں نہ صرف پاکستانی قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے بلکہ پرانے مقولے کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ شایان سات سال کی عمر میں قرآن پاک پڑھنے کے بعد جناح پبلک سکول حویلی لکھا میں نرسری جماعت میں داخل ہوا، یہیں پر پریپ اور پہلی جماعت تک تعلیم حاصل کی اور سکول میں اپنی انفرادی ذہانت کو قائم رکھتے ہوئے فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ پھر رینجر پبلک سکول ہیڈ سلیمانکی میں دوسری جماعت میں داخلہ لے لیا۔

دوسری جماعت سے ساتویں جماعت تک ہر سال 98 فیصد نمبر لے کر سرفہرست آنے والا بچہ شایان انیق اختر آٹھویں جماعت میں حویلی لکھا میں ہی ''دی ایجوکیٹرز'' کے میاں منظور کیمپس میں 2009ء میں داخل ہوا۔ یہاں شایان کے مضامین میں انگلش، سائنس، سوشل سٹڈیز، اردو، اسلامیات اور ریاضی شامل تھے۔ آٹھویں جماعت کا نتیجہ آیا تو شایان نے سائنس اور انگلش میں 90 فیصد جبکہ دیگر مضامین میں 70 فیصد نمبر حاصل کیے۔ اس طرح مجموعی طور پر 78 فیصد نمبر لے کر سکول میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ نویں جماعت میں فزکس، کیمسٹری، بیالوجی اور انگلش کے مضامین کا انتخاب کیا۔ نویں جماعت کے رزلٹ کے مطابق شایان نے فزکس اور بیالوجی میں 90 فیصد جبکہ انگلش میں 98 فیصد نمبر حاصل کر کے سکول میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اسی دوران جب شایان کی عمر ابھی دس سال تھی تو کمپیوٹر سیکھنے کا اسے جنون کی حد تک شوق ہوا۔ کسی کمپیوٹر کالج یا ادارے میں کمپیوٹر کورسز کرنے کی بجائے اس نے خود ہی کمپیوٹر پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ اس نوعمر اور ذہین بچے نے نہ صرف کمپیوٹر کو آپریٹ کرنا اچھی طرح سیکھ لیا بلکہ کمپیوٹر اور موبائل کی کئی گیمز خود تیار کر کے آن لائن فروخت کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ کمپیوٹر گیمز کی انٹرنیشنل کمپنیاں اس کی بنائی ہوئی گیمز اور پراڈکٹس کو نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ کر ڈالروں میں خریدتی ہیں۔ مائیکروسافٹ نے شایان کی ذہانت اور صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے باقاعدہ اپنی کمپنی میں 200 ڈالر ماہانہ تنخواہ پر باضابطہ کام کرنے کی دعوت دی جسے شایان نے اعزاز تصور کر کے قبول کر لیا۔

2011ء کے آخری مہینوں میں شایان نے ایف سی کالج آ کر مائیکروسافٹ امریکہ کے امتحان میں شرکت کی اور 1000 نمبروں میں سے 998 نمبر حاصل کیے جو مجموعی طور پر 98.7 فیصد بنتے ہیں۔ 30 مارچ 2012ء کو چیئرمین مائیکروسافٹ کارپوریشن بل گیٹس کی جانب سے شایان انیق اختر کے لیے کامیابی کی سند جاری کی گئی اور اس کے ساتھ ہی مائیکروسافٹ اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی جانب سے ایک توصیفی خط بھی موصول ہوا۔ ان تمام کامیابیوں کے ساتھ ساتھ جولائی 2012ء میں مائیکروسافٹ کارپوریشن کے چیئرمین بل گیٹس کی جانب سے شایان کو باضابطہ طور پر امریکہ آنے کی دعوت بھی مل چکی ہے جہاں شایان نہ صرف دنیا کے کمپیوٹر سافٹ ویئر ٹیکنالوجی کے ممتاز بزنس مین بل گیٹس سے ملاقات کریں گے بلکہ پروفیشنل ڈویلپر کانفرنس میں بھی شریک ہوں گے۔

''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں''

husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، گوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

نکات دانش

☆''تم وہ بات کہتے کیوں ہو؟ جو کرتے نہیں'' (القرآن)

☆ایک ہزار یا ایک لاکھ انسان جو لائق مر جاتے ہیں تو اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا نالائق شخص کے صاحب اقتدار بننے سے ہوتا ہے۔ (افلاطون)

☆آدمی کے نماز روزے پر نہ جاؤ بلکہ اس کی سچائی اور عقل دیکھو۔

☆مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری کے دور میں صحافت ایک مشن تھا مگر آج شعبہ صحافت ایک انڈسٹری بن چکا ہے۔ (وسعت اللہ خاں، سینئر پروڈیوسر بی بی سی)

☆خواہشوں کو پیدا نہ ہونے دینا ورنہ تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (مہاتما بدھ)

☆رشتوں کی رسی کمزور تب ہوتی ہے جب انسان غلط فہمی میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب بھی خود ہی بنا لیتا ہے۔

☆عوام لوڈشیڈنگ کے خلاف احتجاج ضرور کریں مگر قومی املاک کی توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ سے ان کا اپنا نقصان ہوگا کیونکہ یہ ان کی رقوم سے بنتی ہیں۔

☆دو چہرے انسان کو کبھی نہیں بھولتے، ایک مشکل میں ساتھ دینے والا اور دوسرا مشکل میں ساتھ چھوڑ جانے والا۔

☆اصل کمال علم و عمل دونوں کو جمع کرنے میں

ہے۔(ابن جوزی)

☆دنیا میں رہنا خطرناک ہے۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ یہاں بُرے لوگ رہتے ہیں بلکہ ان لوگوں کی وجہ سے جو اس کی بہتری کے لیے کچھ نہیں کرتے۔(آئن سٹائن)

☆حکومت کو پانچ سالہ عوامی مینڈیٹ ملا ہے۔ ملک کو برباد کرنے کا ٹھیکہ نہیں۔

روزہ

حال ہی میں پیرس میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے یورپین غیر مسلم غالباً کیتھولک ڈاکٹر ''جوفزے'' نے لکھا ہے۔ اس کا عنوان ''روزہ'' ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے بعض عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ روزہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی انسانوں کے لیے مفید ہے۔ وہ ایک دلچسپ انکشاف کرتا ہے کہ روزہ انسانوں میں ہی نہیں بلکہ کائنات کی اور چیزوں مثلاً درختوں اور حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی براہ راست تعلق نہیں تاہم آپ کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا ہوں کہ جہاں تک حیوانوں کا تعلق ہے ان کے متعلق اس نے ذکر کیا ہے کہ ایسے وحشی جانور جو بالکل فطری حالت میں رہتے ہیں، جس زمانے میں برف باری ہوتی ہے، انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی اور بعض اوقات اس کا سلسلہ کئی کئی ماہ تک جاری رہتا ہے۔ جنوبی علاقوں میں برفباری کم ہوتی ہے۔ وہاں ہفتے ہفتے تک زمین پر برف پڑی رہتی ہے لیکن شمال کی طرف جتنا آپ آگے جائیں برفباری شدید ہوتی جائے گی۔ وہاں برف کی وجہ سے مہینوں تک زمین نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں ایسے جانور جو اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں انہیں کوئی چیز کھانے کو ملتی ہے نہ پینے کو۔ اس کے باوجود وہ نہیں مرتے۔ اس نے لکھا ہے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جانور، پرندے، سانپ وغیرہ سب پہاڑوں کے غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں اس کو (Hibernation) کہتے ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ نہ کھانے اور نہ پینے کی حالت میں رہنے سے، یعنی روزے کے باعث ان جانوروں میں نئے سرے سے جوانی آ جاتی ہے۔ جب سردیوں کا زمانہ ختم ہوتا ہے اور بہار کا موسم آنے لگتا ہے تو ایسے پرندے، جو ان غاروں میں ہیں، ان کے پرانے پر جھڑ جاتے ہیں اور نئے پر نکل آتے ہیں۔ جن کی طراوت اور رنگوں کی خوشنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے ہیں۔ اس طرح سانپ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ اس کی جھلی جھڑ جاتی ہے اور اس کو ایک نئی کھال یا نیا چمڑا ملتا ہے جو چمک دمک میں پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ان جانوروں میں واقعی ایک جوانی سی آ جاتی ہے۔ انہیں اپنی تعداد بڑھانے کے لیے نر کو مادہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ان روزہ رکھے ہوئے جانوروں میں پہلے سے زیادہ قوت اور پہلے سے زیادہ جوانی آ جاتی ہے۔ اسی طرح درختوں کے متعلق وہ بیان کرتا ہے کہ سردیوں میں خصوصاً برفباری کے زمانے میں درختوں کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ انہیں کوئی پانی نہیں دیا جاتا۔ ان کی کسی قسم کی آبپاشی نہیں ہوتی۔ گویا وہ روزہ رکھتے ہیں۔ روزے کی مدت ہفتوں اور مہینوں تک چلتی ہے۔ یہ روزہ ختم ہونے پر ان درختوں کو ایک نئی جوانی حاصل ہوتی ہے یعنی جو نئی کونپلیں ان میں پھوٹتی ہیں اور نئے پھول اور پھل لگتے ہیں وہ ان درختوں کی نئی جوانی، نئے حسن اور نئی قوت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان مشاہدات کی

روشنی میں ڈاکٹر جوفزے کا کہنا ہے کہ انسانوں کو بھی ہر سال روزے رکھنے چاہئیں۔ یہ ان کی صحت کے لیے بہتر ہوگا۔ یہ ان کو نئی توانائی اور نئی جوانی عطا کریں گے۔ اس نے بہت سی لمبی بحثیں کی ہیں۔ آج کل بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جن کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ ان کا علاج طویل یا مختصر فاقہ کشی، یعنی روزے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ انسانوں کو سات ہفتے لازماً روزے رکھنے چاہئیں اور ہر ہفتے میں ایک دن روزہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اس طرح اسے بیالیس روزے رکھنے چاہئیں۔

عیسائیوں کے ہاں بھی یہ دستور ہے اور غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ عیسائی مذہب کے لحاظ سے، ان کے قدیم ترین تصورات مذہبی کے مطابق، انسان کو چالیس دن روزے رکھنے چاہئیں۔ انہیں وہ (Lent) کے روزے کہتے ہیں۔ ان (Lent) کے روزوں میں وہ اتوار کو خارج رکھتے ہیں۔ یعنی چالیس دن میں جتنے اتوار آئیں گے اس دن وہ روزہ نہ رکھیں گے۔ باقی چونتیس دن وہ روزہ رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارا روزہ خدا کی خدمت میں ہماری غذا کا 1/10 واں حصہ پیش کرتا ہے مگر وہ ایک رمزی چیز ہی رہتی ہے، حقیقی نہیں۔ ان معنوں میں کہ چونتیس دن کو اگر ہم دس سے ضرب دیں تو 340 دن ہوں گے۔ 340 دن قمری سال کے ہوتے ہیں اور نہ شمسی سال کے۔ اس کے برخلاف مسلمان ایک مہینہ روزے رکھتے ہیں۔ اگر صرف اتنا ہوتا تو ان کے روزے بھی انتیس یا تیس دن کے لحاظ سے 390 یا 300 دن ہوتے جو یقیناً سال کا دسواں حصہ نہ ہوتے لیکن رسول اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد آنے والے مہینے یعنی شوال میں چھ دن روزے رکھے وہ گویا سارا سال روزے رکھتا ہے۔ انتیس دن اور چھ دن، پینتیس دن ہوں گے۔ ان کو دس سے ضرب دیں تو 350 دن بنیں گے۔ اس طرح اگر رمضان شریف تیس دن کا ہوا تو تیس دن اور چھ دن، چھتیس دن یعنی 360 دن ہوئے۔ 350 اور 360 کا درمیانی حصہ 355 دن ہوں گے اور قریباً اتنے ہی قمری سال کے دن بنتے ہیں۔ گویا رمضان اور شوال کے روزے ملا کر سال کا 1/10 واں حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کو ایک اور طرح سے بھی دیکھ سکتے ہیں جو زیادہ سہل، آسان اور عام فہم ہے۔ ایک مہینہ روزے رکھیں تو ساٹھ دن یعنی دو ماہ کے برابر۔ اس طرح پورا سال ہو گیا۔ اگر ہم ہر سال رمضان اور شوال کے فرض کئے ہوئے پورے روزے رکھیں تو اس طرح پورا سال اور پوری عمر، خدا کے حضور اپنے جسم کی اور اپنی غذا کی خیرات پیش کرنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ روزے کا مختصر ذکر تھا۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ''خطبات بہاولپور'' سے اقتباس)

امتیاز

تہذیب (culture) اور تمدن (civilisation) آج کل اس طرح استعمال ہو رہے ہیں گویا وہ ہم معنی ہیں۔ آپ ان میں سے کس طرح امتیاز کریں گے؟ فرمایا (culture) کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور (civilisation) کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔

(ڈاکٹر محمد اقبال)

سردار جی

ایک سردار جی نے اپنی جان پر کھیل کر جلتی

آگ میں سے 6 افراد کی جان بچائی مگر لوگوں نے سردار جی کو بہت مارا۔

کیونکہ وہ جن لوگوں کو جلتی آگ سے باہر لائے وہ سب کے سب فائر بریگیڈ کی ٹیم کا ہی حصہ تھے۔

غزل

سب رُتیں آ کے چلی جاتی ہیں
موسم غم بھی تو ہجرت کرتا
بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر مری حفاظت کرتا
مرے لہجے میں غرور آیا تھا
اس کو حق تھا کہ شکایت کرتا
کچھ تو تھی مری خطا ورنہ وہ کیوں
اس طرح ترکِ رفاقت کرتا
اور اس سے نہ رہی کوئی طلب
بس مرے پیار کی عزت کرتا!

(پروین شاکر)

بنگلہ دیش

ریڈیو پاکستان سے خبریں سنانے والے ان اناؤنسرز کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں جو سقوط مشرقی پاکستان تک خبرنامے کا آغاز اس طرح کیا کرتے تھے ''یہ ریڈیو پاکستان ہے، اس وقت پوربو (مشرقی) پاکستان میں رات کے دس اور پچھمی (مغربی) پاکستان میں نو بجے ہیں۔'' آج ہم اپنے پیارے پوربو پاکستان کے ڈھاکہ ائیرپورٹ پر اپنے پاسپورٹ پر بنگلہ دیش کا ویزا لگوانے، امیگریشن کی ضروری کارروائی کے لیے مسافروں کی اس قطار میں کھڑے تھے جو غیرملکیوں کے لیے مخصوص تھی۔

شہر میں سائیکل رکشہ بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے لوگ بہت محنتی ہیں۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی کام کرتی ہیں۔ دفتروں، دکانوں اور کھیتوں میں بڑی تعداد میں عورتیں کام کرتی نظر آتی ہیں البتہ اجرت اور تنخواہیں پاکستان کی نسبت کم ہیں۔ عام آدمی کا معیار زندگی بھی کم تر اور سادہ ہے۔ غربت کے مناظر بھی جابجا نظر آتے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر بھکاریوں کی تعداد بہت کم ہے جس کی بنیادی وجہ قوم کا محنتی اور خوددار ہونا ہے۔ ڈھاکہ مسجدوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں کی سب سے تاریخی مسجد بیت المکرّم ہے۔ بنگلہ دیش کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت غالباً ڈھاکہ کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔

چشم تصور مجھے تحریک پاکستان کے دور کے ڈھاکہ اور مسلم بنگال میں لے گئی۔ جہاں گلی کوچے پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد اور پاکستان کا مطلب کیا ''لا الہ الا اللہ'' کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہے تھے۔ 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد بھی اسی شہر ڈھاکہ میں رکھی گئی۔ قرارداد پاکستان بھی بنگال کے شیر کی پیش کردہ تھی۔ تحریک پاکستان میں بھی مسلم بنگال ہی سب سے آگے تھی۔ 1946ء کے فیصلہ کن الیکشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کو سب سے زیادہ کامیابی بھی مسلم بنگال ہی میں حاصل ہوئی۔ بنگالی مسلمان ہم سے زیادہ باشعور اور متحرک تھے۔ ہم سے اچھے مسلمان تھے۔ ہم سے زیادہ محب وطن پاکستانی تھے مگر مغربی پاکستان کے زیادہ تر حکمرانوں اور افسروں کا رویہ مشرقی پاکستان کے خوددار لوگوں کے ساتھ عام طور پر توہین آمیز رہا۔ وہ ان کی تضحیک کرتے رہے اور ان کے جائز حقوق دینے میں پس و پیش کرتے رہے۔ نتیجتاً مشرقی پاکستان

کے عوام کا احساس محرومی بڑھتا گیا۔

تحریک پاکستان کے دوران مسلم بنگال کے قومی راہنماؤں کے کیا خواب، کیا تصورات، کیا ارمان تھے اور پھر کس طرح ان ارمانوں کا خون ہوتا رہا اور اس خون سے کیسے ہولناک نتائج برآمد ہوئے۔ آج ہم شیر بنگال اے کے فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین کی قبروں کے سامنے حسرت کی تصویر بنے ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہی سوچ رہے تھے کہ کاش 1970ء کے عام انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرتے ہوئے اقتدار عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمن کو منتقل کر دیا جاتا کہ یہ ان کا جائز اور جمہوری حق تھا۔ کاش ذوالفقار علی بھٹو غیر مشروط طور پر اپوزیشن میں بیٹھنے پر تیار ہو جاتے اور قومی اسمبلی کے بلائے گئے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے والے ارکان کو ٹانگیں توڑنے کی دھمکی نہ دیتے۔ کاش! قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہ کیا جاتا۔ کاش مجیب الرحمن کو پاکستان کے وزیراعظم کے طور پر حلف اٹھانے کا موقع دیا جاتا۔ کاش مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن نہ کیا جاتا۔

لمحوں نے خطا کی تھی
صدیوں نے سزا پائی

ہماری تاریخ...... اے کاش اور حسرتوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے اپنا آدھا ملک گنوا کر بھی کوئی سبق نہیں سیکھا......!

(ڈاکٹر نثار احمد چیمہ کا کالم جنگ میگزین ڈاٹ کام سے اقتباس)

اللہ

جب کہا جاتا ہے کہ حضرت تشریف لائے تو کہتے ہیں انشاء اللہ۔ دکھ درد میں بے اختیار پکارتے ہیں ہائے اللہ۔ ہر ایک کام شروع کرتے وقت پڑھتے ہیں بسم اللہ۔ اگر تعریف کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے سبحان اللہ۔ پانی پلانے یا کھانا کھلانے پر کہتے ہیں جزاک اللہ۔ بوقت ملاقات کہا جاتا ہے السلام علیکم و رحمتہ اللہ۔ سو کر انھیں تو کہا جاتا ہے لا الہ الا اللہ۔ جب چھینک آئے تو کہہ دیا الحمدللہ۔ اظہار نفرت پر کہا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ گناہ سے معافی چاہی تو کہا استغفر اللہ۔ بوقت رخصت کہیں فی امان اللہ۔ کسی سے مانگیں تو کہیں واسطے اللہ کے۔ جھوٹوں کو کہیں لعنت ہو اللہ کی۔ کسی کی خوبی دیکھ کر کہیں ماشاء اللہ۔ بادشاہ کو کہیں ظل اللہ۔ غرض یہ کہ ہر طرف اللہ ہی اللہ۔

پیرس

پیرس کے چارلس ڈیگال ائیر پورٹ پر مجھے ایک انگریز خاتون سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کا تعلق آسٹریلیا سے ہے اور وہ یہاں گھومنے پھرنے کی غرض سے آئی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا ملک بھی بہت خوبصورت ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہاں ملک تو واقعی بہت خوبصورت ہے لیکن وہاں یورپ جیسی تاریخ نہیں۔ بچپن میں کتابوں، رسالوں میں پیرس کی تاریخ، خوبصورت اور خوشبویات کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا تو اس کو دیکھنے کی خواہش دل میں کروٹ لیتی تھی اور جب اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو احساس ہوا کہ پیرس واقعی قدیم اور جدید طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر فرینکفرٹ اور بلجیم (برسلز) سے ہوتے ہوئے بذریعہ کار یا بس پیرس کو جایا جائے تو مندرجہ بالا دونوں شہروں کی خوبصورتی کے مقابلے میں پیرس خاص طور پر رات کے وقت شروع شروع میں اپنا تاثر چھوڑنے میں

کامیاب نظر نہیں آتا بلکہ شعر گنگنانے کو دل کرتا ہے۔

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

اس کی وجہ اس کی قدیم طرز تعمیر ہے جو کہ برسلز کی شیشے کی بنی ہوئی بلند و بالا عمارتوں کے مقابلے میں بے تاثر دکھائی دیتی ہے لیکن صبح کے اُجالے میں جب پیرس شہر جو کہ میلوں پر محیط ہے کو دیکھا جائے تو اس کی دلکشی اپنی طرف کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

پیرس کے اٹھارہ اضلاع ہیں اور تقریباً 35 لاکھ کی آبادی ہے۔ زیادہ تر عمارات کی طرز تعمیر قدیم ہے۔ بالکونیوں والی یہ عمارات کی طرز تعمیر قدیم ہے۔ یہ عمارات نپولین نے سترہویں صدی میں پیرس کو خوبصورت بنانے کے لیے تعمیر کی تھیں اور اتنا لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود ان کی صفائی ستھرائی کو خوبصورت طریقے سے اجاگر رکھا گیا ہے تا کہ شہر کی تاریخی حیثیت برقرار رہ سکے اور یہ علاقہ قدیم پیرس کہلاتا ہے جبکہ بلند و بالا خوبصورت جدید عمارات نئے پیرس کی کہانی سناتی نظر آتی ہیں۔ قدیم و جدید کا یہ سنگم دیکھنے والے کو نہایت مسحور رکھتا ہے۔ پیرس دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں پر زمین نہایت مہنگے داموں بکتی ہے اس لئے زیادہ تر لوگ مضافاتی علاقوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ لوگ وہاں سے کام کرنے پیرس آتے ہیں اور شام واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اس لئے دن کے وقت یہاں بہت گہما گہمی ہوتی ہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ اگر کسی کے پاس سوشل سکیورٹی کارڈ کی سہولت نہیں ہے تو یہاں مرنا بھی لاکھوں میں پڑتا ہے۔

نوٹرڈیم، آئی لینڈ اور سینٹ بولس پیرس کے مہنگے ترین علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ نوٹرڈیم کی ایک خاصیت وہاں کا چرچ ہے جو چودھویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ اس پرشکوہ چرچ کو مختلف ادوار اور انقلاب فرانس میں کافی حد تک نقصان پہنچا۔ 1994ء میں اس کے تباہ شدہ حصے کو دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اب اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کو مزید اپ گریڈ کیا جا رہا ہے جو 2013ء میں مکمل ہو جائے گا۔ اس کو اس طرح سے ڈیزائن کیا جا رہا ہے کہ دنیا بھر سے سیاح جو اس کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں عبادت میں خلل کے بغیر اس کو دیکھ پائیں گے۔ اس چرچ کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے چرچ ہیں کہ جو انقلاب فرانس میں تباہ ہوئے اور ان کو دوبارہ تعمیر کیا جا رہا ہے۔ انقلاب فرانس صرف فرانس کی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ جس میں بھوک اور افلاس سے تنگ آئے ہوئے عوام نے حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اس تاریخی واقعے کی بازگشت ابھی تک فرانسیسیوں کے دلوں میں ہے اور اس کے اظہار کے طور پر پیرس میں یادگار بنائی گئی ہیں۔

ایفل ٹاور بھی انقلاب فرانس کی ہی ایک یادگار کے طور پر بنایا گیا ہے اور اب پیرس اور ایفل ٹاور لازم و ملزوم ہیں جو بھی پیرس جاتا ہے اس کی اولین ترجیح اس کو دیکھنا ہوتی ہے۔ انقلاب فرانس کے سو سال بعد بنے اس ٹاور کو دنیا کے سات بڑے عجوبوں میں شامل کیا گیا ہے۔

(ڈاکٹر روبینہ اختر کا سفرنامہ، نوائے وقت ڈاٹ کام، 2 جون 2012ء سے اقتباس)

کزن میرج

میڈیکل سائنس کے مطابق دنیا کا ہر مرد ہر عورت اور ہر عورت ہر مرد کے لئے ''سوٹ ایبل'' نہیں۔ بعض مردوں کے خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جو مخصوص کیمیکل کی حامل خواتین

کے جسم میں پہنچ کر خوفناک بیماری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ امراض بعدازاں بچوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے پانچ فیصد بچے تھیلیسیمیا کا شکار ہوتے ہیں یا پھر ان میں شکار ہونے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ تھیلیسیمیا کی وجوہات خالصتاً موروثی ہوتی ہیں۔ کینسر کی وجہ بھی والدین کے جینز ہوتے ہیں۔ اگر ماں اور باپ دونوں میں کینسر کے جینز موجود ہوں تو بچے میں کینسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت دنیا میں ایڈز، ہیپاٹائیٹس، ٹی بی اور سفلس سمیت بے شمار ایسے امراض ہیں جو عورت سے مرد اور مرد سے عورت کو لگ جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ بیماریاں آگے چل کر دوسری اور تیسری نسل کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جسمانی معذوری، پاگل پن، نفسیاتی بیماریوں اور منفی سماجی رویوں کا تعلق بھی عورت اور مرد کی ''فارمیشن'' سے ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی میں کوئی جسمانی، نفسیاتی یا ذہنی عیب موجود ہو تو وہ عیب کسی نہ کسی شکل میں اگلی نسل میں منتقل ہو جائے گا۔ اسی لئے میڈیکل سائنس ''کزن میرج'' کے خلاف ہے۔ امریکہ نے آج سے 70 برس پہلے قانون بنایا تھا کہ امریکہ میں جو بھی شخص شادی کرے گا وہ پہلے اپنا میڈیکل ٹیسٹ کرائے گا۔ یہ قانون اس وقت امریکہ کی 9 ریاستوں میں موجود ہے اور اسے "Premarital Certificate" کہا جاتا ہے۔ اس قانون کے تحت امریکہ میں شادی کا خواہشمند ہر جوڑا اپنا خون ٹیسٹ کرواتا ہے۔ یہ ٹیسٹ بعدازاں ٹاؤن کمیٹی میں جمع کروا دیا جاتا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ صرف 65 دن تک کارآمد رہتا ہے۔ اگر اس دوران شادی نہ ہو تو جوڑے کو دوبارہ ٹیسٹ کرانا پڑتا ہے۔ اس ٹیسٹ کی وجہ سے نہ صرف امریکہ کا ہیلتھ بجٹ کم ہو گیا بلکہ وہاں بے شمار موروثی اور متعدی امراض بھی ختم ہو گئے۔ امریکہ کے بعد اب یورپ، مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں بھی شادی سے پہلے میڈیکل ٹیسٹ کا قانون لاگو ہو چکا ہے۔

پاکستان کا شمار اس وقت دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں ایڈز، ہیپاٹائیٹس بی اور سی، ٹی بی اور تھیلیسیمیا تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ ان امراض کی بے شمار وجوہات میں سے ایک وجہ شادی ہے۔ اگر شادی سے پہلے نوجوانوں کا میڈیکل ٹیسٹ ہو جائے تو بے شمار لوگ ان امراض سے بچ سکتے ہیں اور یوں ہماری اگلی نسل زیادہ صحت مند ہو سکتی ہے۔ مجھے ایک صاحب بتا رہے تھے کہ پچھلے دنوں پاکستان کی ایک بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی کے ایم بی اے ڈیپارٹمنٹ کے طالبعلموں کا طبی معائنہ ہوا۔ کلاس میں 70 طالبعلم تھے۔ ان 70 طالبعلموں میں سے 7 طالبعلم ہیپاٹائیٹس کے مریض نکلے۔ ان طالبعلموں کو اپنی بیماری کا علم تک نہیں تھا۔ یہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کی صرف ایک کلاس کی صورتحال تھی۔ آپ باقی معاشرے کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں۔ پاکستان میں شادی بیاہ کی رسموں پر ہر سال اربوں روپے ضائع ہوتے ہیں۔ ہم لوگ مایوں، مہندی، چراغاں اور آتش بازی پر بھی کروڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ اگر ہم ان اخراجات میں میڈیکل ٹیسٹ کو بھی شامل کر لیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن اس کا ہماری قومی اور سماجی زندگی پر بڑا اچھا اثر پڑے گا۔

(''زیرو پوائنٹ 3'' جاوید چودھری کی کتاب سے اقتباس)

بڑھاپے میں مطالعہ کی عادت

بڑھاپے میں مطالعے کی عادت سے یادداشت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ جرمنی کی سینئر سٹیزن آرگنائزیشن ''باگسو'' کی تحقیق کے مطابق اگرچہ بڑھاپے میں لوگوں کو جلد بھولنے، نظر کی کمزوری، اونچا سننے اور دیر تک توجہ مرتکز نہ کر سکنے کے مسائل درپیش ہو جاتے ہیں تاہم اس عمر میں کتابوں، اخبارات اور رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ معمر افراد کی یادداشت کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ''باگسو'' کی ارسلولیئز کا کہنا ہے کہ مطالعہ دماغی سرگرمی کی ایک خصوصی شکل ہے اور ٹی وی دیکھنے کے مقابلے میں اس کو توجہ مرتکز کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مطالعہ سے ذخیرہ الفاظ، زبان کے استعمال اور ارتکاز کی صلاحیت کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مین فریڈ گوگول کا کہنا ہے کہ مطالعہ کے دوران دماغ نیوران کے مابین نئے خاکے اور جوڑے بناتا ہے جس سے ادراکی اور سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

وقت

مغرب میں یہ محاورہ عام ہے کہ وقت دولت ہے۔ اس لئے وہ پورے اہتمام کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں سب سے زیادہ ناقدری وقت کی ہے اور ہم اپنی متاع بے بہا کو ضائع کرنے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

حال ہی میں مجھے ایک تقریب میں شمولیت کا ایک خوبصورت کارڈ ملا جو ایک نامور شاعر اور محقق کے نام شام تھی۔ ظاہر ہے کہ اہل علم و دانش کا جمگھٹا ہی ہونا تھا (خدارا! مجھے ان میں شامل نہ سمجھ لیجئے گا) جب میں وقت مقررہ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر قلق ہوا کہ وہاں ابھی تقریب کے آثار ہی معدوم ہیں۔ میں حیران و ششدر...... کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے...... کہیں مجھے مغالطہ تو نہیں ہوا! اتفاق سے وہ نامور شاعر ہی مل گئے جن کے ساتھ شام منائی جانی تھی۔ میرے استفسار پر فرمایا کہ باہر سے مہمانان گرامی تو تشریف لا چکے ہیں لیکن ابھی دیر ہے۔ یوں 7 بجے شام کی تقریب کا آغاز 10 بجے شب ہوا۔ معذرت کے ساتھ۔ کون کسے کیوں سمجھائے!!!

باکسنگ لیجنڈ
محمد علی کلے

میں سگریٹ نہیں پیتا مگر ایک ماچس ضرور اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔ جب بھی گناہ کرنے کو دل چاہتا ہے تو میں ماچس کی ایک تیلی جلا کر اپنی ہتھیلی اس کے اوپر رکھ دیتا ہوں اور اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کلے جب تم یہ آگ برداشت نہیں کر سکتے تو دوزخ کی آگ کیسے برداشت کرو گے!

(فیس بک ڈاٹ کام سے)

دمشق

آج کا پروگرام دمشق سے باہر مقاماتِ مقدسہ کی حاضری تھی۔ دمشق کی وادی پیالہ نما ہے جس کے کم از کم تین اطراف پہاڑ ہیں...... ہم جبل قامیون کی طرف جانے والی بس پر سوار ہوئے۔ بس بازار سے گزر کر تنگ...... گلیوں میں داخل ہو گئی جہاں بہت زیادہ موڑ تھے...... ایک مقام پر جا کر بس رُک گئی۔ اس کے آگے سڑک نہ تھی بلکہ پہاڑ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں اُتر کر دیکھا تو یہ بھی فلسطینیوں کی بستی تھی۔ معلوم ہوا دمشق کے نواح میں سب فلسطینی آباد تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے۔ جونہی ہمیں دیکھا دوڑ کر آئے اور بھیک مانگنے

لگے۔ کچھ بچوں نے اصحابِ کہف دکھانے کے لئے معلم بننے کی پیشکش کی...... اصحابِ کہف تک ان بچوں نے ہمیں گھیرے رکھا۔ ایک فرلانگ کی لگاتار چڑھائی کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جس کا نام اصحابِ کہف ہے۔ اس جگہ اب ایک فلسطینی مدرسہ قائم ہے۔ دو منزلہ عمارت ہے جس میں غریب، نادار طلباء اسلامی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان طلباء کے نحیف و لاغر جسموں اور خشک چہروں سے ان کی مالی حالت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کے معلم صاحبان کافی موٹے تازے اور صحت مند تھے۔ یہاں ہم نے دو رکعت نفل ادا کر کے غار کو دیکھا۔ یہ دراصل دو متصل غاریں ہیں جن کے درمیان میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ پہلی غار میں داخل ہوئے تو ایک چھوٹے سے کمرے کا احساس ہوا کیونکہ شامی حکومت نے اس غار کو تھوڑا سا وسیع کر کے دروازے لگا دیا ہے۔ یہاں سے پھر مدرسہ کی چھت پر آئے جہاں سے پورا دمشق نظر آتا ہے۔ بڑا دلکش اور حسین نظارا ہے۔ تھوڑی دیر یہاں آرام کر کے...... اگلے مقام اربعین کے لیے روانہ ہو گئے...... نیچے بستیوں سے گزر کر پھر پہاڑ چڑھنا تھا...... ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی...... کم از کم تین مضافاتی بستیوں سے گزرنا پڑا۔ سارے راستے میں بچوں کا جھمگھٹا رہا۔ طرح طرح سے بھیک مانگتے رہے۔ جہاں بھی ہم ستانے کے لئے بیٹھتے یہ مکھیوں کی طرح اکٹھے ہو جاتے۔ کچھ اپنے پھٹے کپڑے دکھاتے، کچھ اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے اپنی بھوک جتلاتے۔ جس گلی سے بھی ہم گزرتے بچوں کا جلوس ہمارے ساتھ ساتھ چلتا۔ عورتیں دروازے کھول کر بڑے غور سے دیکھتیں۔ کچھ عورتیں موقع دیکھ کر بخشش مانگ ہی لیتیں۔ دل کو بڑا دکھ ہوا۔ واقعی جس کو اللہ نہ دے انسان بھلا اس کو کیا دے سکتا ہے؟ مجھے دو سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ خانہ کعبہ سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے لئے وہاں بیٹھ گئے۔ ایک پاکستانی عورت نے بھیک کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ خدا کے دربار میں حاضری سے کچھ عجیب حالت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس دربار پر مجھ سے کوئی بات بھی کرے۔ اس دخل اندازی سے بڑا غصہ آیا اور پھر حیرت اس بات کی کہ لوگ اس مقام پر پہنچ کر بھی انسانوں سے مانگتے ہیں۔ میں اس بڑھیا کو پکڑ کر ایک مقام پر لے گیا اور کہا مائی مانگ یہاں سے جہاں سے ساری دنیا لیتی ہے۔ میں تو خود یہاں بھکاری ہوں بھلا تمہیں کیا دے سکتا ہوں؟ عورت نے بُرا سا منہ بنایا۔ کہنے لگی۔ اگر نہیں دے سکتے تو یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟...... ہم لوگ چلتے چلتے تھک کر کوئی ڈھائی گھنٹے مقام اربعین پہنچے۔ اس جگہ کو اربعین اس لئے نام دیا گیا ہے کہ یہاں پر چالیس پیغمبر مدفون ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہاں پر حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت ایوب اور حضرت الیاس (علیہم السلام) کی قبریں ہیں۔ ایک مربع شکل کا بڑا سا پرانا کمرہ ہے۔ یہ کمرہ اس وقت بند تھا۔ بڑی آوازیں دیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی نہ نکلا۔ بائیں جانب ایک بہت بڑا زمین دوز تالاب بھی ہے۔ اس بلندی پر پانی کا ہونا ایک معجزہ ہے۔

(لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں بلوچ کا سفرنامہ ''سولجر نامہ'' سے اقتباس)

عراق

پروفیسر عبدالقادر احمدانی لغاری کی تصنیف ''دجلہ کنارے'' ہے۔ سفرنامہ قدیم جدید عراق کا

آئینہ ہے۔ اہم عراقی مقامات کی تصاویر مع اردو کیپشن مشمولہ ہیں۔ عراق پر امریکی حملہ کے بعد اس کی تاریخی اہمیت دوچند ہے کہ اس میں سابقہ خوشحال عراق کے احوال اور مناظر کی نقشہ کشی ہے۔ مدائن کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سلمان فارسیؓ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدائن کے گورنر مقرر ہوئے۔ آپ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک روز ایک آدمی نے انہیں مزدور سمجھ کر ان کے سر پر اپنا سامان رکھ کر چلنے کو کہا۔ راستے میں گورنر صاحب کو سامان اٹھائے دیکھ کر لوگ چلا اُٹھے کہ یہ تو گورنر ہیں، تم نے ان سے سامان کیوں اٹھوایا؟ لوگوں کے اصرار کے باوجود فرمایا کہ گورنر کا فرض انسانوں کی خدمت کرنا ہے۔ اب تو میں ان کا سامان گھر تک پہنچا کر ہی رہوں گا۔ آپ نے مدائن انتقال فرمایا جو بغداد سے 37 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے۔

جرمنی

نعیمہ جمالی کی تصنیف ''سپنوں کا بھنور'' میں سفر و سیاحت جرمنی کے احوال رقم کیے گئے ہیں۔ تصنیف کے موضوعات ہیں نئے افکار کی سرزمین، کھنڈرات پر عظیم ملک کی تعمیرنو، قدیم عہد، نیا دور، قومی ریاست کا ظہور، جنگ عظیم اول، جنگ عظیم دوم، کولون جہاں خوش بو بہتی ہے، برلن لاوارث دلہن، دیوار برلن، نغموں میں بھیگے ہوئے شہر، بون گرجا اور عجائب گھروں کا شہر، ڈوز لڈ ورف روشنیوں کی بستی، ہائیڈل برگ دل فریب نظاروں کا مرکز کارنیوال، یہ صراحی میں پھول نرگس کا، جرمن عورت یہ بچہ کس کا ہے؟، راہ آگہی، دوسرا آدمی، ریڈیو اور ٹیلی وژن، فلسفہ آرٹ ریس کی جانب۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اہل یونان سے، جرمنوں نے جو اہم سیاسی طرز حکومت اپنائی اور جو آج بھی مغربی جرمنی میں بدستور قائم ہے وہ ہیں شہری ریاستیں۔ اہل یونان نے جابجا جمہوری اصولوں کی بنا پر شہری ریاستیں قائم کیں۔ سپارٹا، کارنتھ اور تھیبس قابل ذکر ہیں۔ یونان کی طرح جرمنی...... پہاڑی علاقہ ہے اور چھوٹی چھوٹی وادیوں کی صورت میں پہاڑوں میں واقع ہے۔''

(مجلہ ''معیار'' اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے اقتباسات)

اس طرح پڑھا

ایک امیر، اللہ کی ہستی سے اس شدت کے ساتھ منکر و مخالف ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے دیوان خانے میں ایک بڑی تختی پر یہ فقرہ لکھوا رکھا تھا۔ (God is no where) یعنی اللہ کہیں نہیں ہے! ایک مرتبہ وہ بیمار ہوا۔ ایک دوست اس کی عیادت کو آیا جس کے ہمراہ ایک بچہ بھی تھا۔ دوست مصروفِ عیادت ہو گیا اور بچہ کمرے کی تصویروں سے دل بہلاتا رہا۔ ناگاہ بچے کی نگاہ اس تختی پر پڑی جس کو اس نے اپنے معصومانہ انداز اور بلند آواز کے ساتھ اس طرح پڑھا (God is now here) یعنی اللہ اب یہاں ہے۔ امیر ملحد نے جس وقت یہ الفاظ اصل عبارت سے خفیف و نامعلوم تغیر کے ساتھ سنے تو ان کے حقیقی مفہوم سے متاثر ہو کر اپنی بدعقیدگی سے فوراً تائب ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے صحت کامل عطا فرمائی۔

شکار

اگر کسی رات کو اچانک کوئی ایسی وباء ناگہانی سے دنیا بھر کے تمام بادشاہ، نواب، مہاراجے، رائے، رئیس، جاگیردار، سیٹھ، ساہوکار، امراء، سرمایہ دار، وکیل اور بیرسٹر وغیرہ مر جائیں تو

نظام عالم میں ذرہ بھر فرق نہ پڑے لیکن اگر اس قسم کی وباء کا شکار کسان، جُلاہے، لوہار، بڑھئی، دھوبی، درزی، معمار، تیلی، نائی، چمار، بھنگی، گوالے، گاڑی بان اور موٹر ڈرائیور وغیرہ ہو جائیں تو یہ دنیا کسی کام کی نہ رہے اور بہت بڑی دوزخ بن جائے۔

(ٹالسٹائی)

حرف 'ر'

ان چار ماہ میں مچھلی کھانا مضر ہے جن میں 'ر' کا حرف نہیں آتا۔ یعنی مئی' جون' جولائی اور اگست۔ واضح رہے کہ یہی چار وسطی مہینے انتہائی طور پر گرم ہوتے ہیں۔ باقی اول و آخر کے آٹھ مہینوں میں 'ر' کا حرف بالالتزام آتا ہے یعنی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر۔

فرق

سورج کے طلوع و غروب میں روزانہ 80 سیکنڈ کا فرق پڑتا ہے۔ 25 دسمبر سے 25 جون تک یہ بڑھتا ہے حتیٰ کہ دن چودہ گھنٹے کا اور رات صرف 10 گھنٹے کی ہو جاتی ہے۔ 21 جون سے 22 دسمبر تک 80 سیکنڈ روزانہ کے حساب سے گھٹتا ہے حتیٰ کہ رات 14 گھنٹے کی ہو جاتی ہے اور دن صرف 10 گھنٹے کا رہ جاتا ہے۔ اس بڑھاؤ گھٹاؤ میں 21 مارچ اور 23 ستمبر کو دن اور رات برابر 12 گھنٹے کے ہو جاتے ہیں۔

نہ آفتاب کی مجال کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور دونوں ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔

صفائی

اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس کا آغاز صفائی سے ہوا۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تو نبی اکرم ﷺ اسے سب سے پہلے طہارت اور وضو کا طریقہ سکھاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ایسے صحابہ کرامؓ موجود تھے جو ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا کرتے تھے۔ پاکیزگی اس دور میں تقویٰ کا حصہ ہوتی تھی۔ مدینہ شریف میں تمام لوگوں کے لباس صاف اور خوشبودار ہوتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں نبی رسالت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے پاس ستر ڈھانپنے کے لئے صرف دو چادریں ہوتی تھیں اور ان پر دس دس پیوند لگے ہوتے تھے لیکن دونوں چادریں پاک اور صاف ہوتی تھیں۔ اسلام پہلا مذہب تھا جس نے ماحول کی صفائی کو عبادت کا درجہ دیا۔ اسلام نے شجر کاری کو باقاعدہ معاشرے کا حصہ بنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر میرے ہاتھ میں ایک سوکھی ٹہنی ہو اور دوسری طرف صور اسرافیل پھونکا جا رہا ہو تو میں ٹہنی فوراً زمین میں بو دوں گا۔" اسلام جانوروں کو گلیوں، بازاروں میں کھلا چھوڑنے کے خلاف ہے۔ راستے میں کھونٹا گاڑنے اور گھروں کا گند دروازے کے باہر پھینکنے کو انتہائی ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اگر آپ اس زمانے کے دوسرے مذاہب اور اور معاشروں کا جائزہ لیں تو آپ کو ان میں صفائی کا یہ تصور نہیں ملے گا۔ میں پیرس شہر میں وارسائی گیا۔ وارسائی فرانسیسی بادشاہوں کا گرمائی دارالحکومت تھا۔ وہاں بادشاہوں کے محلات تھے۔ یہ محلات 1789ء کے فرنچ انقلاب کے بعد خالی کرا لئے گئے اور وہ اب عجائب گھر بن چکے ہیں۔ یہ انتہائی خوبصورت اور پرتعیش محلات ہیں۔ ان کی چھتوں پر سونے سے تصاویر بنی ہیں اور دہلیز سے لے کر باغوں تک سنگ مرمر نصب ہے لیکن اس پورے محل میں کو؟

غسل خانہ اور ٹائلٹ نہیں۔ میں نے محلات کی سیر کے بعد سوچا ''بادشاہ بوقت ضرور کہاں جاتے تھے؟'' پتہ چلا بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے بیٹھے فارغ ہو جاتے تھے جبکہ درباریوں کے لئے دربار سے ذرا ہٹ کر پردے لگے تھے اور ان پردوں کے پیچھے خادم پیتل کی بالٹیاں لے کر کھڑے ہوتے تھے۔ درباری ان بالٹیوں میں پیشاب کرتے تھے۔ درباریوں کی فراغت کے بعد پردے کے آگے پیچھے خوشبو چھڑک دی جاتی تھی۔ فرانس کی پرفیوم انڈسٹری نے انہی پردوں سے جنم لیا تھا۔ پتہ چلا فرانس کا پہلا ٹوائلٹ 1852ء میں بنا تھا اور 1902ء میں پیرس کے لوگوں کو نہانے پر مجبور کرنے کے لئے باقاعدہ قانون سازی کرنا پڑی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں قرطبہ کی اسلامی حکومت نے 785ء میں شہر کا پہلا سیوریج سسٹم بنایا تھا۔ اموی دور میں قرطبہ شہر کے ہر گھر میں ٹوائلٹ اور غسل خانہ ہوتا تھا۔ پورے شہر میں پبلک ٹوائلٹس اور غسل خانے بھی تھے۔ ان غسل خانوں اور ٹوائلٹس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ پندرہویں صدی میں اندلس کی اسلامی ریاست کے زوال کے بعد فرڈیننڈ نے غرناطہ کے محل سے ایک غسل خانہ اکھاڑا اور یہ غسل خانہ ملکہ ازابیلہ کو تحفے میں دے دیا۔ عباسی خلفاء کے دور میں بغداد سے لے کر سمرقند تک درخت کاٹنے اور سڑکوں پر گند پھیلانے کی سزا دس کوڑے ہوتی تھی اور مجرم کو اس سزا کے بعد شہر میں سو درخت بھی لگانا پڑتے تھے اور دس دن تک سڑک پر جھاڑو بھی دینا پڑتی تھی اور امیر تیمور کے دور میں سمرقند دنیا کا صاف ترین شہر تھا۔ یہ وہ ادوار تھے جب یورپ اپنے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ لندن میں ٹخنوں تک کیچڑ اور لید ہوتی تھی اور دنیا کا کوئی فاتح اس گندے جزیرے پر پاؤں تک رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر یورپ جاگا اور اس نے محسوس کیا کہ ترقی اور صفائی کا ایک دوسرے سے انگوٹھی اور نگینے کا تعلق ہے اور جب تک کوئی قوم صفائی کو اپنا پورا ایمان نہیں بناتی اس وقت تک وہ ترقی یافتہ اقوام کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یورپ نے اسلام کے فلسفہ صفائی کو قانون بنا دیا جس کے نتیجے میں یورپ ترقی کے اس مقام پر چلا گیا جو اس وقت پورے عالم اسلام کی خواہش ہے۔ آپ آج دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام کا دورہ کر لیں، آپ کو ان سب میں ایک چیز مشترک ملے گی اور وہ چیز ہو گی صفائی۔ اس طرح آپ دنیا کے تمام پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں جا کر دیکھ لیں۔ آپ کو وہاں بھی ایک مشترک چیز نظر آئے گی اور وہ چیز ہو گی گندگی۔ آپ کو تمام پسماندہ ممالک کی گلیاں، بازار، سڑکیں اور گھر گندے ملیں گے۔ آپ کو وہاں بدبو، گرد، غبار اور کچرا ملے گا اور بدقسمتی سے آج عالم اسلام کے کئی ممالک بدبو اور پسماندگی کا دارالحکومت ہیں۔ گندگی کے اس دارالحکومت میں ہمیں صرف ملائیشیا مختلف نظر آتا ہے۔ ملائیشیا کی ترقی کا آغاز بھی صفائی سے ہوا تھا۔ مہاتیر محمد نے 1980ء میں صفائی کو قانون کی شکل دی تھی۔ 1980ء میں ملائیشیا میں گند ڈالنے اور پھیلانے والوں کے لئے بھاری جرمانے طے کئے گئے تھے اور ان سزاؤں پر پورا پورا عملدرآمد ہوا تھا لہٰذا آج ملائیشیا اسلامی دنیا کا واحد ملک ہے جس میں آپ کو یورپی معیار کی صفائی اور ستھرائی ملتی ہے۔ آپ کو کوالالمپور شہر میں فائیو سٹار ہوٹلوں کے معیار کے پبلک ٹوائلٹس ملتے ہیں اور آپ کو کسی شہر کی کسی سڑک پر تنکا اور ٹشو پیپر دکھائی نہیں دے گا۔

ملائیشیا کے مقابلے میں اگر آپ پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں کوئی سڑک صاف ملتی ہے اور نہ ہی کوئی گلی یا محلہ۔ آپ اس ملک کو ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی بھول جاتے ہیں کہ ترقی صفائی کی ''بائی پراڈکٹ'' ہوتی ہے اور جس ملک کے عوام گھر کا کچرا گلی میں پھینک رہے ہوں یا سگریٹ، ٹشو اور بوتلیں سڑک پر پھینک رہے ہوں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ ملکوں کی ترقی ٹوائلٹس، باتھ رومز اور کچرے کی ٹوکریوں سے شروع ہوتی ہے اور جو قومیں اپنی ''ایش ٹرے'' صاف نہیں کرتیں وہ جدید دور میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ ترقی صفائی کے پیٹ سے جنم لیتی ہے اور جو قومیں صفائی کو اپنا ایمان نہیں بناتیں ترقی کبھی ان کا مقدر نہیں بنتی۔

جانوروں کو انسانوں سے شکایت ہے

جنگل کے تمام جانور، چرند اور پرندرات کے اندھیرے میں اپنے بادشاہ کے اردگرد جمع ہیں۔ ان تمام جانوروں کو انسانوں سے شکایت ہے کہ پہلے تو یہ بتایا جائے کہ انسان جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آج ہم جانوروں سے بھی بدتر ہو چکا ہے۔ کیونکہ؟ پہلے وہ جنگل میں گھس کر ہم جانوروں کو مار ڈالتا تھا مگر آج اپنے ہی شہر میں اپنے ہی بھائی کو مارنے پر تلا ہوا ہے لہٰذا اب وہ ہم سے بھی گیا گزرا ہو چکا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہم جانور تعلیم سے اب بھی بہت دور ہیں مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔

انسانوں سے بہتر ہونے کی بہت سی دلیلیں دی گئیں مثلاً جانوروں نے متفقہ طور پر کہا کہ ہر مخلوق اپنے سے بہتر مخلوق سے متاثر ہو کر ان کے نام رکھتی ہے مگر آج تک کسی جانور نے خود کو انسان کہلانا پسند نہیں کیا بلکہ انسانوں نے ان کے نام اپنائے مثلاً ہمارے جنگل کے بادشاہ کا نام سب سے زیادہ بہادر انسان اپنا کر فخر محسوس کرتا ہے مثلاً وہاں کوئی شیر پنجاب ہے تو کوئی شیر پاکستان ہے۔ اس موقع پر زیادہ احتجاج شیر کی مشیر اول لومڑی نے کیا۔ لومڑی کا کہنا تھا کہ میرے مشورے ماننے سے جنگل میں امن ہے اور میں شیر کو صحیح صحیح مشورے دیتی ہوں مگر انسان جو خود مکر و فریب کی سیاست کرتا ہے تو اس کا نام میرے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور اس سے میرا نام بدنام ہوتا ہے۔ ابھی یہ شکایتیں جاری تھیں کہ الو جو ابھی تک درخت پر بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا، نیچے آیا اور کہا کہ انسانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ مجھ جیسے حقیر فقیر کو بھی معاف نہیں کیا اور جو منحوس ہو اس کو میرا نام دے دیا جاتا ہے۔ وہ تو بھلا ہو مغربی ممالک کا کہ انہوں نے میرے نام کو عقل مندوں سے منسوب کر کے میرے لئے اطمینان کا سامان کر دیا ورنہ میں کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ اس موقع پر یکایک گدھا کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں نے ہمیشہ جنگل کے مفاد میں کام کیا مگر انسانوں نے میرا نام احمقوں کی فہرست میں شامل کر کے میری بے عزتی کی ہے۔ میں مروت اور خاموشی سے انسانوں کے کام آتا ہوں مگر میری عزت خاک میں مل رہی ہے لہٰذا انسانوں کو اس عمل سے روکا جائے اور میری طرح بے لوث ایک دوسرے کے کام آنے کی روش اختیار کی جائے اور گدھا کہہ کر اپنے ہی بھائی کو شرمندہ کرنے کی روایت اب ختم ہونی چاہیے۔

ابھی گدھا شکایت سیل میں اپنی شکایات

نوٹ کرا کر بیٹھا ہی تھا کہ کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا کہ انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ مجھ جیسے وفادار جانور کے نام کو ایک گالی بنا کر رکھ دیا جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری کریں جیسا کہ میں اپنے جنگل اور ساتھیوں کے ساتھ وفادار ہوں۔ اس کے برعکس جو انسان بے وفائی، غداری اور مکاری کرتا ہے اس کا نام بڑی حقارت سے کتا رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ بے انصافی ہے اتنا کہہ کر کتے نے پھر بھونکنا شروع کر دیا۔ جس کو روکنے کے لیے سور جو بہت پہلے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا یکدم اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ میں تمام دنیا میں مرغوب گوشت کی وجہ سے مشہور ہوں۔ غیر مسلم میرا گوشت کھا کر میری نسل ختم کرنا چاہتے ہیں مگر مسلمانوں نے مجھے نسل کشی سے بچا رکھا ہے اور یہ میرا گوشت تو نہیں کھاتے مگر میرے نام کو دونوں ہی اتنی نفرت اور کراہیت کے ساتھ لیتے ہیں کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جناب والا کم از کم غیر مسلموں کو تو زیب نہیں دیتا کہ ایک طرف تو میرا گوشت مزے لے لے کر کھاتے ہیں اور دوسری طرف خاص طور پر امریکن ہر دوسرا تیسرا جملہ میرے اور میرے آباء و اجداد کے نام سے شروع یا ختم کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ یا تو میرا گوشت نہ کھائیں یا پھر میرا نام اپنے نام کی طرح احترام سے لیں۔ گیدڑ سور کے دلائل سن کر کھڑا ہوا۔ اس کو شکایت تھی کہ جو انسان ڈرپوک اور بزدل ہو اس کا نام میرے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے حالانکہ میں بہادر اور دلیر ہوں جبھی شہر کا رُخ کرتا ہوں اور جب بھی خیر سگالی کے لیے جنگل سے شہر جاتا ہوں تو واپسی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ میرا اہم مطالبہ یہ ہے کہ میری امن پسندی کو بزدلی کا نام نہ دیا جائے اور میرے نام کے غلط استعمال کو روکا جائے۔ طوطے میاں سے نہ رہا گیا کہنے لگے کہ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت پرندہ ہوں اور اپنی طوطی سے وفادار ہوں مگر مجھے بھی انسانوں نے بے وفا مشہور کر رکھا ہے۔ مجھے بتایا جائے کہ کتنے انسان مرد اپنی اپنی بیویوں سے وفادار ہیں۔ باخدا میں نے انسانوں کے ہاتھوں ساری کی ساری زندگی اپنی طوطی کے ساتھ ایک معمولی پنجرے میں گزار دی مگر میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے چھوٹے پنجرے میں رہ کر دیکھا ہے کہ انسان عالیشان کوٹھیوں میں رہنے کے باوجود اپنی بیویوں سے مسلسل بے وفائیاں کرتا رہا مگر میرا نام بدنام کرتا رہا۔ اب بتاؤ کہ میں بے وفا ہوں یا یہ کمبخت انسان چشم کہیں کا۔ ابھی یہ شکایتیں جاری تھیں اور بہت سے جانور بھی غصے میں بھرے بیٹھے تھے کہ سورج طلوع ہونے لگا۔ جنگل میں صبح کا اُجالا پھیلنے لگا اور دور سے انسانوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں تو جنگل کے بادشاہ نے اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے اجلاس برخواست کرنے کا حکم دیا کیونکہ ان کو جن سے شکایتیں تھیں ان کی آوازیں قریب سے قریب تر ہو رہی تھیں اور خدشہ تھا کہ یہ انسان جو شہروں میں بھی پرامن نہیں رہتے کہیں جنگل میں بھی ان جانوروں کے امن کو تہہ و بالا نہ کر دیں لہٰذا تمام جانور خاموشی سے اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ خدارا اپنے عیبوں کو ہمارے سر نہ ڈالیں اور ہمیں بدنام نہ کریں۔

(خلیل احمد نینی تال والا کا کالم
جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

بیوقوف

ایک بیوقوف نے دوسرے بیوقوف سے کہا "اگر تم یہ بتا دو کہ میرے پاس اس تھیلے میں کیا ہے تو میں اس تھیلے کے سبھی انڈے تمہیں دے دوں گا۔"

یہ سن کر دوسرا بیوقوف سوچ میں پڑ گیا اور سنجیدگی سے بولا "کچھ اتا پتہ دے یار۔"

پہلے بیوقوف نے کہا "وہ چیز اوپر سے سفید اور اندر سے پیلی پیلی ہے۔"

اس پر دوسرے بیوقوف نے اُچھلتے ہوئے کہا "تو پھر یوں کیوں نہیں کہتے کہ مولی میں گاجریں ٹھونس رکھی ہیں۔"

....

جرم

ایک ادھیڑ عمر عورت نے جس کے شوہر کو ایک ماہ کی سزا ہوئی تھی، صوبے کے گورنر کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ اس کے شوہر کو رہا کر دیا جائے۔

گورنر نے معلوم کیا کہ اس کے شوہر کو کس جرم میں جیل بھیجا گیا ہے۔

"آٹے کی بوریاں چرانے کے جرم میں۔" بیوی نے جواب دیا۔

"کیا وہ تم سے اچھا سلوک کرتا تھا؟" گورنر نے مزید پوچھا۔

"نہیں جناب! اس جیسا ظالم شخص تو دوسرا آج تک پیدا نہیں ہوا۔" بیوی نے دکھ بھرے انداز سے جواب دیا۔

"پھر تم اسے کیوں رہا کرانا چاہتی ہو؟" گورنر نے حیرت سے پوچھا۔

"جناب بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے گھر میں آٹا ختم ہو گیا ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

....

رپورٹ

ایک گوالے نے قریبی تھانے میں علی الصبح جا کر یہ رپورٹ درج کرائی کہ میری گائے رات کو چوری ہو گئی ہے۔

اتفاق سے دوسری صبح اسے گائے مل گئی اور وہ دوڑا دوڑا تھانیدار کے پاس گیا اور کہا "جناب وہ رپورٹ خارج کر دیں مجھے میری گائے مل گئی ہے۔"

تھانیدار نے گڑگڑا کر کہا "یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجرم گرفتار ہو چکا ہے۔"

....

افیمی

ایک افیمی ایک ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے برابر والے مسافر سے کہا "بھائی مجھے اگلے سٹیشن پر جگا دینا۔"

جب اگلا سٹیشن آیا تو اس آدمی نے اس افیمی کو جگا دیا۔ اس نے افیم کی پنک میں اپنی پگڑی کی بجائے ایک پولیس والے کی ٹوپی پہن لی اور ٹرین سے نیچے اُتر گیا۔

بعد میں آئینہ دیکھ کر کہنے لگا...... "بیوقوف نے

میری بجائے پولیس والے کو جگا دیا۔"

......

شادی

لڑکی نے پوچھا "مجھ سے شادی کر کے تم سگریٹ نوشی ترک کر دو گے؟"

لڑکے نے یقین دلایا "ہاں...... ترک کر دوں گا۔"

لڑکی نے پوچھا "اور...... آوارہ گردی سے بھی باز آجاؤ گے؟"

"ہاں...... بابا...... فلم دیکھنا بھی چھوڑ دوں گا......"

"اور ...... کون کون سی بات ترک کر دو گے......؟"

"تم سے شادی کرنے کا ارادہ بھی......"

......

گانا

بیوی شوہر سے "کیوں جی جب میں گانا گاتی ہوں تو آپ باہر کیوں چلے جاتے ہیں؟"

شوہر: "اس لئے کہ کہیں محلے والے یہ نہ سمجھ لیں کہ میں تمہیں پیٹ رہا ہوں۔"

......

دوسری شادی

بیوی شوہر سے "اگر میں مرگئی تو کیا آپ دوسری شادی کرلیں گے؟"

شوہر: "آپ کے اس سوال کا جواب دینا تو بہت مشکل ہے بیگم۔"

بیوی: "کیوں؟"

شوہر: "اگر میں نے کہہ دیا کہ ہاں، تو آپ کا دل ٹوٹ جائے گا اور نہیں کہوں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

......

چھلانگ

فلم ڈائریکٹر ہیرو سے: "اب تم اس پہاڑی سے چھلانگ لگا دو۔"

ہیرو قدرے حیرت سے: "لیکن مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔"

فلم ڈائریکٹر: "کوئی بات نہیں یہ میری فلم کا آخری سین ہے۔"

......

الو

استاد اپنے شاگرد سے: "تم ایک دم الو ہو۔"

شاگرد: "جناب میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا ہوں۔ آپ مجھے الو کہتے ہیں اور میرے ڈیڈی مجھے گدھا کہتے ہیں۔"

......

☆

پہلا: "میرا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن اخبار کی جگہ لے لیگا۔" دوسرا: "مگر میں تو اخبار کو ہی فوقیت دوں گا۔"

پہلا (حیرت سے): "آخر کیوں؟"

دوسرا: "ٹیلی ویژن سے نہ مکھیاں اُڑا سکتا ہوں اور نہ ہی چہرہ ڈھانک کر سو سکتا ہوں۔"

......

آدمی

چھت پر بیٹھی ہوئی ایک مکھی نے دوسری سے کہا "یہ آدمی بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ ہزاروں روپے خرچ کر کے چھت بنواتے ہیں اور چلتے زمین پر ہیں۔"
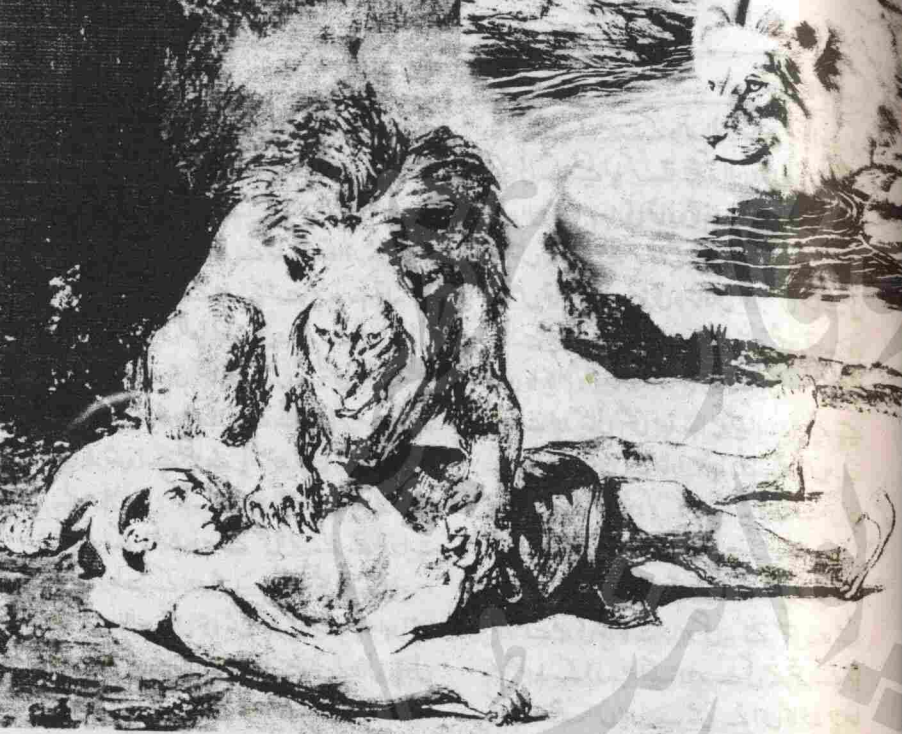
پروفیسر محمد ظریف خان

لکڑہاروں کا ہتھیارا

شیر کے منہ کو انسانی خون لگا تو اس ظالم نے پندرہ یوم کے دوران پانچ مردوں اور ایک نوجوان عورت کا خون کر ڈالا۔ مرنے والوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ سب لکڑ ہارے اور اسی جنگل میں کام کرنے والے تھے۔ ان لوگوں کی یکے بعد دیگرے موت کے بعد لکڑ ہاروں نے جنگل سے کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا شروع کر دیا......

ایک آدم خور شیر کے شکار کی دلچسپ اور انوکھی داستان

"یار خان جی!...... آخر کوئی حد ہوتی ہے بے مروتی کی۔ تمہارے لیے تو چھ ماہ چھ لمحوں کے برابر ہوں گے۔ آخر کو مصروف دکاندار جو ٹھہرے لیکن بھائی ...... ہم تو کام کے نہ کاج کے...... اپن کے لیے تو یہ چھ صدیاں بن چکے ہیں۔ بھیا! اپنے کنویں سے نکلو...... ہانسی کواڑا سے باہر بھی کچھ ہے۔ اور

ہاں!...... وہ بگھیر (شیر) پھر آیا تھا۔ مراری کی لونڈیا کو اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اب میں تو سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے بوریا بستر ہی گول کر لیا جائے۔ بابو جی سے کہہ دیا ہے کہ اس جنگل کا ٹھیکہ واپس کر دیں۔ غضب خدا کا...... پندرہ دن میں چھ بندوں کا خاتمہ کر چکا ہے۔ خدا کے لیے جتنی جلد ہو سکے یہاں آؤ

اور اس موذی کا کام تمام کر دو۔ کیا تم اس وقت آؤ گے جب بگھیر مجھے اپنا نوالہ بنالے گا اور تم فاتحہ خوانی کے سوا کچھ نہ کرسکو گے۔"

منور خان کا خط میرے سامنے تھا اور میں خود پر لعنت ملامت کرتے ہوئے اسے پڑھ رہا تھا۔ منور نے ٹھیک ہی تو لکھا تھا۔ مدینہ پور سے میرا گاؤں ہانسی کواڑا دور ہی کتنا تھا۔ محض بیالیس میل۔ لیکن کاروباری گورکھ دھندوں نے مجھے اتنی فرصت بھی نہ دی کہ میں اپنے لنگوٹیے یار منور خان سے ملنے کے لیے وہاں جا سکتا۔ بھلا ہو چچا میاں کا کہ لاولد ہونے کے باعث وہ مجھے متبنیٰ کر گئے تھے اور اب ان کی رحلت کے بعد میں......یعنی شفیع احمد خان......

جو زمانہ طالب علمی ہی میں بہترین نشانہ باز اور اچھا شکاری بن گیا تھا، ان کا کاروبار سنبھال کر دال چاول کا حساب کتاب کرنے پر مجبور تھا۔

اب صحیح تاریخ یا سن تو یاد نہیں مگر گمان غالب ہے کہ سن ۴۲ یا ۱۹۴۳ء رہا ہوگا۔ میں یو پی (بھارت) کے پہاڑی ضلع نینی تال کے ایک بڑے قصبے ہانسی کواڑا میں اپنے مرحوم چچا کی بڑی دکان چلا رہا تھا۔ میں نے بی اے کرنے کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لیا ہی تھا کہ تایا ابو (بڑے چچا) انتقال کر گئے۔ مجبوراً مجھے تعلیم ترک کر کے ان کا کاروبار سنبھالنا پڑا۔ منور خان میرا ہم جماعت تھا۔ میں نے جب پڑھائی لکھائی چھوڑی تو وہ بھی علی گڑھ یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے گاؤں مدینہ پور واپس آیا اور اپنے باپ کے ساتھ ٹھیکیداری کرنے لگا۔ میں نے اپنے کام دھندے کی وجہ سے "ذوق شکارگی" کو کم از کم وقتی طور پر ہی خیر باد کہہ دیا تھا لیکن جب منور کا خط موصول ہوا تو میرے اندر بیٹھا ہوا شکاری باہر آیا اور میرے سر پر بندوق رکھ کر مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں موذی بگھیر کا خاتمہ کر ڈالوں۔ یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ منور کے والد انور خان جنگلات کی کٹائی کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ ان دنوں جس جنگل میں ان کا کام جاری تھا وہ گاؤں مدینہ پور سے کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ جنگل بڑا وسیع، عریض تھا جو اپنی سرسبزی و شادابی اور جنگلی حیات کی وجہ سے پورے غیر منقسم ہندوستان میں مشہور تھا۔ منور خان کا کام بڑا سادہ اور آسان تھا۔ بس درختوں کی حفاظت اور کٹائی یعنی مہذب چوکیدار۔ روپے پیسے کے معاملات ان کے باوا سنبھالتے تھے اس لیے خان موصوف نے خود کو "کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے" جیسے "القابات واعزازت" سے نوازا تھا۔

علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد چھ مہینے تک منور سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔ ہفتے عشرے میں ہم خطوط کے ذریعے ایک دوسرے کی خیر خبر لے لیا کرتے تھے۔ اس بار جب میں نے اس کا خط پڑھا تو جہاں میرے دل میں اس کی شدید محبت جاگی وہیں شیر کے شکار کا جذبہ بھی مچل پڑا۔ قدرت خدا کی کہ مجھے اسی دن ہانسی کواڑا سے راہ فرار حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میرا چھوٹا بھائی ڈیرہ دون شہر کے ایک کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ اس کے کالج میں موسم سرما کی تعطیلات شروع ہوئیں تو وہ عین اس وقت گھر واپس آیا جب میں نے منور کا خط پڑھ کر کسی طرف ڈال دیا تھا۔ پھر جس عجلت کے ساتھ دکان کا نظام اپنے بھائی وصی احمد خان کے حوالے کر کے اور جیپ سنبھال کر ہانسی سے مدینہ پور کی طرف اُڑا ہوں وہ منظر یاد کر کے مجھے آج تک ہنسی آتی ہے۔ صرف پندرہ، بیس منٹ کے اندر اندر میں نے جیپ کو شکار میں کام آنے والے ضروری ساز وسامان اور اسلحہ سے لیس کر لیا تھا۔

جب میں مدینہ پور میں منور کے گھر پہنچا تو مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ منور مجھے اس طرح کسی

اطلاع دیئے بغیر اور اچانک اپنے سامنے پا کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ فرط محبت سے مغلوب ہو کر دوڑا اور بے تابانہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ مجھ سے گلے شکوے کرتا رہا اور پھر اس نے اپنے باورچی کو صرف ایک گھنٹے کے نوٹس پر شاندار کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ کھانا واقعی بڑا پرتکلف اور لذیذ تھا جسے حلق تک ٹھونس کر میری آنکھیں تو نیند سے بوجھل ہو گئیں لیکن منور تو اس وقت بالکل ہی ستم گر بن گیا تھا۔ اس نے میری جان اس وقت تک نہ چھوڑی جب تک مجھے اس شیر کا پورا شجرۂ نسب بتا کر اس کے ہاتھوں قتل عام کی داستان نہ سنا ڈالی۔

منور نے بتایا کہ مدینہ پور کے جنگلات میں شیر اور چیتے ضرور پائے جاتے ہیں لیکن ان کا بسیرا جنگل کے آخری سرے پر پہاڑی ٹیلوں کے قریب ہے۔ مگر پندرہ بیس روز قبل ایک شیر بستی کے بالکل نزدیک آ گیا۔ چند دیہاتیوں نے اسے دیکھا اور منور کو اس کی اطلاع دی۔ منور نے چند نشانہ بازوں کو شیر کا شکار کرنے کو کہا مگر غالباً یہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس وقت تک وہ "بگھر" آدم خور نہ تھا مگر ایک لکڑہارے کی حماقت سے اس کے منہ کو خون لگ گیا اور پھر تو اس نے مارا ماری مچا کر رکھ دی۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک شام جھٹپٹے کے وقت ایک لکڑہارا جنگلات سے اپنا کام ختم کر کے بستی کی طرف آ رہا تھا کہ دوران راہ اس نے شیر کو دیکھا جو ایک جوہڑ کے کنارے کھڑا اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ اس کی پشت لکڑہارے کی طرف تھی۔ اس بھائی ترکھان کو جو شیر مار خان بننے کی سوجھی تو دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور پھر چشم زدن میں شیر کی کمر پر کلہاڑی کا بھرپور وار کر ڈالا لیکن شیر انسانی بو سونگھ چکا تھا اس لیے وہ بھی انتہائی پھرتی سے واپس پلٹا اور اس نے لکڑہارے کا گلا دبوچ لیا۔ بے شک کلہاڑی کے وار سے اس کی کمر پر شدید زخم آیا لیکن اس کے لیے فوری طور پر مہلک نہ تھا۔ اسی وقت حسن اتفاق سے منور خان کے والد انور خان اپنی جیپ دوڑاتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ شیر نے جو بھاری جیپ کے انجن کی زبردست گھرگھراہٹ سنی تو وہ اپنے شکار کو چھوڑ کر بھاگ نکلا مگر اس سے قبل انسانی خون اس کے منہ سے ہوتے ہوئے حلق میں اُتر چکا تھا۔ منور کے والد نے لکڑہارے کو سنبھالا دیا مگر اس کا وقت نزع تھا۔ اس نے آخری ہچکیاں لیتے ہوئے انور خان کو شیر کے متعلق بتایا اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اس دن سے شیر کے منہ کو انسانی خون لگا تو اس ظالم نے پندرہ یوم کے دوران پانچ مردوں اور ایک نوجوان عورت کا خون کر ڈالا۔ مرنے والوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ سب کے سب لکڑہارے اور اسی جنگل میں کام کرنے والے تھے۔ ان لوگوں کی یکے بعد دیگرے موت کے بعد لکڑہاروں نے جنگل سے کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا شروع کر دیا اور اس طرح منور خان اور ان کے والد انور خان کے دھندے کا بھٹہ بیٹھ گیا۔ اسی شیر کی "ہتھیا" کرنے کے لیے منور نے مجھے دعوت دی۔

کسی خونی درندے بالخصوص شیر یا چیتے کے شکار کا اصول یہ ہوتا ہے کہ جس طرح کسی ملزم کو تلاش کرنے کے لیے کوئی سراغ رساں پہلے کوئی نشانی تلاش کرتا ہے اسی طرح شیر یا چیتے کا شکاری بھی ایسے ہی آثار کا متلاشی رہتا ہے۔ مجھے چونکہ قدر مشترک یہ نظر آئی کہ مرنے والوں کی اکثریت لکڑہاروں پر مشتمل تھی بالخصوص وہ جو اپنے اوزار و ہتھیار لے کر جنگل کی طرف جا رہے تھے اس لیے میں نے ایک عجیب وغریب فیصلہ کیا۔ وہ یہ کہ اس شیر کا شکار روایتی طور پر مچان باندھ کر یا ہانکا لگا کر کرنے کی بجائے لکڑہاروں جیسا بھیس بدل کر کیا

اگست

جو خواب دیکھتی آئی تھی، آنکھ صدیوں سے
حقیقتوں میں وہ ڈھالے گئے تھے آج کے دن
شکستہ پائی نے توڑیں تمام زنجیریں
سروں پہ تاج اچھالے گئے تھے آج کے دن
یہی وہ دن تھے کہ جب ایک مردِ آہن نے
اٹھائی تیرہ شبوں کے ہاتھ میں مشعل
غلامیوں کے کھنڈر! جائیداد تھی اپنی
عطا کیے ہمیں آزادیوں کے شیش محل
گھٹی فضا میں تراشی گئیں کشادگیاں
کھڑی تھی گھیرے ہوئے جو فصیل! ڈھائی گئی
خدا کا شکر کریں جس قدر بھی ہم کم ہے
جو قوم اسیر تھی، فرمانروا بنائی گئی
وطن کی خاک تجھے آنکھ میں لگانے کو
وہ لوگ کیا تھے، جو سیلابِ خوں سے گزرے تھے
وہ راہنما تیری تاریخ کا ہیں سرمایہ
وہ ذی شعور جو راہِ جنوں سے گزرے تھے
تیری رگوں میں لہو ہے تیرے شہیدوں کا
تیرا شباب خریدا نہیں دکانوں سے
میرے وطن تیری بنیادیں کیوں نہ ہو مضبوط
بھرا گیا ہے اسے تیس لاکھ جانوں سے
تجھے ہماری ضرورت پڑے تو حاضر ہیں
دیا ہے تو نے ہمیں، تجھ سے جو ہنر مانگا
نچوڑ دیں گے بدن سے لہو کا ہر قطرہ
فدائیوں سے خراجِ وفا اگر مانگا

کلام: مظفر وارثی
(مرسلہ: تسنیم انور سلیمی)

جائے۔ ظاہر ہے کہ شیر کو ایک لکڑہارے کی کلہاڑی سے گزند پہنچی تھی اس لیے وہ ان سب کا دشمن بن بیٹھا۔ مدینہ پور میں اسی شب رات گئے میں نے دو تین ایسے افراد سے بھی ملاقات کی جنھوں نے مختلف مقامات پر شیر کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔ ان لوگوں کی زبانی یہ علم ہوا کہ شیر کی پشت کا ایک حصہ زخمی ہے۔ اس کی کٹی ہوئی کھال میں سے گوشت دکھائی دے رہا تھا۔ ان شواہد کی روشنی میں میں نے یہ طے کیا کہ جتنی جلد ہو سکے شیر کو ٹھکانے لگانا بہتر ہوگا۔ چنانچہ اگلے ہی روز سورج چھپنے کے وقت میں اور منور خان چند دیہاتیوں اور دو عدد تجربہ کار شکاریوں کے ہمراہ جنگل میں داخل ہوئے۔ میں نے لکڑہاروں جیسا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ میں نے جو قربانی کا بکرا بننے کا فیصلہ کیا تھا یہ لباس اسی کی ضرورت تھا۔ منور خان اور دیگر شکاری تو مچانیں باندھ کر درختوں پر چڑھ گئے۔ ان کے پاس شیر کا شکار کرنے والی بھاری رائفلیں تھیں جبکہ کلہاڑا اور عصا بردار دیہاتی درختوں کے پیچھے چھپ گئے۔ میں اپنی رائفل کو ایک پہلو میں دبائے ایک گھنے درخت کے نیچے کچھ اس طرح لیٹا ہوا تھا جیسے چلتے چلتے تھکا اور درخت کے نیچے آرام کرنے لگا ہوں مگر اس رات شیر بھی کہیں آرام کرتا رہا۔ ہماری رات آنکھوں میں کٹ گئی اور صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہم واپس منور خان کی حویلی میں آگئے۔

ہم سب تمام شب کے جاگے ہوئے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد پڑ کر ایسے سوئے کہ سہ پہر ہی کو کچھ خبر ہوئی۔ منور خان مجھ سے نصف گھنٹہ پہلے ہی بیدار ہوئے تھے۔ ہم نے شام 4 بجے کے قریب کھانا کھایا۔ بعد ازاں چائے سے شغل ہونے لگا۔ چائے نوشی کے دوران ہم شکار کے بارے میں ہی گفتگو کرتے رہے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک

عجیب ترکیب آئی۔ تھی تو پرخطر مگر خوش قسمتی دے
ساتھ تو بن جاتی تیر بہدف اور پراثر۔ میں نے جب
منور خان کو وہ تدبیر بتائی تو وہ اچھل پڑا اور اس کے
ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی مگر میں
اس ترکیب سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا۔ اس کہانی
کو پڑھتے ہوئے آپ خود سمجھ جائیں گے۔ اس بار
ہم نے رات کالی کرنے کی بجائے یہ فیصلہ کیا کہ
شکار کے لیے صبح چار بجے کے قریب گھر سے نکلا
جائے گا۔ موسم گرما میں عموماً لکڑ ہارے اسی وقت
اپنی مزدوری پر جاتے ہیں۔ اس بار ہماری پارٹی میں
شکاریوں اور مددگاروں کی تعداد کم تھی۔ ہم جو روانہ
ہوئے تو میرے ہاتھوں میں ایک آرا بھی تھا۔
درخت کاٹنے والا موثر آلہ۔ لباس حسب معمول وہی
لکڑ ہاروں والا۔ دھوتی، کرتا، سر پر چھوٹی سی پگڑی یا
منڈاسا۔ کمر میں ایک موٹا رسہ بندھا ہوا تھا۔ اس بار
ہم نے اس جوہڑ کے قرب و جوار میں مورچہ لگایا تھا
جہاں عینی شاہدین نے اسے دیکھا تھا اور جہاں سے
وہ ظالم اپنے واحد خاتون شکار کو لے اُڑا تھا۔ میں
نے منور خان سے کہا کہ وہ کسی موٹے سے درخت پر
جہاں تک ممکن ہو اوپر تک چڑھ کر بیٹھ جائے۔ منور
واقعی درخت پر چڑھنے کا ماہر تھا۔ وہ تقریباً درخت کی
پھنگ تک جا پہنچا۔ اس نے نہایت مہارت کے
ساتھ ایک موٹی سی شاخ پر بسیرا کیا اور رائفل کو بھی
مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ ادھر میں اس سے نیچے
والی مضبوط ٹہنی پر جا بیٹھا اور جھوٹ موٹ آرے کو
ایک شاخ پر چلانے لگا۔ شب کے سناٹے میں آرا
چلنے کی آواز دُور دُور تک جا رہی تھی۔ میں نے اپنی
رائفل ایک چھوٹی سی ٹہنی پر ٹانگ رکھی تھی۔ ابھی مجھے
آرا چلاتے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں
گے کہ جنگل چھوٹے جانوروں اور پرندوں کی بلند
آوازوں سے گونج اُٹھا اور پھر چند ہی لمحوں بعد شیر
کی دل دہلانے والی دھاڑ سے جنگل کا جنگل لرز
اٹھا۔ شیر عین اسی درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا جس
پر بیٹھ کر میں لکڑ ہاروں جیسی یعنی لکڑی کاٹنے کی
اداکاری کر رہا تھا۔ شیر نے مجھے کینہ توز نظروں سے
گھورا اور پھر مجھ پر چھلانگ لگانے کے لیے اپنے
قدم پیچھے ہٹا کر زمین سے رگڑنے لگا۔ مگر اب
ایڑیاں رگڑنا ہی اس کے نصیب میں لکھا تھا۔ یکدم
ایک زوردار دھماکہ ہوا اور شیر اوندھے منہ گر کر تڑپنے
لگا۔ یہ دھماکہ اس گولی کا تھا جو منور خان کی بھاری
رائفل سے نکل کر شیر کے اگلے کاندھے میں ترازو ہو
گئی تھی۔ مگر وہ شیر تھا کوئی گیدڑ نہیں۔ وہ یکدم پھر
اُٹھا اور دل دوز چیخ کے ساتھ تقریباً 20 فٹ اونچی
چھلانگ لگا گیا۔ وہ مجھ سے صرف پانچ فٹ نیچے تھا۔
اندھا کیا چاہے...... دو آنکھیں۔ میں نے بھی اس
وقت آرے کو پھینکا ایک طرف اور رائفل ہاتھ میں
لے کر جو فائر کیا وہ گولی ٹھیک شیر کی آنکھوں کے
درمیان ماتھے پر جمی اور پھر تو اس کی موت میں کوئی
شک شبہ نہ رہا۔

میری ترکیب اپنی جگہ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ
میری نظر میں "شیر مار خان" بہرحال منور خان ہی
رہے۔ پہلی کاری ضرب تو شیر پر انہوں نے ہی لگائی
تھی ناں......؟ اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ
میری ترکیب کیا تھی؟ یہ شیر تقریباً دس فٹ اور سات
انچ لمبا تھا۔ کاش!...... اس کی کھال ہمارے کسی کام
آ سکتی لیکن وہ تو اچھی خاصی گل سڑ گئی تھی۔ منور خان
کے والد انور خان نے ہمارے شکار کو ان الفاظ میں
خراج تحسین پیش کیا تھا:

"تم نے کیا کمال کیا!...... اگر تم اسے نہ مارتے
تو وہ غریب اپنا سارا بدن گلنے سڑنے کے نتیجے میں
دو چار دن بعد خود ہی مرجاتا۔"

کامران امجد خان

ظریفہ قاضی زادہ

قدامت پسند افغانستان کی پہلی خاتون میئر

افغانستان میں عورتوں کا اہم عہدوں پر فائز ہونا انتہائی غیر معمولی ہے لیکن ظریفہ قاضی
زادہ نے ملک کی پہلی خاتون میئر بن کر امید کی شمع روشن کر دی ہے۔ وہ بھیس بدل کر
راتوں کو گلیوں میں نکل جاتی ہے۔ مردانہ لباس اور نقلی مونچھیں لگا کر موٹر سائیکل پر سوار
ظریفہ مردوں کی مدد اور بجلی چوروں کے خلاف کارروائی کے لیے تیار رہتی ہے۔

افغانستان...... جہاں کے مردوں کی
انتہا پسندی، تنگ نظری، بنیاد پرستی کو ایک طعنہ بنا کر
دنیا بھر میں امریکی اور مغربی میڈیا نے اس خطہ کے
غیور عوام اور ان کی روایات کے خلاف زہریلا
پراپیگنڈہ جاری رکھا اور اب بھی رکھے ہوئے ہے
لیکن اسی افغانستان کی ایک بہادر اور انتہائی باہمت
خاتون نے آج امریکی اور مغربی میڈیا کو افغان
عورت کی شجاعت، بلند ہمتی اور صلاحیتوں کی تعریف
کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ امریکی اور مغربی میڈیا جو
اب تک افغان عورتوں کے مخصوص برقع اور حجاب کو

تنقید کا نشانہ بناتا آیا ہے، آج ایک افغان عورت کے کارناموں کی داستان بیان کرنے پر مجبور ہے۔ یہ بے مثال افغان خاتون ظریفہ قاضی زادہ ہے۔

ظریفہ قاضی زادہ کا تعلق افغانستان کے صوبہ بلخ کے شمالی علاقے میں واقع ایک گاؤں نو آباد سے ہے۔ صرف 10 برس کی عمر میں ان کی شادی ایک قدامت پسند افغان گھرانے میں ہوئی اور وہ عام افغان عورتوں کی طرح اپنے سسرال والوں کے گھر میں گھریلو کام کاج میں مصروف رہتی۔ کم عمری میں شادی کے باعث ظریفہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکی جس کا افسوس اسے آج بھی ہے کیونکہ 10 سال کی عمر تک وہ تمام جماعتوں میں بہترین تعلیمی کارکردگی دکھاتی رہی تھی۔ بچپن سے ہی اسے جج بننے کا شوق تھا مگر صرف 10 سال کی عمر میں ہی اس کے خواب گھریلو ذمہ داریوں کی نذر ہو گئے۔ صرف 15 برس کی عمر میں وہ پہلے بچے کی ماں بن چکی تھی۔ اب اس کی عمر پچاس برس ہے اور اس کے پندرہ بچے ہیں جبکہ چھتیس پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہیں۔

ظریفہ کے دل میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ شروع سے موجزن تھا اور گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ سماجی امور اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی بھرپور دلچسپی لیتی رہی ہے۔ جہاں اسے روایتی افغان کھانے پکانے، کشیدہ کاری اور دستکاری کے فن پر پورا عبور حاصل ہے وہیں وہ دوسروں کے کام آنے کا کوئی موقع بھی نہیں چھوڑتی۔

طالبان کے دور حکومت میں ظریفہ نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مرکزی شہر مزار شریف میں سکونت اختیار کر لی تھی اور یہاں سے ہی اس نے اپنی سماجی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ ان دنوں ظریفہ نے بچوں کو حفاظتی قطرے پلانے اور انجکشن لگوانے کے کاموں میں مقامی لوگوں کی بھرپور مدد کی اور اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا بھی

ظریفہ بیس سال قبل اپنے شوہر کیساتھ لی گئی تصویر دکھا رہی ہیں

سکھانے لگی۔ اس نے اپنی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کیا اور اپنے گاؤں کی ترقی کے منصوبے بنانے لگی۔ اسی دوران اس کے دماغ میں ایک انوکھا خیال پیدا ہوا۔ وہ یہ کہ اس نے اپنے گاؤں کو بجلی کی فراہمی کے کام کا بیڑہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انوکھا اس لیے کہ افغانستان کے بڑے شہروں میں بھی بہت کم لوگوں کو بجلی کی سہولت میسر ہے۔ کجا ایک دور دراز گاؤں کو بجلی فراہم کی جاسکتی۔ دوسرا یہ کہ ظریفہ اس وقت تک خود کسی اہم عہدے پر فائز نہ تھی پھر بھی وہ یہ کام کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

اس دوران 2004ء کے انتخابات ہوئے تو ظریفہ قاضی زادہ نے میئر کے عہدے کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ انتخابات میں ظریفہ کو کامیابی نہ مل سکی تاہم اس نے اپنے عہدے سے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ اس نے گاؤں کے مردوں سے اس حوالے سے بات چیت کا آغاز کیا لیکن سب نے اس کی بات کو ہنس کر ٹال دیا اور اس پر غور کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ ظریفہ نے اس کے باوجود ہمت نہ ہاری اور کابل جا کر وزارت بجلی و پانی کے عہدیداروں سے ملنے کی ٹھانی۔ اس حوالے سے ظریفہ کا کہنا ہے کہ ”2004ء میں جب میں نے افغانستان کے بجلی کے وزیر سے ملنے کابل جانے کا فیصلہ کیا تو اپنے دور دراز کے سہولتوں سے عاری گاؤں سے کابل پہنچنے کے لیے میرے پاس کرایہ اور راستے کے اخراجات کے لیے رقم تک نہ تھی۔ میں نے مقامی لوگوں سے کچھ رقم بطور قرض مانگی لیکن انہوں نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مجبوراً میں نے اپنے زیورات گروی رکھ کر رقم حاصل کی اور اپنی چار سال کی بیٹی کو لے کر کابل روانہ ہو گئی۔ کابل میں وزیر بجلی و پانی کی رہائش گاہ پر پہنچی لیکن کئی روز تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تاہم کئی روز کے انتظار کے بعد میں وہاں لوگوں کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ میرے پسماندہ گاؤں کو بجلی فراہم کی جائے اور چار ماہ کے انتظار کے بعد ہمارے دورافتادہ گاؤں میں بجلی کا کنکشن فراہم کر دیا گیا بلکہ اس سے اتنی آمدنی ہوئی کہ ہم نے نہر پر پل بنانے کا منصوبہ بھی مکمل کروا لیا۔“

ظریفہ نے انتخابات میں ناکامی کے باوجود سماجی خدمت اور سیاسی سرگرمیوں کو ترک نہیں کیا بلکہ گھروں میں پانی کی فراہمی اور دیگر کئی بڑے

کارنامے انجام دیئے۔ بجلی کی فراہمی کا ناقابل یقین کارنامہ انجام دے کر وہ پہلے ہی اپنی دھاک بٹھا چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بجلی اور پانی چوروں کے خلاف بھی زبردست مہم شروع کر دی۔ اس کا کہنا ہے ”میں بجلی اور پانی چوری کرنے والوں کے سخت خلاف ہوں جو قانون توڑتے اور دوسروں کا حق مارتے ہیں اس لیے میں ان کے خلاف کارروائی کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں۔“

صرف دو سال بعد ظریفہ قاضی زادہ کو نوآباد گاؤں کا میئر منتخب کرلیا گیا۔ گاؤں کے مرد جن کے لیے عورتوں کو بڑا عہدہ دینا ناقابل قبول تھا، اب ظریفہ کا یہ روپ قبول کر چکے ہیں اور اسے اس کے کاموں میں مدد کی پیشکش کرتے ہیں مگر ان کو ظریفہ کا یہ جواب ملتا ہے ”مجھے صرف آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ جب کبھی آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کی بات حکومتی عہدیداروں تک پہنچاؤں گی اور آپ کے مسائل حل کرواؤں گی۔ رات کو کبھی کچھ گڑبڑ ہو تو بھی فوری طور پر مجھے آگاہ کریں۔ میں اپنی بندوق سمیت فوری طور پر پہنچ جاؤں گی۔“

ظریفہ نے بے شمار لوگوں کو بجلی اور پانی چوری کرنے پر جرمانے کیے ہیں اور اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ اس کے گاؤں میں جرائم کم سے کم ہوں۔ وہ عورتوں کے ساتھ اپنے عہدے کی شان کو برقرار

رکھنے کے لیے مردوں کی بھی مختلف امور میں مدد کرتی ہیں۔ اس حوالے سے ایک مشہور قصہ گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر ہے۔

ہوا یوں کہ دو گاڑیاں زبردست قسم کی کیچڑ زدہ کھائی میں پھنس گئیں۔ کافی لوگوں نے مل کر گاڑیاں نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی اثناء میں انہیں ظریفہ اپنے ٹریکٹر پر بیٹھی اسی طرف آتی دکھائی دی۔ اس نے قریب آ کر ایک رسی کی مدد سے ایک گاڑی کو ٹریکٹر کے ساتھ باندھا اور ٹریکٹر کے ذریعے گاڑی کھینچنے لگی۔ گاڑی کا ڈرائیور چلاتا رہا کہ عورتیں گاڑی ٹھیک سے نہیں چلا سکتیں مگر ظریفہ نے تحکمانہ لہجے میں ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا اور گاڑی کھینچ کر باہر نکال لی۔ اس کے بعد دوسری گاڑی کو بھی باہر نکال لیا۔ مرد حضرات حیران نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

وہ راتوں کو بھی بے خوفی سے لوگوں کی مدد کو نکل جاتی ہے۔ رات گئے گاؤں میں کسی قسم کی گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی وہ مردانہ لباس پہن کر مصنوعی مونچھیں لگاتی اور بندوق پکڑ کر صورتحال کا مقابلہ کرنے نکل جاتی ہے اور میئر کے عہدے کا حق ادا کرتے ہوئے لوگوں کی ہر ممکن مدد کرتی ہے۔

اس نے اپنے گاؤں میں ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کروا دی ہے۔ جہاں مرد اور عورتیں الگ الگ حصوں میں نماز ادا کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو قرآن پاک پڑھنے کے لیے دور دراز علاقوں میں نہیں جانا پڑتا اور لوگ باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے بھی سکون سے گاؤں کی اسی مسجد کا رُخ کرتے ہیں۔ نیز ایک پختہ سڑک کی تعمیر سے اب نوآباد گاؤں شہر سے منسلک ہو گیا ہے اور لوگوں کو آمدورفت میں بے حد آسانی ہو گئی ہے۔

ظریفہ قاضی زادہ...... افغان عورتوں کے لیے ایک روشن مثال بن چکی ہے۔ وہ گاؤں کی عورتوں کو آگے بڑھنے اور زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں سے نپٹنے کے طریقے بتاتی رہتی ہے۔

اس کا کہنا ہے ”میں گاؤں کی عورتوں کو بتاتی ہوں...... کبھی میں بھی آپ کی طرح معمولی گھریلو عورت تھی۔ آج میں ہزاروں لوگوں کے اجلاس کی صدارت کرتی ہوں۔ لوگ میری بات کو اہمیت دیتے ہیں اور مجھے ایک اہم عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔“

ظریفہ افغان عورت کے سماجی اور سیاسی کردار کو

ظریفہ قاضی زادہ اپنے شوہر اور دیگر اہلخانہ کے ساتھ

بڑھانے کی حامی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ مغربیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی روایات اور رسم و رواج سے بغاوت کرنے والوں کے بھی سخت خلاف ہے۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور انہیں آگے بڑھنے کے مواقع دینے کی تو حمایت کرتی ہے لیکن ساتھ ہی مذہب اور مذہبی اصولوں کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں کی مخالفت کرتی ہے۔ اس کے مطابق ہمارا مذہب اور ہمارا معاشرہ عورتوں کو آگے بڑھنے سے نہیں روکتا۔ بس ہمیں انہیں ان کے حقوق دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی عورتوں کو بھی آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کا حوصلہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔“

افغانستان میں عورتوں کا موٹر سائیکل چلانا خلاف معمول ہے بلکہ اکثر لوگ اسے معیوب تصور کرتے ہیں لیکن ظریفہ نہ صرف موٹر سائیکل چلاتی ہے بلکہ اپنے ٹریکٹر کو بھی پوری صلاحیت اور کامیابی سے چلاتی نظر آتی ہے۔ اس کا کہنا ہے ”موٹر سائیکل میرے کافی کام آتی ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت کسی بھی طرح کی غیر معمولی صورتحال پیش آنے پر میں اس پر سوار ہو کر فوراً گاؤں والوں کی مدد کو جاتی ہوں البتہ کوشش کرتی ہوں کہ موٹر سائیکل پر سوار ہونے سے قبل مردانہ روپ اختیار کرلوں تاکہ لوگوں کو معیوب نہ لگے۔“

ظریفہ قاضی زادہ کے اپنے شوہر کے ساتھ مثالی تعلقات ہیں اور ان کے درمیان کبھی بھی کسی وجہ سے سنجیدہ نوعیت کا لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ سات بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود ظریفہ کو اپنی بیٹیوں سے نسبتاً زیادہ پیار ہے اور وہ ان کی تعلیم کے لیے ہر وقت کوشاں رہتی ہے۔ اس کے مطابق افغانستان میں عورتوں کی پست حالت کی بنیادی وجہ وسائل کی عدم دستیابی اور بیرونی قوتوں کی یلغار ہے۔

ظریفہ قاضی زادہ نے ایک قدامت پسند معاشرے میں اپنی ہمت اور بھرپور صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایسی مثال قائم کر دی ہے جو آنے والے وقت میں افغان عورتوں کے لیے ترقی اور آگے بڑھنے کے کثیر مواقع فراہم کرے گی۔
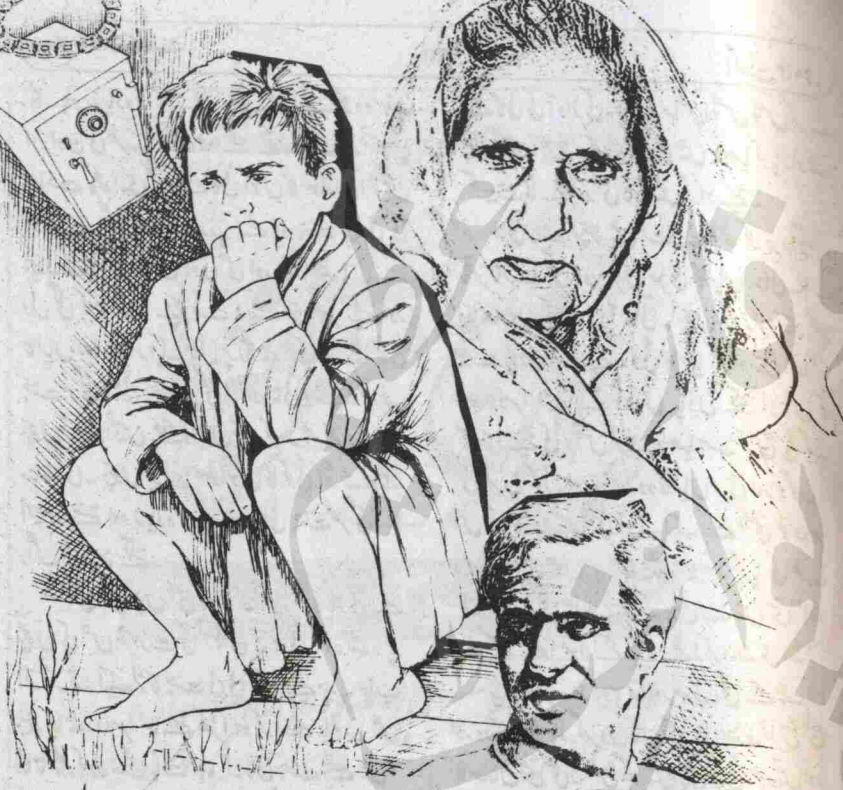
عبدالحمید نظامی

نانی جنت

باپ کے گھر بھی سکھ چین نصیب نہ ہوا اور شوہر ملا تو وہ ایسا کہ کھلائے پلائے کم اور مار پیٹ کرے زیادہ۔ ہاتھ تنگ نہیں تھا مگر دل تنگ تھا۔ پیسے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ پیٹ خالی رہے تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ جیب خالی نہیں ہونی چاہیے۔ بھلا ایسا آدمی بیچاری جنت کے کیا ارمان پورے کرتا۔

ایک عورت کی کتھا جو دوسروں کے لیے تفریح اور ہنسنے ہنسانے کا وسیلہ بن گئی تھی

جنت بی بی بچوں بچیوں کی ہی نانی نہیں تھی بلکہ پورے محلے کی نانی تھی۔ چٹی ڈاڑھیوں والے بوڑھے اور سفید جونڈے والی بوڑھیاں جو خود نانا نانی تھے وہ بھی اسے نانی جنت کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے مگر جو سلوک نانی جنت کے ساتھ ہوتا تھا وہ شاید کسی سوتیلی اور ڈائن صفت نانی کے ساتھ بھی روا نہ رکھا گیا ہوگا۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے نانی جنت کو زندہ ہی اس لیے رکھا تھا کہ لوگوں کے جذبۂ ہمدردی کی آزمائش ہوتی رہے۔

بڑھیا کا قد تین ساڑھے تین فٹ یا سوا گز ہو

گا۔ بال زیادہ تر جھڑ چکے تھے۔ جو باقی بچے وہ سفید اور اون کی طرح خشک ہو گئے تھے۔ رنگ اور جسم کی ساخت کچھ ایسی تھی جیسے کافی دنوں کا سوکھا ہوا بینگن ہوتا ہے۔ گزشتہ بیس برس سے وہ جنت بی بی کی بجائے نانی جنت بنی ہوئی تھی اور سارا محلّہ اس سے دل لگی کرتا تھا۔ بچے اسے دیکھتے ہی گھیر لیتے اور تالیاں بجا بجا کر ایک تال پر لگاتار کہے جاتے ''نانی جنت مر گئی! نانی جنت مر گئی!'' اور نانی جنت نہ صرف بچوں کو بلکہ انہیں جننے والوں تک کو منہ بھر بھر بے نقط سنا ڈالتی۔ بچوں پر ان صلواتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ اُلٹا وہ ہنستے اور زیادہ زور سے ''نانی جنت مر گئی'' کا راگ الاپنے لگتے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ محض فقرہ بازی سے بچوں کی حس شرارت کی تسکین نہ ہوتی۔ وہ تشدد پر اُتر آتے۔ ایک لڑکا جنت بی بی کے پیچھے چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ دوسرا سامنے کھڑا ہو کر اسے باتوں میں لگاتا پھر کوئی ایسی بات کہتا کہ نانی جنت غصے میں آ کر اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی۔ لڑکا فوراً بڑھیا کو دھکا دے دیتا۔ وہ پیچھے چھپے ہوئے لڑکے پر گرتی اور دو تین قلابازیاں کھاتی ہوئی دُور جا پڑتی۔ اب کئی لڑکے اس پر ٹوٹ پڑتے اور چاروں ہاتھ پاؤں پکڑ کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے گھسیٹتے پھرتے۔ ساتھ ساتھ ''نانی جنت مر گئی'' بھی کہتے جاتے۔ بڑھیا کبھی ماہی بے آب کی طرح تلملاتی اور تڑپتی، کبھی مرغ بسمل کی مانند پھڑپھڑاتی، ہاتھ پاؤں چلاتی اور گالیاں بھی دیئے جاتی مگر بچوں کو ایسا مزہ آ رہا ہوتا جیسے وہ یہ مشق ستم گوشت پوست کی جان دار بڑھیا پر نہ آزما رہے ہوں بلکہ ان کے سامنے کوئی بڑا سا کھلونا ہو جس سے وہ اپنا دل بہلا رہے ہوں۔ نانی جنت مچلتے مچلتے اور کوستے کوستے ہلکان ہو جاتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ حلق خشک ہو کر منہ سے گالی کی آواز کی بجائے سانس پھس پھس کر کے نکلنے لگتا۔ آخر لڑکے اسی درگتی میں بڑھیا کو بازار تک گھسیٹ لاتے اور کسی نالی میں گرا دیتے۔

نانی جنت کیچڑ میں لت پت اُٹھ کر ہر راہگیر کو پتھر مارنے لگتی اور سڑی سڑی گالیاں سناتی۔ اب دکانداروں کی باری آ جاتی۔ بچوں کی رہی سہی کسر بڑے پوری کر دیتے۔ کوئی بڑھیا کو گود میں اٹھا لیتا اور دوسرا اس کے دونوں پاؤں پکڑ کر اس کو جھولا دینے کی کوشش کرتا۔ بڑھیا سمٹ کر سچ مچ گیند کی طرح گول ہو جاتی۔ وہ گالیاں دیتی اور لوگوں کو اس کی گالیوں پر ہنسی آتی۔ ایک سے چھٹتی تو دوسرا دبوچ کر کندھوں پر بٹھا لیتا۔ بڑھیا گڑیا کی طرح کندھوں پر ٹنگی تالیاں بجا کر بڑی لے میں کہتی ''اللہ کے بھیجے کلمے! مولا کے بھیجے کلمے! کرو اللہ ہی اللہ!''

یہ تماشا ہر روز ہوتا تھا اور صرف گلی محلے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ گھروں میں بھی نانی جنت تفریح طبع کا سامان بنتی تھی۔ جس گھر میں چلی جاتی، عورتیں اور لڑکیاں اسے اپنے جھرمٹ میں لے لیتیں اور گھنٹوں اس کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ نانی جنت گالیاں کوسنے ضرور دیتی تھی مگر ہنس ہنس کر۔ اس کے پوپلے منہ میں ایک بھی دانت نہیں رہا تھا۔ ناک جھک گئی تھی اور ٹھوڑی اوپر اٹھ آئی تھی۔ اس لیے بات کرتے یا پان چباتے ہوئے منہ غائب ہو جاتا تھا البتہ ناک اور ٹھوڑی بار بار ایک دوسرے کو چھوتی دکھائی دیتی تھیں۔ لڑکیوں پر تو اس کی صورت دیکھ کر ہی ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اس قدرتی ہیئت کذائی کے باوجود لڑکیاں اس کی صورت پر مزید درد و کرب اور اذیت کے اثرات دیکھنے کے لیے بڑے زور سے اس کے بازو یا بغل میں نوچ لیتیں۔ کبھی کوئی سوئی چبھو دیتی اور پھر اس کی تلملاہٹ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ کوئی بڑی بوڑھی جھوٹ موٹ لڑکیوں کو ڈانٹتی اور

مصنوعی سنجیدگی اختیار کر کے نانی جنت کو اپنے پاس بٹھا لیتی پھر پوچھتی:

"نانی جنت ہمیں یہ بتاؤ کہ جب تم مرگئی تھیں تو پھر زندہ کیسے ہوئیں؟"

نانی جنت آلتی پالتی مار کر اطمینان سے بیٹھ جاتی اور ہزاروں بار کا سنایا ہوا واقعہ یوں سنانا شروع کرتی:

"اری بھنو! کیا سنو گی میری بپتا! کمبختی ماری کی مٹی خراب ہونا تھی جو دوبارہ جندہ ہوگئی۔ مرگئی تھی تو بس مرہی جاتی۔ اچھا تھا پاپ کٹ جاتا۔"

یہ کہتے ہوئے ہنس مکھ بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کے ننھے سے چہرے پر مکڑی کے جالے جیسے جھریوں کے نشانات اور زیادہ گہرے ہو جاتے جب وہ اپنی میلی پھٹی اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھتی تو ایسا لگتا جیسے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی جالا توڑ کر آزاد ہونے کی کشمکش کر رہی ہو مگر پان کا ٹکڑا منہ میں جاتے ہی اس کا موڈ بدل جاتا۔ آواز کا کراراپن لوٹ آتا اور وہ پہلے جیسی خوش مزاجی سے کہتی "اری یہ تب کی بات ہے جب ابھی مار کاٹ نہیں ہوئی تھی۔ ماجد کے ابا بھی اللہ کو پیارے نہیں ہوئے تھے۔ ماجد تین چار سال کا تھا۔ ہم دلی کے پاس غازی آباد میں رہتے تھے۔ ہمارے ساتھ والے مکان میں کپڑے کا ایک پنجابی سوداگر اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ ان کے بچے کا نام بھی ماجد تھا۔ لے بہن اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ ماجد کی ماں بیمار پڑ گئی۔ ایسی بیمار پڑی کہ سر کے بال جھڑ گئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ بچنے کی کوئی آس نہ رہی۔ شام کے وقت میں اسے دیکھنے گئی۔ محلے کی کئی عورتیں جمع تھیں۔ ایک اسے سورۃ یاسین سنا رہی تھی۔ اس کا ماجد بلک بلک کر رو رہا تھا۔ میرا دل بہت خراب ہوا اور بہت ڈر لگا۔ میں گھر آ گئی۔ اپنے ماجد کو سینے سے لپٹا کر بستر پر پڑ گئی۔

"تو بہنا میری صبح کو جو آنکھ کھلی تو میں کفن میں لپٹی، جنازے کی چارپائی پر پڑی تھی۔ میت اٹھنے کو تیار تھی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مجھے ماجد اور ماجد کے ابا کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی صاف آواز سنائی دے رہی تھی۔ اب جو میں ہلی جلی تو فوراً کفن کھول دیا گیا۔ میں جندہ سلامت تھی۔ اسی وقت کفن میں سے نکال کر دوسرے کپڑے پہنائے گئے اور ماجد کی ماں جندہ ہوگئی۔ ماجد کی ماں جندہ ہوگئی کا شور مچ گیا۔"

بار بار کی سنی ہوئی اس کہانی کو سب حیرت اور دلچسپی سے سنتے اور پھر وہی سوال دہرایا جاتا۔

"نانی جنت حیرت ہے آخر تم زندہ کیسے ہوگئیں؟"

نانی جنت پان کے ٹکڑے کا مطالبہ کرتی۔ پان منہ میں رکھ کر بتاتی "بات یہ ہوئی کہ اللہ میاں نے ساتھ والی ماجد کی ماں کو بلایا تھا مگر فرشتے بھول...... میں مجھے اٹھا کر لے گئے۔ جب انہیں اپنی غلطی کا پتہ چلا تو وہ مجھے واپس چھوڑ گئے۔ بس میری جان واپس آنے کی دیر تھی کہ ہمسائے کے گھر سے رونے دھونے کی آواز آنے لگی۔ پتہ چلا کہ ماجد کی ماں مرگئی۔"

اب کوئی لڑکی کوئی اور سوال پوچھ لیتی اور نانی جنت پھر ایک داستان شروع کر لیتی۔ اس دوران میں کوئی لڑکی چپکے چپکے نانی جنت کی اوڑھنی کے پلو سے جوتی باندھ دیتی۔ جب نانی اٹھتی اور جوتی اس کی کمر میں لگتی۔ وہ وہی جوتی ہاتھ میں لے کر جو لڑکی سامنے ہوتی اسے مارنے کو لپکتی۔ لڑکیوں کو موقع ہاتھ آ جاتا اور دھینگا مشتی شروع ہو جاتی۔ کوئی لڑکی بھری ہوئی بالٹی لا کر بڑھیا کے سر پر انڈیل دیتی۔ نانی جنت پانی میں تربتر باہر بھاگتی اور وہ شکل ہو جاتی کہ کنوئیں سے نکلتی کھتی میں گری۔ رات گئے تک نانی جنت کی اسی طرح کمبختی آئی رہتی۔ پھر سب اپنے اپنے بستروں پر آرام و سکون کی گہری نیند میں گم ہو کر سہانے خواب دیکھنے لگتے اور نانی جنت پہروں اندھیرے میں کسی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی آسمان کو تکتی رہتی۔ کتے اس پر بھونکتے رہتے اور وہ بڑبڑاتی رہتی۔ "اللہ کے بھیجے کلے! مولا کے بھیجے کلے! کرو اللہ ہی اللہ۔"

خواہ شدت کی گرمی اور چلچلاتی دھوپیں ہوں چاہے کڑاکے کی سردی ہو یا موسلادھار بارش ہو، نانی جنت یونہی خشک پتے کی طرح آوارہ پھرتی۔ پھر جب اس کے لیے کھڈا بنا دیا گیا تو وہ رات کو اس میں پڑی رہتی۔ ایک بار سردیوں کے موسم میں وہ اپنے کھڈے میں گھسی تو وہاں ایک کتیا قبضہ جما چکی تھی۔ اس نے نانی جنت کو جھنجھوڑ لیا۔ اس کی پنڈلی زخمی کر دی۔ اس ساری رات وہ درد و کرب سے کراہتی رہی۔ نانی جنت پر ہنسنے والے تو بہت تھے مگر اس پر ترس کھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے زخموں کی بہار سے لطف اندوز سب ہوتے تھے مگر ان پر پھاہا رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی حالت دیوانگی پر کسی کو اتنا ملال بھی نہیں ہوتا تھا جتنا مٹی کی رکابی ٹوٹ جانے پر ہوتا ہے۔

نانی جنت کا نام تو جنت تھا مگر زندگی دوزخ سے بھی زیادہ عذاب ناک گزری تھی۔ جو خود سدا روتی اور دکھ اٹھاتی رہی اب دوسروں کے لیے تفریح اور ہنسنے ہنسانے کا وسیلہ بن گئی تھی۔ جیسے جوہڑ سوکھ جائے تو مسلسل دھوپ سے زمین چٹخ کر جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے اور دیکھنے والے کے لیے ایک خوبصورت منظر پیش کرتی ہے اسی طرح جنت کی گزشتہ زندگی جوہڑ کی مانند تھی جس میں دکھوں کی سڑاند کے سوا کچھ نہ تھا اور پیہم حادثات و واقعات نے جب اس کا شعور چھین لیا تو وہ دوسروں کے لیے ہنسی ٹھٹھوں کا ذریعہ بن گئی۔

جنت کا باپ پانچ روپے مہینے پر کچہری میں چپراسی ملازم تھا۔ انگریزوں کا زمانہ اور سستا سماں تھا مگر پھر بھی دو میاں بیوی اور تین بچیوں کے کنبے کا گزارا مشکل تھا۔ لڑکیاں گنے کی پور کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ جنت تینوں میں بڑی تھی۔ باپ نے گھبرا کر تیرہ ہی برس میں ہاتھ پیلے کر دیئے اور کچہری کے منشی ساجد حسین کے پلے باندھ دی۔ یہ منشی بڑا کنجوس تھا۔ دو بیویاں اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر قید ہستی سے نجات پا چکی تھیں۔ کچھ ایسا شکنجے میں کستا تھا کہ گھر والی مر کر ہی گھر سے نکلتی۔ جنت کی جوانی بھی اسی طرح غارت ہوئی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ماجد پیدا ہوا تو تیس برس کی ادھیڑ عورت لگنے لگی۔ باپ کے گھر بھی سکھ چین نصیب نہ ہوا اور شوہر ملا تو وہ ایسا کہ کھلائے پلائے کم اور مار پیٹ کرے زیادہ۔ ہاتھ تنگ نہیں تھا مگر دل تنگ تھا۔ پیسے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ پیٹ خالی رہے تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ جیب خالی نہیں ہونی چاہیے۔ بھلا ایسا آدمی بیچاری جنت کے کیا ارمان پورے کرتا۔ اور جنت کے دل میں تو ارمان پنپنے ہی نہیں پائے تھے۔ ارمانوں کی عمر تیرہ سے اٹھارہ برس ہوتی ہے۔ وہ یہ اس غریب نے منشی کی اردلی میں لات گھونسے کھاتے بسر کیے تھے۔

اسی زمانے میں "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بن کے رہے گا پاکستان!" کے نعرے لگنے لگے۔ منشی ساجد کٹر مسلم لیگی تھا۔ وہ کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگا۔ ایک دن مہاسبھائیوں اور مسلم لیگیوں میں بلوہ ہو گیا۔ دس بارہ آدمی مارے گئے۔ انہی میں سے ایک منشی بھی تھا۔ جنت نے خاوند کو کھو کر آزادی پائی۔ گھر کے اثاثے کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ دو ڈھائی

سیٹی

ایک شادی شدہ جوڑا ایک پارک میں بنچ پر بیٹھا شام کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان سے کچھ دور ایک بنچ پر (جو ایک جھاڑی میں کسی حد تک چھپا ہوا تھا) ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی راز و نیاز میں مصروف تھے۔ ان کو دیکھ کر بیوی نے اپنے شوہر سے کہا ''ان کو کچھ خبر نہیں کہ کوئی انہیں دیکھ اور سن رہا ہے۔ میرا خیال ہے وہ لڑکا اب شادی کی تجویز لڑکی کے سامنے پیش کرنے ہی والا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے تم سیٹی بجا کر اس کو ہوشیار نہیں کرو گے؟''

''میں کیوں سیٹی بجاؤں؟'' شوہر نے جواب دیا ''جب میں نے تمہارے سامنے شادی کی تجویز پیش کی تھی تو کسی نے بھی سیٹی نہیں بجائی تھی۔''

☆☆☆

ہزار روپیہ صندوق میں موجود ہے۔ شوہر کی آنکھ بند ہوتے ہی گھر کے دروازے کھل گئے اور روشنی پھیل گئی۔ جنت نے اپنے اور ماجد کے پھٹے پرانے کپڑے اُتار پھینکے۔ نئے جوڑے بنائے اور نئی زندگی کا آغاز کیا۔ جنت کو خوشحال دیکھا تو ماں باپ نے پیار جتایا مگر جنت نے سب رشتے توڑ لیے۔ اب وہ اپنے گھر کی آپ مالک تھی۔ اس کے سہارے کے لیے اس کا ماجد کافی تھا۔

دو چار سال بعد برصغیر کی تقسیم ہو گئی اور سب رشتہ داروں کی سخت مخالفت کے باوجود جنت ماجد کو لے کر پاکستان چلی آئی۔ اس نے سوچا پاکستان کی خاطر اس کے شوہر نے اپنی جان قربان کی تھی اس لیے وہ پاکستان ہی میں رہے گی۔ وہ کھوکھرا پار کے راستے پہلے کراچی پہنچی۔ کچھ عرصہ وہاں رہی پھر لاہور چلی آئی اور فیض باغ کے علاقے میں حاجی اسلام دین کے احاطے میں ایک کوارٹر کرایہ پر لے کر رہنے لگی۔ یہیں ماجد جوان ہوا اور جنت کی اجاڑ زندگی میں پہلی بار بہار کے آثار دکھائی دیئے۔ اس کے دل کی ویرانی اور مایوسی کے اندھیرے میں امیدوں، آرزوؤں کی لہریں آہستہ آہستہ ایسے اٹھنے لگیں جیسے مدت کے خشک کنوئیں میں پانی کا سوتا پھوٹ آیا ہو۔

پاکستان آ کر وہ صرف ایک بار ماجد کے ہمراہ اس وقت ہندوستان غازی آباد گئی جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہنیں فردوس اور ارم بہت اچھے گھروں میں بیاہی گئی تھیں اور عیش کر رہی تھیں۔ دونوں کے کئی کئی بچے تھے۔ انہیں سکھ چین سے رہتے سہتے دیکھ کر ایک بار تو جنت کو ملال سا ہوا کہ وہ خوامخواہ پاکستان چلی گئی۔ باقی رشتہ داروں کی طرح یہیں رہتی مگر پھر فوراً ہی اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے شوہر کی صورت آ گئی جو کہا کرتا تھا ''پاکستان اسلامی ملک ہو گا جہاں عرب کی طرح اسلامی نظام ہو گا۔ مسلمان اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ دنیا ہی میں جنت مل جائے گی۔'' اور اسی مقصد کی خاطر اس نے جان دی تھی۔ پھر بھلا وہ پاکستان کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ چنانچہ دس پندرہ دن بعد ہی واپس آ گئی تھی۔ اب اسے ماجد کی شادی کی فکر تھی۔ دو سے تین ہوں گے، پھر چار ہو جائیں گے۔ انہی سرور آمیز اور خوش کن تصورات میں مگن وہ شادی کے انتظامات کر رہی تھی۔ کبھی کوئی زیور بنوا لیتی کبھی ایک دو جوڑے کپڑے خرید کر صندوق میں ڈال دیتی۔ تھوڑی بہت رقم بھی پس انداز ہو گئی تو اس نے ایک غریب گھرانہ دیکھ کر ماجد کا رشتہ بھی طے کر دیا۔ اس کا ماجد دولہا بنے گا۔ سہرے کے پھول کھلیں گے۔ اس کا سب سے بڑا ارمان پورا ہو

جائے گا۔ دلہن آئے گی۔ سونے گھر میں چاندنی پھیل جائے گی۔ اس کا یہ ارمان کہ ایک بیٹی بھی ہوتی، پورا ہو گا۔ دلہن کی گود ہری ہو گی۔ جنت کا گھر واقعی جنت بن جائے گا۔

وہ سوتے جاگتے یہی سہانے خواب دیکھ رہی تھی کہ جیسے اچانک آسمانی بجلی گری اور اس کی جنت کو بھسم کر کے دوزخ بنا گئی۔ انہی دنوں ختم نبوت کی تحریک چلی۔ جلسے جلوس ہونے لگے۔ ماجد بھی اپنے باپ کی طرح بہت جوشیلا اور سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ جنت کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا ورنہ وہ اسے یقیناً روک لیتی۔ اسے تو اس دن معلوم ہوا جب اس کی زندگی میں بہار آتے آتے واپس لوٹ گئی۔ جب دل کے ویران کنوئیں کا پھوٹتا ہوا سوتا پھر سے خشک ہو گیا۔ جب ماجد کی شمع حیات نے گل ہو کر اس کی بقیہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے تاریک بنا دیا۔ اپنے کڑیل، گبرو جوان بیٹے کی لاش دیکھتے ہی اس کی آرزوئیں اور امنگیں بدنصیبی کے سیاہ کفن میں لپٹ گئیں۔ دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کے سامنے تحریک ختم نبوت کے حامی مظاہرہ کر رہے تھے۔ ماجد آگے تھا۔ اس کے سینے میں گولی لگی اور وہ وہیں تڑپ کر ڈھیر ہو گیا۔

جنت کو ہوش آیا تو وہ اپنی زندگی کے نہ جانے کتنے سال بتا چکی تھی کیونکہ اب وہ ایک نحیف ونزار بڑھیا لگتی تھی۔ کمر جھکی ہوئی، آنکھیں دھندلی دھندلی، چہرے پر جھریوں کا جال۔ جنت کے ہمدردوں اور غم گساروں نے تاک تاک کر گھر کا سامان اُڑانا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں جھاڑو پھر گئی۔ اس کے دل کی طرح گھر بھی خالی ہو گیا۔ پھر حاجی اسلام دین نے کرایہ وصول نہ ہونے کی صورت میں اسے کوارٹر سے نکال کر تالا لگا دیا۔

جوان بیٹے کی موت نے اسے ہر صدمے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب وہ گلیوں میں گاتی پھرتی ”اللہ کے بھیجے کلے! مولا کے بھیجے کلے! کرو اللہ ہی اللہ!“ جہاں ٹھکانہ ملتا پڑی رہتی، جو بٹھا کر کھلا دیتا کھا لیتی، جو پہنا دیتا پہن لیتی۔ کسی نے کوارٹروں کی دیوار کے ساتھ اینٹیں جوڑ کر اور ٹین کی چھت ڈال کر اس کے لیٹنے کی جگہ بنا دی تھی۔ وہ اس حال میں بھی لوگوں کے کام آ رہی تھی۔ اس کی بدولت محلے والوں کو ہنسنے ہنسانے کا موقع ملتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اور جب بچے اسے چھیڑتے ”نانی جنت مر گئی“ تو وہ انہیں گالیاں اور کوسنے دیتی۔

جنت کے کانوں میں سونے کی دو تار جیسی پتلی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ صرف یہی اس کے ماجد کی نشانی اس کے پاس رہ گئی تھی۔ ماجد نے اپنی پہلی تنخواہ میں سے اسے یہ بالیاں بنوا کر دی تھیں۔ پھر سب کچھ لٹ گیا مگر یہ بالیاں اس کے کانوں میں پڑی رہ گئیں۔ جوان لڑکیاں نانی جنت کو چھیڑ کر کہتیں ”نانی جنت! یہ بالیاں تمہارے نہیں سجتیں ہمیں دے دو!“ وہ دونوں ہاتھ کانوں تک لے جا کر بالیاں پکڑ لیتی اور کہتی ”نگوڑی مار یو جب میں مروں تو تم ہی اُتار لینا۔ یہ میرے ماجد کی نشانی ہیں جیتے جی تو میں کسی کو دینے سے رہی۔“

اور ایک دن بچوں کی زبانی یہ خبر سارے محلے میں گشت کر گئی کہ نانی جنت کھڈے میں مری پڑی ہے۔ لوگوں نے اسے باہر نکال کر دیکھا۔ اس کے کانوں کی دونوں لویں کٹی ہوئی تھیں۔ کسی ظالم نے ان بالیوں کی خاطر سوتے میں اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ بڑھیا کا رونے والا کون بیٹھا تھا مگر سارا محلہ رو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کا کھلونا ٹوٹ گیا تھا۔

ماہِ رمضان کی غذائیں

حکیم راحت نسیم سوہدروی

روزہ کے روحانی اور جسمانی فوائد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزہ کو اس کی روح کے مطابق رکھا جائے اور ایسی غذا کھانی چاہیے جس کے اجزاء متوازن ہوں مگر ہمارے ہاں لوگ روزہ کے طبی فوائد اس لیے حاصل نہیں کر پاتے کہ وہ بسیار خوری کر کے روزہ کی روح کو مجروح کرتے ہیں۔

روزہ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قرآن مجید نے روزہ کا مقصد تقویٰ بیان کیا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کا ہر عمل انسان کی فلاح کے لیے ہے۔ روزہ کا دینی پہلو اپنی جگہ مسلمہ مگر فطری دین ہونے کے ناطے اس کے طبی فوائد بھی ہیں۔ روزہ فاقہ نہیں ہے بلکہ صبح سے شام تک غذا میں وقفہ ہے۔ اس طرح کھانے پینے اور دیگر نفسانی خواہشات کا جو وقفہ آتا ہے وہ جسم اور روح کو پاک صاف کرتا ہے۔ جسم سے فاسد فضلات خارج ہوتے ہیں، خرص اور مرض سے مقابلے کی قوت مضبوط ہوتی ہے۔ نفس اور جسم کی تربیت اور نظم وضبط کی عادت پختہ ہوتی ہے۔

روزہ کے روحانی اور جسمانی فوائد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزہ کو اس کی روح کے مطابق رکھا جائے اور ایسی غذا کھانی چاہیے جس کے اجزاء متوازن ہوں مگر ہمارے ہاں لوگ روزہ کے طبی فوائد اس لیے حاصل نہیں کر پاتے کہ وہ بسیار خوری کر کے روزہ کی روح کو مجروح کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ روزہ دار بسیار خوری کرتے ہیں اور زود ہضم غذا کی بجائے مرغن ثقیل غذاؤں کا استعمال بڑھا دیتے ہیں۔ گھروں میں کھانے کا بجٹ دوگنا ہو جاتا ہے۔ افطاری دعوتوں میں سموسے، پکوڑے، کچوریاں بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔ گھروں میں انواع و اقسام کے کھانے تیار ہوتے ہیں۔ اس طرح بعد میں خوب پانی پیا جاتا ہے جس سے معدہ بوجھل ہو جاتا ہے اور ضرورت سے زیادہ غذا کو جلانے کے لیے اور جسم سے خارج کرنے والے اعضاء کو زیادہ توانائی استعمال کرنا پڑتی ہے۔ یوں انسان کی کارکردگی میں فرق آتا ہے۔ اس طرح چند روز میں بھوک کم ہو جاتی ہے اور نقاہت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اگر ہم روزہ میں سادہ غذا استعمال کریں تو نہ صرف غذا کا مقصد پورا ہوگا بلکہ اعضائے جسم کو آرام کا موقع ملے گا اور ان کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

رمضان المبارک کے دوران غذائی عادات بدل جاتی ہیں۔ ان میں خون کے روغنی مادوں میں ہونے والی تبدیلیاں قابل ذکر ہیں۔ خاص طور پر مفید قلب چکنائی ایچ ڈی ایل کی سطح میں تبدیلی بڑی اہم ہوتی ہے کیونکہ اس سے قلب اور شریانوں کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

روزہ بہت سی بیماریوں کا قدرتی علاج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مثلاً موٹاپا ایک فکر والی بیماری ہے جس کے ساتھ کئی اور بیماریاں وابستہ ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں بے شمار ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا کام زیادہ تر بیٹھنا یا آرام کرنا ہے یا ہمارے بہت ہی اچھے گھرانے کی بہنیں جن کا کام اچھی خوراک کھانا اور ٹی وی دیکھنا ہے ان کا وزن بڑھنا معمولی بات ہے بلکہ کچھ افراد ایسے بھی ہیں جن کو زیادہ کھانے کا نشہ ہے اور وہ ایک دوسرے سے مقابلے کر کے کھاتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے جسم کا وزن زیادہ ہو جاتا ہے۔ کمزور جسم والے کا وزن بڑھ جاتا ہے جبکہ اچھے جسم والے کا وزن مزید بڑھ جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو موٹا ہونے کا یوں بھی خیال ہوتا ہے کہ ان کی عزت، شہرت اور وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے اور وہ اپنے جذبات کو کسی بھی طرح زیادہ کھانے سے نہیں روک سکتے جس کے نتیجے میں معاشرے میں جوڑوں کا درد، شوگر، دل کے امراض کا ہونا معمولی بات ہے۔ ایسے لوگوں کی ورزش بھی کم ہوتی ہے جس سے موٹاپا مزید بڑھتا ہے۔

موٹاپا اسی وقت روکا جا سکتا ہے جب معاشرہ ذہنی و سماجی طور پر تیار ہو جائے۔ ان کی زندگی کے طریقوں میں تبدیلی آئے۔ خوراک کم کی جائے تو بے شمار بیماریاں خود بخود کم ہو سکتی ہیں۔ روزہ ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے موٹاپے میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ بجائے دن میں کئی بار کھانے کے روزے میں خوراک کی مقدار سے کم ہو جاتی ہے اور جسم کی فالتو چربی پگھلنا شروع ہو جاتی ہے اس طرح جسم کے اندر چربی کی کمی ہو جاتی ہے جس سے وزن کم ہو جاتا ہے اور بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ روزہ کے اندر حرکت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یعنی صبح اُٹھنا، نماز پڑھنا، دن کو کام کرنا، رات کو باجماعت تراویح پڑھنا جس سے لامحالہ وزن میں کمی ہو جاتی ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ طبی نقطہ نظر سے وزن کم کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ جو کہ کئی سال سے رائج ہے جسے ڈائیٹنگ کہتے ہیں یعنی بھوک سے علاج یا وزن کی کمی کرنے میں، ایک انسان کو

صرف دو کوارٹر پانی دیا جاتا ہے اور ساتھ کچھ حیاتین جس سے کمزوری کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے جسم میں کئی تبدیلیاں آتی ہیں اور خطرات بھی بڑھ جاتے ہیں اور جسم دبلا پتلا ہوتا ہے مگر روزے کی حالت میں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ انسان کی خوراک میں زیادہ حرارے نہیں آتے۔ وزن نہیں بڑھ پاتا۔ یہ ایک محفوظ طریقہ ہے جو قدرت نے مسلمانوں کے لیے تجویز فرمایا۔

عمل ہاضمہ میں جسم کے بے شمار حصے کام کرتے ہیں مثلاً منہ کے لعاب، معدہ کی تیزابیت اور آنتوں کے ساتھ لبلبے کی رطوبت، انسان بغیر روزے کے ہوتا ہے تو دن بھر کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ہے جس سے لعاب دہن، غدود، رطوبتیں زیادہ نکلتے ہیں مثلاً ٹاکسن، معدہ میں جاتی ہے تو اس کی تیزابی کثافتیں خوراک پر عمل کرتی ہیں اور پھر یہ خوراک آنتوں میں جاتی ہے تو لبلبے کی رطوبت اس پر عمل کرتی ہے اور عام کھانے پینے سے ان اجزاء کا عمل کمزور پڑ جاتا ہے جسم میں بے شمار ردوبدل ہو جاتا ہے لیکن روزہ کی حالت میں ان کو کام کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح جگر کو بھی آرام ملتا ہے اور اس کی رطوبتیں بھی زیادہ نہیں پیدا ہوتیں جس سے ان تمام اعضاء کو آرام مل جاتا ہے اور وہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر لوگوں کو بدہضمی ہو جاتی ہے، پاخانہ وقت پر نہیں کر سکتے جس سے سر میں درد، تھکان، کمر میں درد، اور کمزوری ہوتی ہے لیکن روزہ رکھنے سے ان رطوبتوں اور معدے کو آرام ملتا ہے اور فضلہ کی نالیوں کو بھی کثرت سے کام کرنے سے نجات مل جاتی ہے۔

صحت کے لیے آرام بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے رات آرام کے لیے رکھی اور دن کام کے لیے تاکہ جسم کے اندرونی اور بیرونی حصوں کو آرام میسر آ سکے۔ جب نیند پوری نہ ہو تو انسان تازہ دم نہیں ہوتا اور ذہن پوری طرح کام نہیں کر پاتا۔ اس طرح اگر جسم کے اندرونی حصوں کو آرام نہ پہنچایا جائے، ان کا خیال نہ رکھا جائے تو لامحالہ اندرونی حصوں کو بیماری کا شکار ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

گردے کا کام چھلنی کا سا ہے۔ جو مائع ہم پیتے ہیں، گردے کے مختلف حصوں سے باہر نکل جاتا ہے اور گردے کی پیچیدہ اور باریک ساختیں اس کام کو کرنے میں متعین رہتی ہیں۔ روزے سے پیشاب کی دیگر نالیوں کو کم کام کرنا پڑتا ہے اور ان کو آرام مل جاتا ہے۔ مثلاً جب آپ زیادہ کھاتے ہیں اور ہر چیز کھاتے ہیں جس سے گردے کو چھلنی کا کام زیادہ کرنا پڑتا ہے اور جو چیزیں باہر نکلتی ہیں اور اس سے جسم کے مختلف حصے حرکت میں آ جاتے ہیں مثلاً زیادہ پیشاب آ جانا اور بلڈ پریشر کم ہو جاتا ہے مگر روزہ رکھنے سے ایک ایسا توازن قائم ہوتا ہے جس سے گردے کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے اور یہ سارا فعل روزے کی بدولت ہوتا ہے۔ اس طرح زیادہ چبانے سے (ایسے لوگ جو دن کو زیادہ کھاتے ہیں) دانتوں میں خوراک کے ذرے رہ جاتے ہیں اور لوگ صفائی نہیں کرتے مگر روزے کی صورت میں صرف سحری اور افطاری کا کھانا ہوتا ہے اور کھانے کے بعد انسان پوری طرح دانتوں کی حفاظت کر سکتا ہے لہٰذا آپ روزے کی بدولت اپنے جسم کو موٹاپے اور دیگر بیماریوں سے نجات دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ روزہ اس طرح رکھیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے رکھا، جس طرح اللہ نے چاہا کیونکہ روزہ رکھنا جسم اور صحت کے لیے بھی اچھا ہے۔

روزوں کی وجہ سے وزن اور خون میں کولیسٹرول کی کمی بیشی کا کھوج لگایا جا چکا ہے۔ رمضان المبارک کے دوران نباتاتی تیل کے استعمال کے فوائد و اثرات بھی ثابت ہو چکے ہیں۔

خاص طور پر سن فلاور یعنی سورج مکھی کے تیل کے استعمال سے خون میں ایچ ڈی ایل کی سطح میں مفید اضافہ ریکارڈ ہو چکا ہے اسی طرح زیتون کے تیل کے استعمال سے خون میں کولیسٹرول میں کمی بھی ثابت ہو چکی ہے۔ روزوں کے دوران ایچ ڈی ایل کی سطح بڑھ جاتی ہے اور یہ بات آپ کے علم میں ہے ایل ڈی ایچ مضر قلب اور ایچ ڈی ایل مفید قلب چکنائی ہوتی ہے۔ ان کی توثیق مزید کے لیے پشاور یونیورسٹی کے بائیوکیمسٹری میں دس مردوں اور دس رضا کار خواتین کے خون کے نمونوں کا رمضان المبارک کی ابتداء اور آخر میں مطالعہ کیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ ان طبی رضا کاروں کے خون میں رمضان المبارک کے وسط میں ایچ ڈی ایل کولیسٹرول اور ایل ڈی ایل کولیسٹرول کی سطح میں معمولی اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ ان نمونوں کا مطالعہ بڑا دلچسپ رہا۔

رمضان کے آغاز اور اختتام پر تمام رضا کاروں میں سے 65 سے 90 فیصد خون میں کولیسٹرول کی سطحیں معمول کے مطابق پائی گئیں جبکہ ان میں سے 5 سے 20 فیصد میں یہ روغنی مادے خطرے کی سطح کے قریب پائے گئے تاہم رمضان کے وسط میں ان مادوں کی سطح میں کمی بیشی دیکھی گئی۔ کولیسٹرول اور ٹرائی گلیسرائڈ کی نارمل سطح والوں میں ایچ ڈی ایل اور ایل ڈی ایل میں 10 فیصد سے 45 فیصد اضافہ پایا گیا جبکہ رمضان کی ابتداء اور اختتام پر 25 سے 70 فیصد میں کولیسٹرول ایک ہی سطح پر برقرار رہی لیکن خطرے کی سطح کے قریب والے رضا کاروں کے خون میں کولیسٹرول کی سطح رمضان کے اختتام کے وقت کم ہو گئی اور ان میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کا تناسب زیادہ رہا۔ پورے روزوں میں ٹرائی گلیسرائڈ کی سطح بھی کولیسٹرول کی طرح معمول کی سطح پر رہی لیکن خواتین کا تناسب اس سلسلے میں مردوں سے زیادہ رہا۔ اسی طرح ایچ ڈی ایل کے معاملے میں بھی خواتین کے خون میں اس کی نارمل سطح کا تناسب مردوں سے زیادہ تھا۔

ان تینوں چکنائیوں کی سطح میں کمی سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رمضان المبارک ہمیں غذائی بے اعتدالیوں پر قابو پانے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے اور اس میں روزوں کی وجہ سے چکنائیوں کے میٹابولزم کی شرح بھی بہت بہتر ہو جاتی ہے۔

مناسب ہو گا کہ اگر ثقیل تلی ہوئی اشیاء مثلاً سموسوں، پکوڑوں، کچوریوں، پراٹھوں اور چاولوں سے احتیاط کی جائے اور روزہ کھجور، دودھ، شہد اور زیتون سے افطار کر کے بعد میں نماز مغرب ادا کر کے معمول کی سادہ روٹی سالن کے ساتھ کھائی جائے تو رمضان المبارک میں ایک مسلمان اپنی روحانی اور جسمانی صلاحیتیں بڑھانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ رمضان المبارک میں بہترین غذائی اور شفائی خصوصیات کی حامل مندرجہ ذیل غذائیں ہیں۔

کھجور

کھجور رسول اللہ ﷺ کی محبوب غذا ہے۔ کھجور سے افطار کرنا سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ کھجور غذائیت خصوصاً حیاتین سے بھرپور پھل ہے اور جلد ہی جزو بدن بن جاتا ہے۔ اس طرح دن بھر کے وقفے سے جو حرارے خرچ ہوتے ہیں یہ ان کا نعم البدل بن جاتے ہیں اور جسم میں چستی و توانائی آ جاتی ہے۔ جدید طبی تحقیقات نے بھی کھجور کو ایک بہترین توانائی بخش پھل قرار دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ کھجور گلوکوز اور فرکٹوز کی شکل میں قدرتی شکر پیدا کرتی ہے جو فوراً جزو بدن بن جاتی ہے۔ ایک سو گرام کھجور میں 315 کیلوریز ہوتی ہیں جو ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لیے روز مرہ کی مناسب غذا ہے۔ کھجور مقوی اثرات رکھتی ہے۔ زود ہضم ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ گرم

ہے اور اس کا استعمال صرف موسم سرما میں ہی مناسب ہے مگر تحقیق نے یہ بات غلط ثابت کی ہے۔ توازن کے ساتھ سارا سال کھجور استعمال کی جا سکتی ہے۔ کھجور ضعف قلب، حیض، آنتوں کے امراض، جنسی قوت، بچوں کے امراض، جسم کو فربہ کرنے اور نشہ آور اشیاء کے لئے مفید ہے۔

شہد

شہد کے بارے میں ارشادِ ربانی اور فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ شہد میں شفا ہے اور موت کے علاوہ ہر مرض کا علاج ہے۔ جدید تحقیقات نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہد مختلف امراض میں مختلف طریقوں سے استعمال کرنے کے علاوہ صحت و توانائی کے لیے دنیا بھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ شہد نوزائیدہ بچے سے لے کر جاں بلب مریض تک کو دیا جاتا ہے۔ شہد کے ایک سو گرام میں 319 کیلوریز ہوتی ہیں جو ایک صحت مند جسم کے لیے روزانہ کی ضرورت کے لیے کافی ہیں۔ شہد استعمال کرنے والے طویل العمر، صحت مند اور خوبرو ہوتے ہیں۔ شہد یوں تو تقریباً تمام امراض میں استعمال ہوتا ہے مگر معدہ کے السر، نظام ہضم کی اصلاح، خون کی کمی، خون صاف کرنے، گلے کے امراض اور پھوڑے پھنسیوں کا بہترین علاج ہے۔ شہد کے فوائد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شہد خالص ہونا چاہیے۔ روزہ داروں کو چاہیے کہ دودھ میں شہد دو چمچ ملا کر روزہ افطار کر لیا کریں۔ پھر نماز مغرب کے بعد معمول کی سادہ غذا کھائیں۔

دہی

دہی کے استعمال کی وجہ سے پنجاب کے باشندے قوی الجثہ ہوتے تھے اور آج کل بھی دوسروں کی نسبت زیادہ توانا اور تندرست ہوتے ہیں۔ بلغاریہ میں عام طور پر لوگ زیادہ عمر پاتے ہیں۔ یہ لوگ دہی اور پالک زیادہ کھاتے ہیں۔ دودھ سے دہی بنانے کا رواج تین ہزار سال قبل مسیح قدیم مصریوں میں شروع ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فراعنہ مصر کے دستر خوان پر دہی ایک عمدہ غذا کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ پھر ایران، روس، عرب، بلقانی ریاستیں اور متحدہ ہندوستان میں صدیوں سے دہی غذا کا ایک اہم جزو تصور ہوتا آیا ہے۔ پھر جب دہی کی شکل میں خمیر اٹھا ہوا دودھ طبی نقطۂ نظر سے مفید اور زود ہضم اور زیادہ غذائیت کا حامل ثابت ہوا تو اس سے فائدہ اٹھانے سے کسی نے نہیں روکا۔ سب جانتے ہیں کہ دہی میں خمیر اٹھنے والے بیکٹیریا، دودھ میں بے حد تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ دہی اور چھاچ کی ترشی میں تیزابیت یعنی سائٹرک ایسڈ برابر مقدار میں موجود ہوتا ہے جو آنتوں کے مضر صحت جراثیم دور کر کے غذا کو ہضم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس میں تھوڑی مقدار میں الکوحل اور کاربونک ایسڈ گیس کی موجودگی اور غذائی نالی کے اعصاب میں تحریک پیدا کرتی ہے۔

چھاچ جب ہضم ہونے لگتی ہے تو اس کی حرارت جسم کی حرارت سے ملنے کے بعد بدن کی پرورش کرنے والے جراثیم پیدا کرتی ہے۔ یہ غیر مرئی جراثیم، غذائی نالی میں دو اقسام کی گیس بناتے ہیں۔ اس میں پہلی قسم کی گیس کے اثر سے معدہ غذا جذب کر کے اور زیادہ سرایت کرنے کی طاقت حاصل کرتا ہے۔

دودھ کی طرح دہی بھی جسم کی پرورش کرنے والے اجزاء سے بھرپور ایک مکمل غذا ہے۔ دودھ صدیوں سے ایک مکمل غذا تسلیم کیا جا رہا ہے۔ انسان کے بدن کے تمام ڈھانچے اور کل پرزے دودھ ہی سے تیار ہوتے ہیں۔ انسان اور مویشیوں کی غذا بھی گھاس پھوس، ساگ پات، پھل اور چارہ

وغیرہ کی شکل میں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں جب جسم کے اندر داخل ہوتی ہیں تو آلات ہضم ان کو بلو بلو کر سفید دودھ کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ دودھ حیوانات سے لے کر انسان تک کی غذا میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دودھ پر طرح طرح کے تجربے ہوئے اور ان تجربوں نے دودھ کو دہی کی شکل میں تبدیل کر کے انسانوں کے لیے اور زیادہ مفید بنا دیا ہے اور اس سے کریم اور مکھن تیار ہوتا ہے۔

دودھ

دودھ ایک مکمل غذا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دودھ تمام غذاؤں کا شہنشاہ ہے۔ جدید تحقیقات نے بھی دودھ کو ایک مکمل غذا قرار دیا ہے۔ ایک کلو دودھ اپنی غذائی افادیت کے لحاظ سے ایک کلو گوشت کے برابر ہے۔ دودھ ہر عمر کے لوگوں کے لیے یکساں مفید غذا ہے۔ اس سے دماغی قوت حاصل ہوتی ہے۔ بیماری کے بعد ہونے والی نقاہت دور ہوتی ہے۔ خون پیدا ہوتا ہے۔ دودھ سے ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ قبض کشا اور پیشاب آور ہے۔ عمر بڑھتی ہے۔ رنگت صاف ہوتی ہے اور زود ہضم ہے۔ دودھ صبح سحری کے وقت اور افطاری کے وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر افطار میں ہمراہ تین کھجوریں کھا لی جائیں تو مفید ہے۔ سوتے وقت دودھ کا پینا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس طرح ہضم نہیں ہوتا۔ سونے سے کم از کم دو گھنٹے قبل پیا جائے تا کہ ہضم ہو جائے۔ روزہ داروں کے لیے دودھ میں شہد ملا کر یا کھجوروں کا استعمال بہترین افطاری ہے۔

زیتون

زیتون کا شمار ان غذاؤں میں ہوتا ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اسے مثل نور قرار دیا گیا ہے۔ زیتون کے درخت کا شمار دنیا کے قدیم ترین پودوں میں ہوتا ہے۔ یہ معدہ اور نظام ہضم کے لیے مفید غذا ہے۔ جدید تحقیقات طب نے بھی اسکی تصدیق کی ہے۔ روزہ دار کے معدہ کی اصلاح کے لیے اس کا استعمال مفید ہے۔ زیتون بواسیر، جلدی امراض، سوزش، پھوڑے پھنسیاں، منہ کے چھالوں اور عرق النساء، پتے کی پتھری، دمہ، فلو، نزلہ، زکام میں مفید ہے۔ عرب ممالک میں اسے ایک اچھی خوراک، غذا کے علاوہ بالوں کی افزائش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ روزہ دار کے لیے سب سے اچھا بغیر ملاوٹ والا روغن زیتون اچھی غذا ہے۔ جاپان میں زیتون کے تیل کو آنتوں کے سرطان میں مفید قرار دیا گیا ہے۔ شرق وسط اور شمالی افریقہ کے باشندوں کا خیال ہے جو لوگ باقاعدگی سے زیتون کا تیل پیتے ہیں وہ کبھی پیٹ کے سرطان میں مبتلا نہیں ہوتے۔ معدے اور آنتوں میں زخم ہوں تو زیتون کا تیل خالی پیٹ دینے سے مندمل ہو جاتے ہیں۔ دن میں گیارہ بجے اور رات کو مریض کی حالت کے پیش نظر دس سے بیس گرام تک تیل روزانہ دینا چاہیے۔ اپنے فیملی ڈاکٹر یا معالج سے مشورہ کر کے تیل پیجئے اور اس اعتقاد کے ساتھ کہ اس میں ستر بیماریوں سے شفا ہے اور شافی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو لوگ باقاعدگی سے تیل پیتے ہیں ان کو سانس کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ سانس کی ہر بیماری میں زیتون کا تیل فائدہ دیتا ہے بلکہ یہ دورے کے دورانئے کو ختم کرتا ہے۔ دمے کے مریضوں کے لئے فائدہ مند ہے۔ دورے کے درمیان اُبلتے پانی میں شہد پینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ زیتون فلو اور زکام میں بطور اینٹی بائیوٹک دیا جاتا ہے۔ جو لوگ پابندی سے زیتون کا تیل پیتے ہیں ان کو فلو اور زکام نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی جائے تو معمولی ہوتا ہے۔ جو خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ تپ دق کے مریضوں کے لیے بھی یہ تیل بے حد مفید ہے۔

ریسٹورنٹ میں کھانے کے اصول

فاطمہ چودھری

ان خفیہ ''رازوں'' کو جان کر آپ کھانے کی لذت کے ساتھ اس کے صحت بخش ہونے کو بھی یقینی بنا سکیں گے!

ہمارے یہاں مہنگائی اور اشیاء کی قیمتوں میں گرانی نے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے، معاشی مجبوریاں اور مسائل بڑھتے جا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس میں کھانا کھانے کے رجحان میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہفتہ کے آخری دنوں میں ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کے مقامات پر لوگوں کا زبردست رش دیکھنے میں آتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ان جگہوں پر تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ بعض ریسٹورنٹس تو ایسے بھی ہیں جہاں پہلے سے جگہ مخصوص کروانے کے باوجود گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور پھر جا کر باری آتی ہے۔

ان ریسٹورنٹس میں جانے والے افراد میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو ریسٹورنٹ کے کاروبار اور اس کاروبار کے خفیہ ''رازوں'' سے واقف ہوتے اور انہیں اہمیت دیتے ہیں۔ دراصل کھانا کھاتے ہوئے ہمیں اس بات کا خیال ہی نہیں آتا کہ جو کھانا ہم کھا رہے ہیں وہ حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے یا نہیں۔ اسے کھانے سے ہمیں کوئی نقصان تو نہیں اُٹھانا پڑے گا؟...... اس وقت تو

ہمیں صرف بھوک مٹانے اور اہلخانہ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کھانے کا لطف اٹھانے کی فکر ہوتی ہے لیکن زیر نظر مضمون میں ہم ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس کے جو کاروباری راز آپ کو بتانے جارہے ہیں انہیں جان کر آپ ریسٹورنٹس میں کھانا کھانے کے علاوہ چند دوسری باتوں کا بھی خیال رکھیں گے۔ ان باتوں کا خیال رکھ کر آپ ریسٹورنٹس کے کھانے کی لذت کے ساتھ ساتھ اس کے صحت کے لیے مفید ہونے کو بھی یقینی بنا سکیں گے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ انتہائی خوفناک حقائق جن کا اعتراف ریسٹورنٹ انڈسٹری کے اہم افراد نے کیا ہے ریسٹورنٹس میں کھانا کھانے کا آپ کا طریقہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیں۔

رش کم ہونے کا وقت خطرناک ہوسکتا ہے

اگرچہ اہلخانہ کے ساتھ ریسٹورنٹس میں جاتے ہوئے ہم خیال کرتے ہیں کہ اس وقت جائیں جب رش نسبتاً کم ہو اور جگہ آسانی سے مل سکے لیکن یاد رکھیں ایسے ہی وقت آپ کے لیے خطرہ زیادہ ہے اور آپ کو ملنے والا کھانا مضر صحت ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس میں کھانے کے اجزاء کئی گھنٹے پہلے تیار کر کے رکھے جاتے ہیں جس کے باعث جراثیم کے حملہ آور ہونے اور بڑھنے کے امکانات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں لہٰذا ایسے وقت میں کھانا کھانا جب ریسٹورنٹ کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو فوڈ پوائزننگ کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے وقت میں ریسٹورنٹس کے کچن بھی کچھ اچھی حالت میں نہیں ہوتے۔ ساری رات کی سروس کے بعد کھانا تیار کرنے والے برتن اور مشینیں بُری حالت میں ہوتی ہیں اور آئل وغیرہ تو بالکل بھی فریش نہیں رہتے۔ اس وقت چونکہ وقت کم ہوتا ہے لہٰذا کھانا تیار کرنے والوں کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ زیادہ وقت لگائے بغیر کھانا تیار کریں لہٰذا وہ لوگ حفظان صحت کے اصولوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اس وقت ریسٹورنٹس کا کچن صاف کیے جانے کی حالت میں ہوتا ہے تو اکثر اوقات ایسی ڈشز میں کھانا سرو کیا جاتا ہے جو پہلے سے استعمال شدہ ڈشز کے ساتھ پڑی ہوتی ہیں اور اس سے ان ڈشز پر کیے جانے والے سپرے سلوشن کے اجزاء کا آپ کی ڈش پر پڑنا یقینی ہوتا ہے۔

حل

اگر آپ کو مجبوراً تاخیر سے ریسٹورنٹ میں جانا پڑ جائے تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ ایسی اشیاء کا آرڈر دیں جو گرلڈ یا بوائلڈ کی جاتی ہوں تاکہ جراثیم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ ایسے وقت میں سلاد یا اسی وقت پکائی جانے والی ڈشز کا آرڈر نہ دیں۔

مینیو کا مطالعہ کرتے ہوئے محتاط رہیں

ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس میں آنے والوں کو مہیا کیے جانے والے مینیوز کو بہت کم ہی مناسب طور پر صاف کیا جاتا ہے بلکہ ویٹر حضرات ان مینیوز کو ویسے ہی پکڑ کر رکھ لیتے ہیں اور پھر دوبارہ کسی دوسرے آنے والے کو تھما دیتے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے اور ریسٹورنٹس والے بھی جان بوجھ کر گہرے رنگ کے مینیوز تیار کرواتے ہیں تاکہ ان پر پڑنے والی مٹی اور گرد و غبار صاف نظر نہ آئے۔ ایک حالیہ ٹیسٹ کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ سات بڑے اور مشہور ریسٹورنٹس کے مینیوز کو چیک کیا گیا تو ساتوں میں خطرناک جراثیم پائے گئے جن میں چہرے کو نقصان پہنچانے والے جراثیم بھی شامل تھے۔

حل

مینیوز کو ہمیشہ بالائی کونوں سے پکڑیں نہ کہ نچلے کونوں سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ مینیو

کو نیچے کی طرف سے پکڑتے ہیں لہٰذا آپ دوسری طرف سے پکڑ کر جراثیم کے حملے سے خود کو کچھ حد تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

اونچی آواز میں میوزک زیادہ کھانے کا باعث بنتا ہے

آپ نے اکثر بڑے ریسٹورنٹس، ہوٹلوں اور دیگر کھانے پینے کے مقامات پر یہ بات نوٹ کی ہو گی کہ وہاں موسیقی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور خاص طور پر پرجوش اور اونچی آواز میں میوزک لگایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریسٹورنٹس والے بخوبی جانتے ہیں کہ اونچی آواز میں میوزک سے وہاں آنے والے لوگوں کو زیادہ کھانے پر اکسایا جا سکتا ہے۔ جتنی اونچی ٹیون بجے گی آپ خود میں اتنی انرجی محسوس کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جلدی جلدی (کم وقت میں) زیادہ کھائیں گے اور جلدی وہاں سے رخصت ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں ریسٹورنٹ کو زیادہ فائدہ ہو گا۔ اس میں آپ کے لیے نقصان دہ بات یہ ہے کہ چونکہ آپ بہت جلدی کھا رہے ہوتے ہیں لہٰذا آپ کو یہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا کہ آپ کا پیٹ بھر چکا ہے۔ اکثر اوقات اس کے نتیجہ میں زیادہ کھانا کھانا پڑتا ہے اور وہ بھی معمول سے کم وقت میں!

حل

تمام اشیاء ایک ساتھ نہ منگوائیں بلکہ ایک ڈش کھانے کے بعد دوسری منگوائیں۔ جب آپ اس تجربہ پر عمل کریں گے تو آپ آہستہ اور کم کھائیں گے۔

بچ جانیوالا کھانا ہمیشہ خود پیک کریں

ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانے کے بعد اگر کچھ کھانا بچ جائے اور آپ اسے پیک کروا کر ساتھ لے جانا چاہیں تو ہمیشہ کوشش کریں کہ ان اشیاء کو خود اکٹھا کریں اور پھر ایک بکس وغیرہ منگوا کر پیک کر لیں۔ یاد رکھیں جب آپ بچے ہوئے کھانے کو ویٹر کے ذریعے پیک کروانے کے لیے کہتے ہیں تو یہ کھانا کسی خاص پیک کرنے والے مقام پر نہیں جاتا بلکہ آپ کی ڈشز کو بھی دیگر صاف ہونے والی ڈشز اور کوڑا کرکٹ کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے اور پھر وہاں سے ویٹر انہیں پیک کر کے لے آتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں زمین پر گر جائیں اور پھر اُٹھا کر اسی طرح پیک کر دی جائیں۔ اس کے علاوہ آپ کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ آپ کا کھانا کس طرح بکس میں ڈالا جائے گا۔ ہوسکتا ہے یہ کام وہ شخص اپنے ہاتھوں سے کرے، جس نے چند سیکنڈ پہلے اپنے ہاتھوں سے میز صاف کی تھی۔

حل

ہمیشہ کھانا پیک کرنے کے لیے باکس اپنے پاس منگوائیں اور اپنی میز پر ہی اشیاء پیک کریں۔

مڈ نائٹ اور لیٹ آور ڈیلز

اکثر لوگ مہنگے ریسٹورنٹس کی مڈنائٹ اور لیٹ آور ڈیلز کو بہت پسند کرتے ہیں کہ ان کو کم پیسوں میں اپنی پسندیدہ ڈشز کھانے کو مل جاتی ہیں لیکن ان ڈیلز کے پس پردہ کاروباری "حربوں" کو فراموش اور نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ ڈشز دراصل معیاری اوقات میں بچ جانے والی اشیاء سے تیار کی جاتی ہیں جو انتہائی نقصان دہ اور خطرناک ہو سکتی ہیں۔ کچھ پیسوں کا فائدہ تو ان سے ہو سکتا ہے لیکن صحت کا بہت زیادہ نقصان بھی اُٹھانا پڑ سکتا ہے۔ پھر ان اوقات میں کھانا ویسے بھی ہاضمہ کے لیے نقصان دہ ہے۔

حل

اول تو ان اوقات میں کھانا کھانے جانے سے بچنا چاہیے لیکن اگر مجبوراً جانا پڑے تو ہمیشہ ایسی اشیاء منگوائیں جو گرلڈ یا اسی وقت تیار کی جائیں۔

ذرا سی بات

نواز خان

ذرا سی بات

نواز خان

میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ ریوالور فضول ثابت ہوتا مجھے اسے استعمال کرنا تھا مگر کہاں......؟

جرم وسزا پر مبنی انسپکٹر نواز کا ایک دلچسپ تجربہ

یہ ایک نہایت عجیب وغریب اور سنسنی خیز واردات تھی۔ ایک گھوڑا قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ گھوڑا کرم دین کے گھر آئے ہوئے ایک مہمان کا تھا، جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مہمان دراصل کرم دین کا بھانجا تھا۔ کرم دین گاؤں کا ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ کچھ اثر ورسوخ بھی رکھتا تھا۔ جب میں اس حیران کن واقعے کی تحقیق کے لیے اس کی حویلی پہنچا تو وہ دروازے سے باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے جوڑوں کا پرانا درد تھا۔ اس لیے خود تھانے نہیں آسکا تھا۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندر پہنچا۔ حویلی کا ایک حصہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ کرم دین کا بھانجا یوسف آج کل اسی حصے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک صحت مند نوجوان تھا۔ چہرہ گول اور بال گھونگھریالے تھے۔

میں نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگایا کہ وہ سخت خوفزدہ ہے۔ وہ جس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے سامنے ایک برآمدہ تھا چونکہ سردیوں کے دن تھے گھوڑا برآمدے کے ایک کونے میں بندھا تھا۔ رات کسی وقت کوئی شخص حویلی کے اس حصے میں داخل ہوا اور اس نے نہایت جنونی انداز میں گھوڑے کو ہلاک کر دیا۔ گھوڑے کو ہلاک کرنے کے لیے جو آلہ استعمال کیا گیا تھا وہ ٹوکا تھا۔ ٹوکے کا ایک بھرپور وار گھوڑے کی گردن پر کیا گیا تھا۔ یہ زخم کوئی پانچ انچ گہرا چلا گیا تھا۔ بعد میں شاید گھوڑا گر گیا تھا اور مجرم نے شہ رگ کی طرف سے اس کی گردن تین جگہ سے کاٹ دی تھی۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا بلکہ سخت وحشت کے عالم میں اس نے گھوڑے کے سر پر ٹوکے کے پے در پے وار کیے تھے اور پیٹ پھاڑ کر اس کی آنتیں باہر نکال دی تھیں۔ یقیناً یہ ایک وحشیانہ کارروائی تھی۔ سفید رنگ کا جوان گھوڑا برآمدے کے وسط میں بے حرکت پڑا تھا۔ اس کا خون ایک تالاب کی صورت میں جما ہوا تھا۔

گھوڑے کے مالک یوسف نے خوفزدہ لہجے میں بتایا کہ رات کے پچھلے پہر اسے پیشاب کی حاجت

ہوئی۔ وہ حویلی سے نکل کر قریبی کھیتوں میں چلا گیا۔ جب کوئی پون گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو گھوڑا مُردہ پڑا تھا۔ کمرے میں اس کی چارپائی بھی ٹوٹی ہوئی تھی...... چارپائی کے ذکر پر مجھے کمرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے آدھ کھلے دروازے سے کمرے میں جھانکا۔ اندر کا منظر یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ جنونی شخص درحقیقت یوسف کو قتل کرنے آیا تھا۔ یہ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کمرے میں موجود نہیں تھا اور قاتل کا غصہ اس بے زبان گھوڑے پر اُتر گیا۔ میں نے دیکھا، یوسف کی چارپائی دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ لحاف پھٹا ہوا تھا اور تکیے سے نکلنے والی روئی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا مجرم نے ہر شے پر اندھا دھند ٹوکا چلایا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر ذہن پر عجیب طرح کا خوف سوار ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی مجرم کسی کونے سے نکلے گا اور وحشیانہ انداز میں ٹوکا چلانا شروع کر دے گا۔

یوسف کی حالت بہت پتلی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے غور سے موقع کا جائزہ لے کر اس سے کہا ”تیرا کہنا ہے کہ جب مجرم گھر میں داخل ہوا تو تو کھیتوں میں تھا۔“

”ج...... جی ہاں۔“ یوسف ہکلایا۔

میں نے کہا ”دیکھ جو کچھ ہوا ہے، سچ سچ بتا۔ یہ نہ ہو تم لوگوں کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔“

”کیا مطلب جی؟“ یوسف کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”مطلب یہ کہ جب گھوڑے کو مارا گیا تو تو گھر میں ہی موجود تھا۔“

”میں...... میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔“

میں نے کرم دین سے کہا ”کرم دینا! تیرا بھانجا مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے اسے سمجھا کہ معاملہ خوانخواہ خراب نہ کرے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ واردات کے وقت کھیتوں میں ہو۔“

میرے پریقین لہجے نے یوسف کو پریشان کر دیا۔ وہ میری بات ماننا بھی نہیں چاہتا تھا اور جھٹلانے کی ہمت بھی اس میں نہیں تھی۔ میں نے کہا ”کرم دین! اس سے پوچھ کہ کھیتوں سے واپس آ کر یہ کمرے میں کیسے داخل ہوا تھا؟“

یوسف نے کہا ”جناب دروازے سے گزر کر اور کیسے؟“

میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دہلیز پر مُردہ گھوڑے کا خون پھیلا ہوا تھا۔ یہ خون اتنی جگہ میں تھا کہ اسے پھلانگ کر کمرے میں داخل نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ گھوڑا ہلاک ہونے کے بعد اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا تو اس کے پاؤں سے لگنے والا خون کمرے میں نشان چھوڑ جاتا مگر ایسا کوئی نشان کمرے میں نہیں تھا۔ ہاں ایسے نشان برآمدے میں پائے جاتے تھے اور یقیناً یہ یوسف کے قدموں کے تھے۔ جب وہ کمرے سے نکلا تھا تو خون اس کے جوتے سے لگ گیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، واردات کے بعد یوسف صرف ایک بار دروازے سے گزرا ہے اور وہ اس وقت جب وہ مجرم کے جانے کے بعد واردات کی اطلاع دینے حویلی کی طرف بھاگا ہے۔

میں نے یہ سب کچھ یوسف کو بتایا تو اس کے پاس تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ مان گیا کہ مجرم کے خوف سے وہ کمرے میں چھپ گیا تھا اور اس وقت تک چھپا رہا تھا جب تک وہ چلا نہیں گیا۔ جان بچانے کے لیے وہ ایک بڑے جستی صندوق میں گھس گیا تھا (اسے پیٹی کہا جاتا ہے)۔

میں نے کرم دین سے کہا ”کرم دین! اگر معاملے کی صحیح تفتیش چاہتے ہو تو اونگی بونگی مت مارو۔

جو بھی معاملہ ہے مجھے صاف صاف بتا دو۔‘‘

کرم دین مجھے اپنے ساتھ بیٹھک میں لے آیا۔ نوکر چاکر خدمت میں لگ گئے۔ کرم دین نے کہا ’’تھانیدار صاحب! یہ تیسری بار ہے کہ کسی نے میرے بھانجے کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رستم پور گاؤں کا رہنے والا ہے۔ تین دفعہ وہاں اس پر حملہ ہوا ہے۔ ایک بار تو قسمت اچھی تھی جو یہ بچ گیا۔ کسی نے اس کے کمرے میں بہت بڑا زہریلا ناگ چھوڑ دیا۔ ناگ ساری رات ایک دیگچے میں کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔ صبح جب اس نے دودھ دھونے کے لیے دیگچا اٹھایا تو ناگ نے کاٹنے کی کوشش کی۔ اس نے دیگچا پھینک کر اسے لاٹھیوں سے مار ڈالا۔ لڑکا بہادر ہے جی لیکن جب ہر وقت جان کا خطرہ لگا رہے تو بندے میں رہ کیا جاتا ہے۔ دیکھیں کیسا سفید لٹھے جیسا رنگ ہو رہا ہے اس کا۔ میں خود رستم پور جا کر اسے یہاں لے آیا تھا لیکن ویریوں (دشمنوں) نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔

میں نے پوچھا ’’حملہ آور کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے۔‘‘

کرم دین حقہ گڑگڑا کر بولا ’’تھانیدار صاحب! یوسف کا باپ کھاتا پیتا زمیندار ہے۔ پانچ چھ مربع جگہ ہے۔ زمین والوں کے چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں لیکن سمجھ نہیں آتی یوسف کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔‘‘

میں نے پوچھا ’’کوئی رشتے کا معاملہ، کوئی ذات برادری کا جھگڑا؟‘‘

کرم دین بولا ’’جی پرانی دشمنی تو کوئی نہیں ایک دو بکھیڑے ہیں۔ دو سال پہلے یوسف کا ایک چچا قتل ہوا تھا۔ وارثوں نے یوسف کے باپ پر بھی شبہ کیا تھا۔ پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔‘‘

میں نے کافی دیر یوسف اور اس کے ماموں سے گفتگو کی۔ میں نے کرم دین کو مشورہ دیا کہ وہ یوسف کو حویلی کے اندر رکھے اور ممکن ہو تو ایک آدھ بندہ اس کے پہرے پر لگا دے۔ کرم دین نے کہا ’’جناب! میں تو اپنے سارے ملازموں کو لاٹھیاں دے کر اس کے دروازے پر کھڑا کر دوں گا مگر بات تو تب ہی بنے گی جب وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔‘‘

اگلی رات کا واقعہ ہے۔ دس بجے کا وقت تھا۔ ایک ضروری کام کے سبب میں تھانے میں تھا۔ اندھیری رات تھی۔ گرج چمک کے ساتھ بوندا باندی جاری تھی۔ میں اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ دفعتاً کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور یوسف دہلیز پر نظر آیا۔ وہ خوف اور سردی سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ لگتا تھا موت کا فرشتہ اس کے تعاقب میں ہے۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

’’بیٹھ جا میاں۔‘‘ میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے خطرہ ہو گیا تھا کہ وہ گر ہی نہ پڑے۔ وہ جلدی سے بیٹھ گیا اور پھر اچانک...... اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ’’تھانیدار صاحب! میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تھانیدار صاحب! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔‘‘

اتنے لمبے تڑنگے آدمی کو بچوں کی طرح روتے دیکھنا عجیب تجربہ تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اسّی سالہ بوڑھے کے اندر بھی ایک بچہ موجود ہوتا ہے......

یوسف کی دھاڑیں سن کر دو سپاہی میرے کمرے میں جھانکنے لگے۔ میں نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد یوسف پُرسکون ہوا تو میں نے کہا۔

’’بھلے مانس! اب تجھے کیا ڈر ہے۔ کرم دین نے بتایا تھا کہ اس نے تجھ پر چار آدمیوں کا

پہرا بٹھا دیا ہے۔“

یوسف بولا ”تھانیدار صاحب! ان پہروں سے کچھ نہیں ہوگا۔ پہرا تو...... پہرا تو میرے باپ نے بھی بٹھایا تھا۔ وہ جو کوئی بھی ہے بڑا ہوشیار شخص ہے۔ مجھے تو اب ان پہریداروں سے بھی ڈر آتا ہے۔ کیا پتہ کوئی اس کے ساتھ ہی ملا ہوا ہو۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ نوجوان مسلسل ہراساں رہنے سے اب خوف کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں اپنا سایہ بھی ڈرا دیتا ہے۔

میں نے کہا ”یوسف! مجھے ایک بات پوری ایمانداری سے بتا۔ تیرا ماموں کہتا ہے کہ ایک سے زیادہ آدمی تیرے پیچھے ہیں جبکہ تیرا کہنا ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ سچ بات کیا ہے؟“

یوسف بولا ”سچ بات تو یہ ہے کہ جناب مجھے بھی کچھ پتہ نہیں۔ اس سے پہلے رستم پور میں جب حملہ ہوا تھا تو اس وقت بھی ایک شخص نے ٹوکا چلایا تھا۔ وہ میرے راستے میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ میں گزرنے لگا تو ایک دم کماد کے کھیت سے نکلا اور سامنے آگیا۔ اس نے چہرہ پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔ پورے زور سے ٹوکا گھما کر اس نے مجھے مارنا چاہا۔ میں پیچھے ہٹا تو ٹوکا میرے کندھے پر لگا۔ میں مڑ کر واپس بھاگا۔ اس نے پیچھا کیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ سامنے سے تین چار گھڑ سوار آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ واپس کماد میں گھس گیا۔“

میں نے کہا ”یوسف میاں! ذہن پر زور ڈالو اور ایسے لوگوں کے نام لکھواؤ جن پر تم تھوڑا بہت شک بھی کرسکتے ہو۔“

یوسف نے سوچ سوچ کر ایک دو نام لکھوائے۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس کارروائی کو صرف خانہ پری سمجھ رہا ہے۔ نام لکھوا کر وہ گڑگڑانے لگا۔

”انسپکٹر صاحب! میں نے آپ کی بڑی نیک نامی سنی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہی مجھے اس پاگل سے بچا سکتے ہیں۔ آپ کے کمرے میں بیٹھ کر مجھے جو سکون ملا ہے، خدا کی قسم کہیں نہیں ملا۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے ساتھ رہنے دیں۔

میں نے کہا ”بھلے مانس یہ کیسے ہوسکتا ہے! میں تو ابھی اٹھ کر گھر جارہا تھا۔“

وہ میری بات کاٹ کر بولا ”بس مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ انسپکٹر صاحب! میں کوئی غریب آدمی نہیں ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ یقین کریں میں اپنی طاقت اور آپ کے اندازے سے بڑھ کر آپ کی خدمت کروں گا۔ بس مجھے اس اندھی موت سے بچالیں۔“

میں نے کہا ”یوسف میاں! حوصلے سے کام لو۔ میرے سو مسئلے ہیں۔ سو جگہ آنا جانا ہوتا ہے۔ میں تمہیں کہاں کہاں ساتھ لیے پھروں گا۔ یا کہہ دو کہ نوکری چھوڑ دوں اور تمہارے پہرے پر بیٹھ جاؤں۔“

میری بات پر وہ پھر آبدیدہ ہوگیا۔ گلوگیر آواز میں بولا ”انسپکٹر صاحب! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر کچھ کرسکتے ہیں تو کرلیں۔“

مجھے اس پر غصہ بھی آرہا تھا اور ترس بھی۔ بہرحال یہ میرے علاقے کا معاملہ تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ ویسے بھی یوسف کچھ ایسا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ مجرم کے غضب کا اندازہ بے زبان جانور کی وحشیانہ چیر پھاڑ سے ہوتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ بچار کے بعد یوسف سے کہا ”دیکھو بھائی! میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنے دو ہوشیار کانسٹیبل تیری حفاظت پر لگا دیتا ہوں۔ ان میں سے ایک کے پاس پکی رائفل ہوگی۔ وہ چوبیس گھنٹے تیرے ساتھ رہیں گے۔“

یوسف نے کہا ”انسپکٹر صاحب! اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ جو بہتر سمجھیں کریں۔“ لگتا تھا اس کے دل کا غبار اب نکل چکا تھا۔

میں نے کہا ”وہ دونوں میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔ تم چین سے جا کر سو جاؤ۔ ابھی آدھ گھنٹے میں وہ تمہارے پاس پہنچ جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ یوسف نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

میں اس کی ٹھنڈی سانس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ میں نے اسے رُکنے کا اشارہ کیا اور دس منٹ بعد دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ ہی اسے گھر روانہ کیا۔

اگلے روز میں نے اپنے سب انسپکٹر کو اس معاملے کی تحقیق پر لگایا۔ خاص طور پر میں چاہتا تھا کہ یوسف کے مقتول چچا کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ یوسف نے مشتبہ افراد کی فہرست میں چچا کے کسی بیٹے یا رشتہ دار کا نام نہیں لکھوایا تھا مگر میں اپنے طور پر تسلی کرلینا چاہتا تھا۔

سب انسپکٹر کی تحقیق جاری تھی کہ قریبی موضع میں ڈکیتی کی ایک واردات میں دو افراد بھی قتل ہوئے۔ مجرموں کا کھوج لگانے کے لیے مجھے پوری توجہ دینی پڑی۔ تھانے کا پورا عملہ مصروف ہوگیا۔ میں نے ایک روز کے لیے ان کانسٹیبلوں کو بھی بلا لیا جو کرم دین کے گھر یوسف کے پہرے پر تھے۔ یوسف بھی ان کانسٹیبلوں کے ساتھ ساتھ ہی تھانے چلا آیا۔ ”انسپکٹر صاحب! آپ نے انہیں بلا لیا ہے؟“

میں نے ذرا جھلا کر کہا ”یار! اچھے بھلے صحت مند آدمی ہو، کیوں اتنا ڈرتے ہو، کچھ نہیں ہو جائے گا تمہیں۔“

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مجھے پھر ترس آگیا۔ جان کا خوف آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ یوسف مضبوط ہاتھ پیر والا نوجوان تھا۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے افراد کی طرح اس کی توند بھی تھوڑی سی نکلی ہوئی تھی۔ موٹی گردن میں سونے کا وزنی کینٹھا لٹک رہا تھا۔ ریشمی لباس اور چم چم کرتا جوتا۔ بال تھوڑے سے گھونگھریالے تھے اور بیچ سے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ عام حالات میں کوئی اس شخص کو بزدلی کا طعنہ دیتا تو وہ مرنے مارنے پر اُتر آتا لیکن جان کے مسلسل خوف نے اسے سب کچھ کہنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے اس کی شرمندگی مٹانے کے لیے کہا ”یوسف میاں! میرا مطلب ہے کہ تم گھر جاؤ۔ میں نے کانسٹیبلوں کو عارضی طور پر بلایا ہے۔ شام کو یا کل صبح تک وہ تمہاری ڈیوٹی پر پہنچ جائیں گے۔“

یوسف نے سر ہلایا ”ٹھیک ہے جی لیکن یہ بتا دیں کہ کانسٹیبلوں کے آنے تک میں اپنے کمرے میں رہوں یا ادھر ادھر ہو جاؤں۔“

میں نے کہا ”بے فکر ہو کر اپنے کمرے میں رہو۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔“

کچھ دیر بیٹھ کر وہ واپس چلا گیا۔ مجھے بھی گاؤں سے باہر جانا تھا۔ ڈکیتی کا کیس خاصا پیچیدہ ثابت ہو رہا تھا۔ انگریز ایس پی بے حد سخت تھا۔ بار بار اس کے ہرکارے رپورٹ لینے کے لیے آرہے تھے۔ تقریباً چھ روز اسی بھاگ دوڑ میں گزر گئے۔ اس دوران مجھ سے ایک فاش غلطی یہ ہوئی کہ میں کانسٹیبلوں کو واپس یوسف کے پہرے پر نہ بھیج سکا۔ چھٹے روز جب ڈکیتی کے مجرم گرفتار ہوئے اور مجھے اس ہنگامے سے فرصت ملی تو دفتر میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ اس روز دس بجے مجھے یہ پتہ چلا کہ کل شام یوسف پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور وہ شدید زخمی حالت میں امرتسر ہسپتال میں ہے۔ اس خبر نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً کرم دین کو بلانے کے لیے سپاہی

دوڑا آیا۔ کرم دین تو نہیں آیا لیکن اس کا بڑا بیٹا طفیل سپاہی کے ساتھ تھانے پہنچا۔ اس نے بتایا کہ کرم دین بھی ہسپتال میں ہے۔ اسے بھی چوٹیں آئی ہیں۔ کل کے واقعے کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے کہا

''تھانیدار جی! نہر کے گاؤں ستو کی میں ایک عرس تھا۔ چاچے (کرم دین) نے بھرا یوسف سے کہا کہ وہ بھی سب کے ساتھ عرس پر جائے۔ دراصل ہم سب گھر والے ہر سال عرس پر جاتے ہیں۔ یوسف کہتا تھا کہ وہ گھر پر رہے گا مگر ہم سب نے کہہ سن کر اسے تیار کرلیا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے میں تھانیدار صاحب سے پوچھ کر چلا جاتا ہوں۔ وہ آپ سے پوچھنے تھانے آیا لیکن آپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ چاچے نے اس سے کہا کہ تھانیدار نے تجھے نیک کام سے منع تو نہیں کرنا تھا۔ اللہ والے کا دربار ہے وہاں دل کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور دعائیں سنی جاتی ہیں۔ سوہنا رب تیری مشکل بھی آسان کرے گا۔ کل صبح کوئی چھ بجے ہم عرس کے لیے روانہ ہوئے۔ تین تانگے تھے ایک میں عورتیں اور بچے تھے اور دو میں مرد۔ خیریت سے پہنچ گئے۔ واپسی پر شام کے وقت جب ہم نہر کے پاس پہنچے تو اچانک درختوں سے نکل کر چار آدمی سامنے آگئے۔ انہوں نے ڈھاٹے لگا رکھے تھے اور ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ ایک شخص نے جس کے ہاتھ میں ٹوکا تھا یوسف کا نام لے کر للکارا مارا اور بولا ''تو لاکھ پہروں میں بیٹھ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے تانگے پر حملہ کر دیا۔ کوچوان تو جان بچانے کے لیے بھاگ گیا۔ ہم پانچ آدمیوں نے جن میں چاچا بھی تھا، برچھی والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہمارے پاس ایک رائفل بھی تھی مگر بدقسمتی سے اس میں کارتوس پھنس گیا۔ ایک شخص جس کے ہاتھ میں ٹوکا تھا، یوسف پر جھپٹا اور دو تین وار کیے۔ ایک وار یوسف کی ٹانگ پر لگا اور ہڈی کاٹ گیا۔ وہ وہیں گر کر تڑپنے لگا۔ اتنے میں ہمارا دوسرا تانگہ بھی پہنچ گیا۔ چھ سات آدمی نعرے مارتے ہوئے تانگے سے اُترے تو برچھیوں والے بھاگ نکلے۔ ہمارے آدمیوں نے درختوں میں ان کا پیچھا کیا مگر وہ ہاتھ نہیں آئے۔ یوسف شدید زخمی ایک کھیت میں پڑا تھا۔ پہلے تو ہمیں لگا کہ وہ مارا گیا پھر کچھ کچھ سانس لیتا محسوس ہوا۔ ہم نے اسے اسی تانگے میں رکھا اور پکی سڑک کی طرف بھاگے۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ کسی حملہ آور کی پہچان ہوئی؟''

کرم دین کا بیٹا نفی میں سر ہلا کر بولا ''جناب! لڑائی کے دوران ان میں سے ایک آدمی کا ڈھاٹا کھل گیا تھا۔ میں نے بڑے غور سے اسے دیکھا مگر پہچان نہ سکا۔ دوسروں کی بھی کوئی پہچان نہیں ہوئی...... ہاں، ایک برچھی ٹوٹ کر وہاں گر گئی تھی، وہ ہم اُٹھا لائے ہیں۔'' میرے کہنے پر اس نے تہبند کی ڈب کھولی اور برچھی کا اگلا حصہ میز پر رکھ دیا۔ کہنے لگا ''یہ دیکھیں جناب! اس پر کچھ لکھا بھی ہوا ہے۔'' میں نے دیکھا برچھی کی ایک طرف باریک نقطوں کے ساتھ کچھ لکھا ہوا تھا۔ لکھائی مدھم پڑ چکی تھی مگر کوشش کے بعد میں پڑھنے میں کامیاب رہا۔ 'مستری اشرف پردیسی' کے الفاظ تھے۔ ہتھوڑی اور لوہے کی کیل سے دھات پر نقطے ڈالے گئے تھے۔ ان نقطوں نے مندرجہ بالا الفاظ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ ٹوٹی ہوئی برچھی ایک اہم سراغ ثابت ہو سکتی تھی۔

مجھے اس واردات سے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک آدمی کا اعتماد میری وجہ سے مجروح ہوا۔ اس نے مجھ پر اندھا اعتماد کیا اور میری غفلت سے

اسے جان کے لالے پڑے۔ یہ خبر سن کر مجھے مزید افسوس ہوا کہ یوسف کی ٹانگ گھٹنے پر سے کاٹ دی گئی۔ اس کے جسم میں زہر پھیلنے کا اندیشہ اب بھی موجود تھا۔ میں نے خود سے عہد کیا کہ جلد سے جلد مجرموں کا کھوج لگانے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے میں امرتسر پہنچا اور ہسپتال میں یوسف کو دیکھا۔ اس کے دو آپریشن ہو چکے تھے اور اب حالت خطرے سے باہر تھی۔ وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اس سے ایک دو باتیں کیں۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا بازو پکڑ لیا۔ ابھی وہ بات کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ میں اس بچے کھچے اعتماد کو خالی لفظوں کی تسلی دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور باہر نکل آیا۔

سب انسپکٹر کی مکمل رپورٹ آ چکی تھی۔ وہ کوئی اہم سراغ ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ اب میرے پاس آگے بڑھنے کا واحد راستہ وہ ٹوٹی برچھی تھی۔ اس پر کندہ نام سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی اشرف پردیسی نامی لوہار نے بنائی ہے۔ ان دنوں ہر گاؤں میں ایک آدھ لوہار ضرور ہوتا تھا۔ میں نے سب انسپکٹر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اردگرد کے دیہات میں اشرف نامی لوہار کا پتہ کرے۔ سب انسپکٹر نے تیسرے روز مجھے اپنی ناکامی کی خبر سنائی۔ مجھے پہلے ہی اس شخص سے اچھی توقع نہ تھی۔ اس سے پہلے اس نے مشتبہ ناموں پر تحقیق کی تھی اور کچھ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ بس اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے چند اُلٹی سیدھی باتیں رپورٹ میں لکھ دی تھیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ایسے نااہل ماتحت کارکردگی دکھانے کے چکر میں تفتیش کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔ بہرحال میں نے اس سب انسپکٹر پر لعنت بھیجی اور خود اس لوہار کی تلاش میں نکلا۔

ان دنوں میرے پاس ایک روال گھوڑی تھی۔ اس نسل کی گھوڑیاں سبک خرامی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ چال ایسی ہموار کہ جیسے پانی پر تیر رہی ہے۔ ان دنوں ہم عام گھوڑوں کو 'مورس' اور رواں چال کی گھوڑی کو شیورلیٹ کہا کرتے تھے...... تو اپنی شیورلیٹ پر بیٹھ کر میں دوپہر تک چار پانچ دیہات میں گھوما۔ اشرف نامی کسی لوہار کا پتہ نہیں چلا۔

نہر پار جانے کے لیے میں پل پر پہنچا تو وہاں ایک عجیب منظر آیا۔ ایک لڑکی جس کے تمام کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ پریشانی کے عالم میں چیخ رہی تھی۔ وہ برگد کے ایک درخت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس جانب غور سے دیکھا تو ایک آٹھ نو سالہ لڑکا نظر آیا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور شاخوں سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر مجھے سمجھ آئی کہ لڑکی کیوں چلا رہی ہے۔ ایک چیل 'قطب قطائیں' کی آواز نکالتی ہوئی بار بار لڑکے پر جھپٹ رہی تھی۔ میں جلد ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ یہ لڑکی نہر پر کپڑے دھو رہی تھی۔ لڑکا جو شاید اس کا چھوٹا بھائی تھا، گولاں (برگد کا پھل) کھانے کے لیے اوپر چڑھ گیا تھا۔ وہاں چیل کا گھونسلہ تھا۔ وہ اس پر حملہ آور ہو گئی تھی۔ اب گھبراہٹ میں لڑکے سے نیچے نہیں اُترا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر لڑکی چلائی...... ''تھانیدار جی! رب کے واسطے اسے نیچے اُتار دو۔'' صورتحال دلچسپ تھی۔ میں گھوڑی چلا کر آگے آیا اور پھر گھوڑی پر کھڑا ہو کر میں نے ننگ دھڑنگ لڑکے کو نیچے اُتار لیا۔ چیل طیش کے عالم میں مجھ پر بھی حملہ آور ہوئی لیکن میری ٹوپی گرانے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ ہاں لڑکے کی اچھی خاصی مرمت ہوئی تھی۔ اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے اور ایک دو جگہ سے خون رس رہا تھا۔ وہ پہلے تو صرف رو رہا تھا لیکن اب رونے کے ساتھ ساتھ ہنس بھی رہا تھا۔ لڑکی نے ایک دوہتڑ

اس کی کمر پر مارا اور بولی ”پیڑ جو گیا، ہو رکھا گولاں۔“

لڑکے نے لڑکی کو ماں کہہ کر پکارا تو مجھے ان کے رشتے کا علم ہوا۔ وہ عمر میں اس کی ماں ہرگز نہیں لگتی تھی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی ہو گی۔ ابھی تک تو اسے اپنے بچے کی فکر تھی۔ اب اس کا دھیان اپنی طرف گیا اور اس نے بازو موڑ کر سینے پر رکھ لیے۔ وہ ایک خوبصورت اور بھرپور لڑکی تھی۔ لرزاں آواز میں بولی ”تھانیدار جی! آپ کی بڑی مہربانی، مجھے تو ڈر تھا کہ یہ کمبخت ڈیلا (آنکھ) نکلوا کر نیچے آئے گا۔“ میں نے کہا

”بہن! مہربانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ بتا یہ اوپر کیسے چڑھا تھا؟“

بولی ”ادھر ایک گدھا گھوم رہا تھا اس پر چڑھ کر اوپر چلا گیا تھا۔“

میں نے کہا ”گدھے کو اور بھی کئی کام ہوں گے۔ وہ کب تک نیچے کھڑا اس کا انتظار کرتا اس لیے وہ کھسک گیا۔“

میری اس بات پر ماں بیٹا کھلکھلا کر ہنس پڑے...... میں پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ جس گاؤں میں میں اب پہنچا اس کا نام ’کنڈلی‘ تھا۔ یہاں بھی دو لوہار موجود تھے مگر ان میں سے کسی کا نام اشرف پردیسی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ ان میں سے ایک کو مل لوں۔ میں جس لوہار سے ملا اس کا نام جیون تھا۔ عمر کوئی ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ میں نے اسے برچھی دکھائی۔ وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بولا ”مائی باپ! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ لگتا ہے یہ شہر کی بنی ہوئی ہے۔“

جیون کی بات نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شہر میں کوئی کسی کو کب پہچانتا ہے۔ اگر برچھی وہاں سے خریدی گئی تھی تو خریدار کا سراغ ملنا ناممکن تھا۔ میں نے اُٹھتے اُٹھتے کہا۔

”بابا! اس پر مستری اشرف پردیسی کا نام لکھا تھا تیری نظر میں اس نام کا کوئی کاریگر ہے؟“

مستری اشرف کا نام سن کر بابے جیون کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ بولا ”اس پر مستری اشرف کا نام لکھا ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بابا جیون کچھ دم گم صم رہا پھر کہنے لگا ”سرکار! مستری اشرف نام کا لڑکا تو اس گاؤں میں ہے مگر وہ لوہار نہیں وہ تو راج گیری کرتا ہے۔ کرتا کیا ہے، کرتا تھا۔ اب تو چھوڑ چکا ہے۔“

بابے جیون کی بات نے مجھے چونکایا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ پہلے میرا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ برچھی پر برچھی ساز کا نام ہی لکھا ہو۔ یہ برچھی کے مالک کا نام بھی ہو سکتا تھا۔ دراصل مستری کے لفظ نے ہمیں کسی اور زاویے سے نہیں سوچنے دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں نے نہ صرف اشرف پردیسی کا کھوج لگا لیا بلکہ جوتے مار مار کر اس سے یہ بھی منوا لیا کہ یہ اسی کی برچھی ہے۔ یہ ساری کارروائی چوہدری کی حویلی میں ہوئی۔ جب اشرف نے برچھی قبول کر لی تو اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ یہ موقعہ واردات پر کیسے پہنچی۔ پہلے تو اس نے جان بچانے کا گھسا پٹا کلیہ آزمایا اور کہنے لگا کہ برچھی چوری ہو گئی تھی مگر جب موسلا دھار چھتروں کی بارش ہوئی تو وہ مان گیا کہ عرس کے روز وہ موقع واردات پر موجود تھا۔ نہایت خوفزدہ لہجے میں اس نے بتایا کہ وہ قہر سنگھ کا ساتھی ہے۔ قہر سنگھ کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ چوہدری اور اس کے کارندوں کی زبانی صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ اسی گاؤں میں رہتا ہے اور اس کی تھوڑی سی زمین ہے۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہوا کہ بتانے والے قہر

سنگھ کی ذات سے خوفزدہ ہیں اور اس کی اصلیت چھپا رہے ہیں۔ میں نے ان پر زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا اور اس کے گھر کا پتہ پوچھ کر خود ہی ملنے چل پڑا۔ قہر سنگھ کا گھر گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا۔ گھر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ گلی کی بہت سی زمین اس نے اپنے گھر میں شامل کر رکھی تھی۔ اس کی دو موٹی تازی بھینسیں بھی گلی میں بندھی تھیں جن سے راہگیروں کا گزرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کرخت نسوانی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟ آرام کر...... آتی ہوں۔“

پھر کسی نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس سے نہر پر ملاقات ہوئی تھی۔ اب اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ عقب میں وہی لونڈا نظر آ رہا تھا۔

”آ...... آپ یہاں۔“ وہ ہکلائی۔

”ہاں۔ مجھے قہر سنگھ سے ملنا ہے۔“

”وہ تو...... وہ تو گھر میں نہیں لیکن آپ...... آپ اندر آ جائیں۔“

”نہیں بہن! میں جلدی میں ہوں۔ ویسے قہر سنگھ تمہارا کیا لگتا ہے؟“

”میرا مرد ہے جی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر کہنے لگی ”آپ اندر آ جائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔“

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرے قدم خود بخود دہلیز پار کر گئے۔ اس نے جلدی سے برآمدے میں ایک چارپائی ڈالی اور دودھ لسی کا انتظام کرنے لگی۔ میں نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ اسے جو بتانا ہے جلد بتا دے۔

لڑکی اپنے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھائے میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی اور قہر سنگھ کی باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ لڑکی بے حد کارآمد ہے۔ قہر سنگھ اس کا شوہر ضرور تھا مگر وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے لڑکی کو کریدا تو معلوم ہوا کہ قہر سنگھ آج سے دس سال پہلے اسے ایک دور دراز گاؤں سے اُٹھا کر لایا تھا۔ اس نے اس سے زبردستی شادی کی تھی اور بچے پیدا کیے تھے۔ اتنے برس گزرنے کے باوجود لڑکی اسے اپنا دشمن ہی سمجھتی تھی۔ اس کے دل کے کسی کونے میں اس بات کی شدید خواہش تھی کہ قہر سنگھ کو اس کے کیے کی سزا ملے۔ لڑکی نے اپنا نام جہانی بتایا۔ وہ سکھ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کھل گئی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ اس کے مرد نے اسے قیدیوں کی طرح رکھا ہوا ہے اور وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔

میں نے کہا ”جہانی! اگر قہر سنگھ پکڑا گیا اور اسے لمبی سزا ہو گئی تو تیرا کیا بنے گا؟“

اس نے گود کے بچے کا سر چوما اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی ”میرے یہ دونوں پتر سلامت رہیں۔ میں ان کے سہارے ساری زندگی کاٹ دوں گی۔ انہیں پالنے کے لیے آٹھ پہر محنت مزدوری کر سکتی ہوں لیکن اس مرد کے پاؤں کی جوتی بن کر نہیں رہ سکتی۔“

میں قہر سنگھ کے گھر زیادہ دیر نہیں رہا لیکن اس مختصر سے وقت میں جہانی نے کچھ ایسی باتیں میرے کان میں ڈال دیں کہ قہر سنگھ کو گھیرنا آسان ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ قہر سنگھ کے گھر آنے کا کوئی وقت نہیں۔ بعض دفعہ وہ کئی کئی دن گھر کا رُخ نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ ”دیر والی“ گاؤں کے پاس ایک بیلا ہے۔ وہاں فوجیوں کی کچھ پرانی بیرکیں ہیں۔ قہر سنگھ نے وہیں اپنا اڈا بنا رکھا ہے۔ اس کے اس ٹھکانے کا علم گاؤں میں کسی کو بھی نہیں۔

جہانی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ مستری اشرف گدھے کی طرح مار کھانے کے باوجود قہر سنگھ کے اس ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتا سکا تھا۔ جہانی سے رخصت ہو کر میں پھر چوہدری کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ قہر سنگھ کی عورت بڑی منہ پھٹ ہے۔ تھانے میں جا کر اس کا دماغ ٹھیک ہوگا۔ اس نے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

یہ باتیں اس لیے ضروری تھیں کہ قہر سنگھ کی بیوی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ جیسا کہ اب تک کی تفتیش سے پتہ چلا تھا کہ وہ بڑا خر دماغ شخص تھا اور اس نے پورے گاؤں کو ستا رکھا تھا۔ اگر اس کے اڈے پر میرا چھاپہ ناکام ہوتا تو اس کا دھیان اپنی بیوی کی طرف جا سکتا تھا۔ چوہدری کی حویلی سے میں سیدھا اپنے گاؤں پہنچا۔ مستری اشرف کے ہاتھوں میں رسی کی ہتھکڑی تھی اور وہ میرے سامنے تھا۔ تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دو مخبروں کو ”ویروالی“ روانہ کیا تا کہ وہ بیلے کی خبر لائیں۔ شام تک دونوں مخبر واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بیلے میں پہنچے تھے۔ وہاں دو تین بیرکوں کے کھنڈر موجود ہیں لیکن خفیہ کوئی نہیں۔ ایک جہازی سائز کی چارپائی پڑی تھی۔ تین چار آدمی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ مزدور جھاڑیاں اور گھاس کاٹنے میں مصروف تھے۔ پتہ چلا کہ وہ اس جگہ کو آباد کر رہے ہیں (مطلب کہ کھیتی باڑی کا ارادہ رکھتے ہیں) مخبروں نے بتایا کہ وہ لوگ انہیں بھی بیگار پر لگانا چاہتے تھے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔

مخبروں کی اطلاع سے ظاہر تھا کہ بیلے میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ میں نے ایک چھاپہ مار پارٹی تیار کی اور عشاء کی اذان کے وقت ویروالی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ احتیاطاً میں نے کارتوسوں کی ایک فالتو پیٹی بھی ساتھ لے لی تھی۔ پارٹی میں کل آٹھ جوان تھے جو چھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب ہم بیلے میں پہنچے تو ہو کا عالم تھا۔ یہ فروری یا مارچ کے دن تھے۔ دیہات کی کھلی فضا میں یہ موسم بھی کافی خنک ہوتا ہے۔ ہم نے گھوڑے ایک جگہ باندھے اور ایک کانسٹیبل کو نگرانی پر چھوڑ کر آگے بڑھے۔ اندر ایک جگہ آگ روشن تھی اور باتوں کی آواز آتی تھی۔ محتاط انداز سے چلتے ہم آگ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک شخص مزے لے لے کر سوہنی مہینوال کا قصہ بیان کر رہا تھا...... دوسرا شخص دیوار سے ٹیک لگائے چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں اور دو آدمی مٹھیاں بھر رہے تھے۔ فضا میں تاڑی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک شخص بولا ”میرا خیال ہے استاد سو گیا۔“

نیم دراز شخص کی غنودگی سے بھرپور آواز آئی ”اوئے میں نہیں سویا...... ہاں آگے بتا اس الو کے پٹھے نے سوہنی کی ساری دکان خرید لی۔ پھر کیا ہوا؟“

کہانی سنانے والا بولا ”استاد وہ تو پرانی بات ہو گئی اب تو سوہنی کا خصم اس کا گھٹ بھرنے والا ہے۔ تُو سن کیا رہا ہے؟“

استاد نے کہانی سنانے والے کو ایک گالی دی اور بولا ”چل سو جا پھر جا کر تُو بھی۔“ ساتھ ہی اس نے ایک زوردار ٹانگ داستان گو کی پسلی پر ماری۔ وہ چمگادڑ کی طرح اُڑ کر دو گز دُور جا گرا۔

اس وقت میں پستول تانے جھاڑیوں سے نکل آیا۔ اے ایس آئی میرے ساتھ تھا۔ ”خبردار“ اس کی آواز سناٹے میں گونجی۔ ”کوئی حرکت نہ کرے۔“ وہاں کل پانچ افراد تھے۔ سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چارپائی پر دراز شخص بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ساتھیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی خوف تھا لیکن حیرت انگیز تیزی سے اس نے اپنے خوف پر قابو پایا اور بولا

”کیا بات ہے بادشاہو! کیا قصور ہو گیا ہے ہم سے؟“

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہی قہر سنگھ ہے۔ جوڑے کے نیچے اس کا چوڑا چکلا چہرہ اور چہرے کے نیچے تنومند گردن تھی۔ اس کی شکل میں عجیب طرح کی سختی تھی۔ اس کا نام ٹھیک ہی قہر سنگھ رکھا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اصل نام کچھ اور ہو بعد میں قہر سنگھ پڑ گیا ہو حالانکہ وہ بڑی شرافت سے بول رہا تھا مگر اس شرافت میں چھپی ہوئی بدمعاشی مجھے وارننگ دے رہی تھی کہ ہوشیار رہوں۔

میں نے پوچھا ”یہاں تم لوگ کیا کر رہے ہو؟“

وہ بولا ”زمین آباد کر رہے ہیں جی۔“

”کس کی اجازت سے؟“

”جی وہ اپنے...... تحصیلدار صاحب کے حکم سے۔“

قہر سنگھ کا یہ فقرہ مجھے بہت کچھ سمجھا گیا۔ پہلے وہ چوہدری صاحب کا نام لینے لگا تھا اور میرے سوال کا صحیح جواب بھی یہی بنتا تھا مگر پھر عین موقع پر وہ تحصیلدار کو درمیان میں لے آیا تھا۔ اس کا یہ فقرہ بتا گیا کہ ویروالی کے چوہدری خاندان سے اس کا کوئی ناجائز رابطہ ہے۔ میں نے ثبوت پوچھا تو وہ کہنے لگا:

”جناب! میں کل آپ کو کاغذات دکھا دوں گا۔“

”اس وقت کیا ہے تمہارے پاس؟“ میں نے گرج کر پوچھا۔

”اس وقت تو میری زبان ہی ہے جی۔“ وہ ذرا تنک کر بولا۔

”تم سب کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔“

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس وقت میرا ایک کانسٹیبل جو بیرک میں گھس گیا تھا ایک بندوق تھامے اندر سے برآمد ہوا۔ خاں صاحب! اندر ناجائز اسلحہ ہے۔ اس طرح کی چار رائفلیں اور پڑی ہیں۔“

جونہی کانسٹیبل کی زبان سے یہ الفاظ نکلے، درختوں کے قریب کھڑے تین افراد بھاگ نکلے۔ انہوں نے اس ایک لمحہ سے فائدہ اٹھایا تھا جب ہم کانسٹیبل کی بات سن رہے تھے۔ میرے ساتھی ان کے پیچھے بھاگے۔ چوتھے شخص نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا مگر میرے پستول سے شعلہ نکلا اور گولی اس کی ران میں پیوست ہو گئی۔ قہر سنگھ نے لپک کر جھپٹا مارا اور پستول میرے ہاتھ سے گرا دیا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن میں چھلانگ لگا کر اس کے اوپر گرا۔ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ پھر میرا ایک طوفانی مکہ کھا کر وہ چارپائی پر گرا۔ اس کی ناک سے خون آبشار کی طرح بہنے لگا تھا۔ دفعتاً اس نے میلے سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور آہنی ٹوکا نکال لیا۔ ٹوکا دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ میں صحیح جگہ پہنچا ہوں۔ قہر سنگھ نے ٹوکا دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دیوانگی جھلک رہی تھی۔ خطرناک لہجے میں بولا:

”چلا جا تھانیدار ورنہ مارا جائے گا۔ میں کہتا ہوں چپ چاپ چلا جا۔“ واقعی اس کا انداز بھی کسی تھانیدار کو واپس تھانے بھیج سکتا تھا لیکن میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اب قہر سنگھ اور میں اس طرح کھڑے تھے کہ ہمارے درمیان پستول تھا۔ آگ کی روشنی میں اس کا دستہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ قہر سنگھ سے بھی اس کا فاصلہ کم و بیش اتنا ہی تھا۔ قہر سنگھ بھی جان چکا تھا کہ میں پستول کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ درختوں سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا اے ایس آئی بلند

آواز میں ماتحتوں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ میں نے آخری مرتبہ پستول کو دیکھا۔ درمیانی فاصلے کو نظروں میں تولا۔ ذہن میں وقت کا حساب جوڑا اور اچانک پستول کی طرف دوڑا۔ میرے حرکت میں آنے کے ساتھ ہی قہر سنگھ بھی متحرک ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹوکا بلند ہو چکا تھا۔ وہ پستول پکڑنے سے پہلے مجھ پر وار کرنا چاہتا تھا۔ ادھر میں نے پستول اٹھایا ادھر قہر سنگھ کا قاتل ٹوکا چمکا۔ میں نے دائیں پہلو پر جھک کر اپنا سر بچایا اور ایک طرف نکل گیا۔ چند فٹ آگے جا کر میں تیزی سے گھوما اور قہر سنگھ کے ہاتھ کو نشانہ بنایا۔ گولی عین نشانے پر بیٹھی اور قہر سنگھ جو پھر میری طرف لپک رہا تھا، بازو پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔

''خبردار دوسری گولی سر میں ماروں گا۔'' میں نے وارننگ دی۔ قہر سنگھ نے خون بار نظروں سے مجھے دیکھا اور دانت کچکچا کر رہ گیا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ قہر سنگھ کا رابطہ ویروالی کے چوہدریوں سے تھا۔ اگلے ہی روز وہ تھانے پہنچ گئے۔ میں اس وقت قہر سنگھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میرا واحد سوال یہی تھا کہ یوسف ولد چوہدری اللہ دتہ سے اس کی کیا دشمنی ہے اور اس نے اس پر قاتلانہ حملے کیوں کیے؟

قہر سنگھ کچھ بھی بتانے سے انکاری تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے ''پیچھے'' پر بھروسہ کر رہا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ چھوٹ جائے گا۔ دس بجے کے قریب چوہدری ست نام سنگھ کی جیپ تھانے کے سامنے رُکی۔ ست نام سنگھ، چوہدری مہتاب سنگھ کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ ان لوگوں کی پہنچ دُور تک تھی۔ مجھے محتاط ہونا پڑا۔ ست نام سنگھ نے مجھ سے پوچھا کہ قہر سنگھ پر الزام کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ ۳۰۷ اور ۳۲۰ کا کیس ہے۔ اس کے قبضے سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ مزید برآں اس شخص نے قتل کی نیت سے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ اس کے خلاف کافی دنوں سے تحقیق ہو رہی تھی۔ پولیس کے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قاتلانہ حملوں میں ملوث رہا ہے۔

ست نام سنگھ نے کہا ''نواز خاں! باقی باتیں چھوڑو رات تم لوگوں میں جو ہاتھا پائی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے تھی کہ تم نے قہر سنگھ کے پاس سے ناجائز اسلحہ برآمد کیا تھا...... تو میں یہ بتانے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ وہ اسلحہ ناجائز نہیں تھا...... یہ رہے ان پانچوں رائفلوں کے لائسنس۔''

میں نے لائسنس دیکھے۔ وہ بالکل درست تھے۔ ست نام سنگھ نے اس زمین کے کاغذات بھی میرے سامنے رکھ دیئے جس پر قہر سنگھ نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ کہنے لگا ''نواز خاں! یہ اس بیلے کے کاغذات ہیں۔ اچھی طرح دیکھ لو۔ قہر سنگھ میری ہدایت پر ہی وہاں کٹائی کر رہا تھا۔ باقی اب بھی اگر تم باہر سے ضمانت چاہتے ہو تو کوئی ایک نام لے دو، ضمانت میں لے کر دوں گا۔''

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ست نام سنگھ ہر قیمت پر قہر سنگھ کو چھڑانا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ''چوہدری صاحب! میں سب کچھ بھول سکتا ہوں مگر یہ نہیں کہ قہر نے میرے ایک عزیز دوست پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اسے اس بُری طرح زخمی کیا گیا کہ وہ نہ صرف ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا بلکہ ابھی تک زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔''

چوہدری کافی دیر تک مجھ سے بحث کرتا رہا پھر شام کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ شام تک وہ کوئی تگڑی سفارش لے آئے گا، میں نے اس دوران قہر سنگھ کی زبان کھلوانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ جوتے کھا کر وہ اور زیادہ شیر ہوتا تھا اور بعض اوقات وحشیانہ قہقہے لگانے لگتا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی، نہایت سخت

جان شخص تھا۔ مجھے یاد آیا کہ طیش کے عالم میں اس نے کس طرح یوسف کا گھوڑا ذبح کر دیا تھا۔ اس کا چھوٹ جانا یوسف کے لیے بہت خطرناک تھا۔ وہ ایک غصیلا اور کریک شخص تھا۔

تاہم شام تک پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ مجھے قہر سنگھ کو چھوڑنا پڑا۔ پہلے علاقے کے چار پانچ بااثر افراد اس کی سفارش لے کر آئے پھر شام کو چوہدری ست نام سنگھ خود ایس پی کو لے کر پہنچ گیا۔ میں نے قہر سنگھ کو ضمانت پر چھوڑ دیا۔ چوہدریوں کے زور کا تو مجھے پہلے بھی پتہ تھا لیکن اب ظاہر ہو گیا کہ وہ ناک اونچی رکھنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہر حال میں ہتھیار ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ایسے فرعون فطرت چوہدریوں سے میں نے کئی بار ٹکر لی تھی اور ان کی من مانیوں کی بھرپور مزاحمت کی تھی۔ میرے دل میں ایک شک تھا۔ اسے رفع کرنے کے لیے میں اگلے روز امرتسر جا پہنچا۔ یوسف سے ملاقات ہوئی۔ اسے اب عام وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ حالت بہتر تھی اور اب وہ دھیمے لہجے میں بول بھی سکتا تھا۔ میں نے اسے قہر سنگھ کے بارے تفصیل سے بتایا اور پوچھا کہ آیا اس شخص سے اس کی کوئی عداوت ہے۔ یوسف کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ وہ اس شخص کو جانتا تک نہیں تھا۔ اب میں نے ویروالی کے چوہدریوں کا نام لیا۔ یوسف نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ یوں لگا جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ کچھ دیر خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا:

''انسپکٹر صاحب! آپ نے چوہدری ست نام سنگھ کا نام لے کر مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ ان لوگوں سے میری کوئی عداوت تو نہیں لیکن ایک شک مجھے اب ہو رہا ہے...... آج سے کوئی پانچ ماہ پہلے کی بات ہے، سردیوں کے دن تھے، میں اپنے ایک یار کے ساتھ گھوڑے پر سوار شکار کے لیے نکلا ہوا تھا۔ جنگلی خرگوشوں کا پیچھا کرتے ہوئے ہم ویروالی کی طرف نکل گئے۔ راستے میں ایک جگہ ایک لڑکی نظر آئی۔ اس نے مردانہ کُرتا اور میلی سی دھوتی پہن رکھی تھی۔ کسی غریب گھر کی لگتی تھی۔ ویسے ہی...... دل میں شیطان آ گیا۔ میں اسے چھیڑ بیٹھا۔ وہ تو ایک دم آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے کچھ ایسی بات کی کہ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ گھوڑے سے اُتر کر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے میرے منہ پر تھوکا تو میں نے تھپڑ دے مارا۔ بات بڑھ گئی۔ وہ چیخ کر بولی ''تجھے اسی جگہ ٹکڑے نہ کروا دیا تو میرا نام دلشاد نہیں۔'' اتنے میں دو تین لڑکیاں بھاگتی ہوئی آ گئیں۔ ایک لڑکی کی زبانی پتہ چلا کہ مجھ سے جھگڑنے والی دراصل چوہدری ست نام سنگھ کی نوبیاہتا بیوی ہے۔ چوہدری ست نام سنگھ کا نام میں نے پہلے بھی کئی بار سنا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ست نام جیسے زبردست چوہدری کی بیوی اور اس لباس میں۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اس نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ گاؤں میں کسی سہیلی کی شادی تھی۔ لڑکیاں سوانگ بھر کر وہاں گیت گانے جا رہی تھیں۔ بہر حال ہم میں تکرار ہو رہی تھی کہ چند گھڑ سوار نظر آئے۔ ایک لڑکی کی زبانی یہ سن کر میرا خون خشک ہو گیا کہ چوہدری ست نام آ رہا ہے۔'' قریب پہنچے تو دلشاد زور زور سے رونے لگی۔ ایک لڑکی نے سارا قصہ بیان کیا۔ ست نام کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے سوچا اگر یہاں اکڑ دکھائی تو کام بگڑ جائے گا۔ ست نام مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا 'بھائی! معاف کرنا، مجھے معلوم ہوتا کہ یہ آپ کے گھرانے کی عورت ہے تو ایک لفظ زبان سے نہ نکالتا۔' ویسے بھی یہ بات درست تھی۔ میں لڑکی کے

میلے کچیلے لباس سے دھوکہ کھا گیا تھا۔ میری یہ بات ست نام سنگھ کے باپ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہہ سن کر بیٹے کا غصہ ٹھنڈا کیا اور محض چند جھڑکیاں دے کر وہاں سے رخصت کر دیا۔''

میں نے یوسف کے سرہانے بیٹھ کر اس کی ساری بات سنی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو یہ اسی واقعے کا شاخسانہ ہے۔ وہ ذرا سی بات ایک بھتنگڑ بن چکی ہے۔ اپنے طور پر میں نے اس واقعہ کی کڑیاں کچھ اس طرح جوڑیں کہ جھگڑے کے وقت چونکہ ست نام کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا لہٰذا وہ اپنے طیش پر قابو پا گیا۔ بعد میں اس کی بیوی نے اسے بھڑکایا۔ ہو سکتا ہے اس نے یوسف پر کچھ جھوٹے الزام بھی لگائے ہوں۔ بہر حال اس نے شوہر کو اس قدر اکسا دیا کہ وہ یوسف کی جان لینے پر آمادہ ہو گیا۔ یوسف جیسے چھوٹے زمیندار کی جان لینا ست نام کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ یہ تو ایسا تھا جیسے کوئی چیونٹی کو مسل دے۔ اس نے اس چیونٹی کو مسلنے کے لیے قہر سنگھ کی انگلیاں استعمال کیں لیکن یہاں وہ غیبی طاقت آڑے آئی جو ہر شے پر قادر ہے۔ حیرت انگیز طور پر یوسف قاتلانہ حملوں سے محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ قہر سنگھ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ آخر ایک ناکامی کے بعد اس نے یوسف کا گھوڑا تک تہ تیغ کر ڈالا......

میں نے ہسپتال کی اس وارڈ میں بیٹھ کر جو تجزیہ کیا تھا وہ بعد میں نوّے فیصد درست ثابت ہوا۔ صرف اتنی بات کا اور پتہ چلا کہ دلشاد کور نے اس روز اپنی ماں کے دودھ کی قسم کھائی تھی کہ وہ یوسف کے ٹکڑے کروا کر چھوڑے گی...... نوبیاہتا بیوی کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ جب اس نے مرچ مسالا لگا کر شوہر کے کان بھرے تو اسے یوسف کا قتل فرض اولین محسوس ہونے لگا۔ اس نے موت کے ہرکارے قہر سنگھ کو بلایا اور یوسف کے پیچھے لگا دیا......

یہ تھا پورا قصہ۔

کوئی ایک ماہ بعد یوسف بیساکھی کے سہارے چلنے میں کامیاب ہو گیا۔ زمیندار باپ نے اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ اس کے ظاہری زخم تو ٹھیک ہو گئے تھے لیکن اندرونی روگ وہیں کا وہیں تھا۔ موت کا خوف اس کے سر سے ٹلا نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو یوسف کو اس کے گناہوں کی سزا مل رہی تھی۔ دلشاد کا آنچل کھینچنے سے پہلے زمینداری کے گھمنڈ میں اس نے نہ جانے کتنی غریب لڑکیوں کی بددعائیں لی تھیں۔ وہ دیہات کا ایک روایتی امیر زادہ تھا اور ایسے امیر زادوں کی تمام برائیاں اس میں موجود تھیں۔ آخر سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔

اگر میں یوسف کی طرفداری کر رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میری لاپرواہی نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔ دوسرے یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ وہ مسلمان ہے۔ جیسا بھی برا بھلا ہے، کلمہ گو تو ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چوہدری ست نام اپنا انتقام بھولے گا نہیں۔ بدلے کی یہ آگ لمبی عداوت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے ایک روز میں چوہدریوں کی حویلی جا پہنچا۔

چوہدری ست نام نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنی عالیشان بیٹھک میں لے گیا۔ بیٹھک کی ایک ایک شے سے چوہدریوں کی امارت جھلکتی تھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس بیٹھک میں آ چکا تھا۔ یہ کوئی دو سال پرانی بات تھی مگر اس وقت کی بیٹھک اور اب کی بیٹھک میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سب پرانی چیزیں اٹھا دی گئی تھیں۔ نئے سے نیا فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان کمرے میں بھرا پڑا تھا۔ ملازموں کی ایک فوج خدمت کے لیے موجود تھی۔ تکلفات سے فارغ ہو کر میں اصل موضوع پر آیا۔ اشاروں کنایوں

میں میں نے چوہدری کو بتا دیا کہ یوسف کے ساتھ اس کی دشمنی سے میں آگاہ ہو چکا ہوں۔ یہ اطلاع پا کر بھی ست نام کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نظر نہیں آئی۔ وہ اطمینان سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ آخر میں نے کھل کر بات کی، میں نے کہا:

"چوہدری صاحب! دشمنی کمزور کی ہو یا طاقتور کی، نقصان دہ ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے یوسف آپ کے جوڑ کا نہیں مگر اس جھگڑے میں آپ کا کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہوگا۔ چاہے وہ جان کا ہو، مال کا ہو یا نیک نامی کا۔ میں مانتا ہوں کہ یوسف نے ایک غلطی کی تھی۔ اس غلطی کی اسے کافی سزا مل چکی ہے۔ وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ اسے معاف کر دیں۔ دل صاف کر کے ایک دوسرے کو گلے لگا لیں...... وہ خود یہاں آپ سے معافی مانگ لے گا......"

چوہدری ست نام اطمینان سے میری باتیں سنتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اثر لے رہا ہے مگر جب میرے چپ ہونے پر وہ بولا تو مجھے حیران کر گیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اس قدر سنگدل اور کینہ پرور ثابت ہوگا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری سے بولا:

"نہیں نواز خاں! یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ اس کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب وہ چوہدری ست نام کی جو میں اس کی بیوی کو تھپڑ مار رہا تھا۔ اس کی بے حرمتی کر رہا تھا۔ یہ اس کی بڑی خوش قسمتی ہے نواز خاں جو وہ اب تک سانس لے رہا ہے۔ اس کی سانس میرے سینے پر آرے کی طرح چلتی ہے...... سمجھ آئی تجھے۔"

چوہدری ست نام کے الفاظ میں جو خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں کوئی آدھ گھنٹہ چوہدری کے پاس بیٹھا لیکن وہ اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ میں نے دو تین بار گفتگو کا رُخ موڑنے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار کنی کترا گیا۔ اس کا رویہ حوصلہ شکن بلکہ تاؤ دلانے والا تھا۔

میں تھانے واپس آ گیا اور اس گتھی کو سلجھانے کی راہ ڈھونڈنے لگا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ ایک دفعہ بڑے چوہدری مہتاب سنگھ سے ملاقات کی جائے۔ وہ بیٹوں کی نسبت کچھ تحمل مزاج شخص تھا۔ ویسے بھی وہ مجھے جانتا تھا۔ دو سال پہلے زمین کے ایک جھگڑے میں میں نے اس کی مدد کی تھی...... اگلے روز دوپہر کے وقت میں چوہدری مہتاب سے ملنے ویروالی پہنچا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ آج کل پرانی حویلی میں رہتا ہے اور کچھ بیمار ہے۔ یہ حویلی نئی حویلی کے پچھواڑے ایک باغ میں واقع تھی۔ میں دروازے پر پہنچا تو لمبی مونچھوں والے ایک نوکر نے استقبال کیا۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے مہتاب سنگھ سے ملانا نہیں چاہتا یا ملانے سے پہلے کسی سے اجازت لینا چاہتا ہے۔ بہرحال میں نے اسے زیادہ ٹال مٹول کا موقع نہ دیا اور اندر چلا گیا۔ چوہدری مہتاب سنگھ حویلی کے ایک کمرے میں تنہا بستر پر لیٹا تھا۔ وہ خاصا کمزور نظر آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے مجھے پہچانا اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"کیسے آئے ہو نواز خاں؟"

میں نے کہا "سنا تھا آپ بیمار ہیں، سوچا دیکھ آؤں۔"

مہتاب سنگھ نے ایک گہری سانس لی "نواز خاں! بڑھاپا بیماری ہے اور دولتمند بڑھاپا دہری بیماری ہے۔ ایک طرف سے انسان کو بڑھاپا مارتا ہے اور دوسری طرف سے دولت...... یہ دولت بڑی

بے وفا ہے نواز خاں۔ خون کے رشتوں میں زہر گھول دیتی ہے......"

مجھے بوڑھے مہتاب سنگھ کی باتوں سے کسی اور ہی معاملے کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اسے کریدنا شروع کیا اور وہ جلدی جلدی اپنے خول سے برآمد ہوتا چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے قدرت نے کسی خاص مقصد کے تحت مجھے یہاں بھیجا ہو۔ مہتاب سنگھ بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے بہت کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنی اولاد کی طرف سے انتہائی پریشان تھا۔ خاص طور پر بڑا بیٹا ست نام سنگھ اس سے نہایت ابتر سلوک کر رہا تھا۔

بوڑھے نے کہا "انگریزی دواؤں کے نام پر یہ لوگ نجانے مجھے کیا کچھ کھلاتے رہتے ہیں۔ دن بدن خون خشک ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی دن سوتے میں کوئی میرا گلا کاٹ جائے گا۔ میری ارتھی کا سپنا میری اولاد کی آنکھوں میں دن رات سمایا رہتا ہے۔ میں ان کے چہروں پر یہ لکھا ہوا دیکھتا ہوں 'باپو! تم مر کیوں نہیں جاتے، تم مر کیوں نہیں جاتے'۔" میں نے اس سے کہا:

"چوہدری صاحب! میں کل یا پرسوں ایک آدمی آپ کے پاس بھیجوں گا، آپ کسی طرح اسے حویلی میں ملازم رکھ لیں۔ وہ شخص شکل سے سیدھا سادا دیہاتی نظر آتا ہے لیکن ایک نہایت ہوشیار سب انسپکٹر ہے۔ اس قسم کے کاموں کا اسے وسیع تجربہ ہے۔ چند دن میں وہ پوری تحقیق کر لے گا۔ اگر آپ کے شبہات درست ہوئے تو پھر ہم اگلا قدم اٹھائیں گے۔ آپ کسی طرح کا اندیشہ نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور رہوں گا......"

بوڑھے کو پوری طرح سمجھا بجھا کر میں اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چوہدری ست نام سنگھ دروازے پر نظر آیا۔ پستول اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ اس کے عقب میں کچھ اور چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک چہرہ قہر سنگھ کا تھا۔ وہ تیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے نواز خاں؟" چوہدری ست نام مسکرا کر بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا "چوہدری صاحب کی بیماری کا سنا تھا۔ خیریت پوچھنے چلا آیا۔ سوچا تھا واپسی پر آپ سے بھی ملتا جاؤں گا۔"

"تو فارغ ہو گئے ہو؟" ست نام معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہاں! چلیے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

بوڑھے مہتاب کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ ست نام نے ملازم کو پانی پلانے کا حکم دیا اور مجھے ساتھ لیتا ہوا باہر نکل آیا۔ میں صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اچانک ست نام نے میرا راستہ روک لیا۔ "ادھر نہیں نواز خاں...... ادھر، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس نے ایک دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ قہر سنگھ دو ساتھیوں کے ساتھ ہمارے پیچھے تھا۔ کمرے میں پہنچ کر ست نام سنگھ نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور مجھے وہاں عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ یوں لگا جیسے میں ایک بالکل اجنبی شخص کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اس نے جلتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا:

"نواز خاں! میں تیری بہت عزت کرتا تھا...... لیکن افسوس کہ تُو نے ضرورت سے زیادہ جان لیا ہے......"
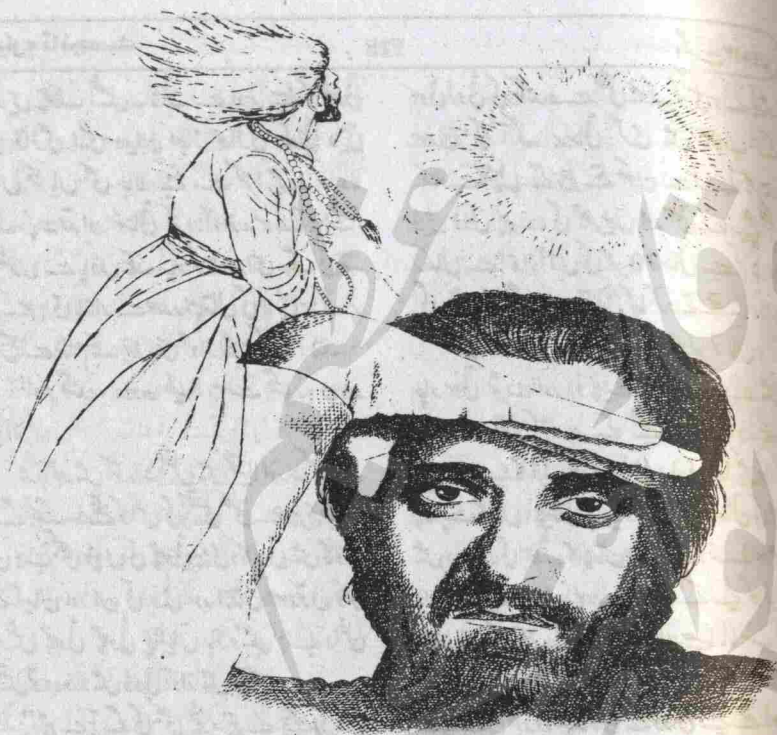
یہ فقرہ نہیں تھا۔ ایک ٹائم بم تھا، جس کی گراریاں کافی دیر سے گھوم رہی تھیں اور اب وہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی فقرہ نہیں تھا۔ اس میں ست نام سنگھ نے سب کچھ بیان کردیا تھا۔ اس میں مہتاب سنگھ کے خدشات کی تصدیق بھی تھی اور نئی حویلی میں ہونے والی سازشوں کی جھلک بھی۔ اس میں میری موت کا اعلان بھی تھا اور ست نام سنگھ کی طاقت کا اظہار بھی۔ یہ الفاظ سننے کے بعد بھی اگر میں خاموش بیٹھا رہتا تو اس کا مطلب تھا مجھے اپنی زندگی سے پیار نہیں اور میں کچھ نہایت قیمتی لمحے ضائع کر رہا ہوں...... میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ ریوالور فضول ثابت ہو جاتا مجھے اسے استعمال کرنا تھا۔ میرا ہاتھ بجلی کی تیزی سے ریوالور تک گیا۔ اس سے پہلے کہ قہر سنگھ مجھ پر جھپٹتا میں نے چھلانگ لگائی اور ست نام سنگھ کے سر پر پہنچ گیا۔ میرا بایاں بازو اس کی گردن کے گرد حمائل ہوا اور دائیں ہاتھ سے میں نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

"خبردار" میں پوری ایمانداری سے بولا "کوئی بھی ہلا تو اسے گولی مار دوں گا۔" قہر سنگھ میرا یہ روپ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر ابھی تک میری گولی کا زخم تھا...... وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ میرے ہاتھ لبلبی پر تھے اور لبلبی اپنا نصف فاصلہ طے کر چکی تھی۔ انگلی کی ایک جنبش ست نام سنگھ کے مغرور کھوپڑے میں سوراخ کر سکتی تھی۔ میں نے تیز نظروں سے قہر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو گھورا اور ست نام کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ حویلی کے دوسرے ملازم بھی کونوں کھدروں سے نکل آئے تھے اور وحشت زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس سناٹے میں صرف کبھی کبھی ست نام کی ہانپتی ہوئی آواز آتی تھی۔ وہ مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ باہر وہ تانگہ کھڑا تھا جس پر میں یہاں پہنچا تھا۔ میں ریوالور کے زور پر ست نام کو تانگے پر لایا۔ جونہی ہم پچھلی نشست پر بیٹھے ہوشیار کوچوان نے گھوڑا آگے بڑھا دیا......

ست نام سنگھ کی گرفتاری کے بعد دو ماہ کے اندر اندر کئی واقعات رونما ہوئے۔ درحقیقت اس گرفتاری نے ویروالی کے چوہدریوں کی کایا پلٹ دی۔ مہتاب سنگھ نے اپنے دونوں بیٹوں کو عاق کر دیا۔ قہر سنگھ سمیت ست نام سنگھ کے کئی ساتھی گرفتار ہوئے اور ان پر سنگین نوعیت کے مقدمات بنے۔ خود ست نام سنگھ اور اس کے بھائی کو قتل، اقدام قتل اور اغوا کے کئی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوئے اور ان کی بیویاں عرش سے فرش پر آ گئیں۔ یوسف صحت یاب ہو کر اپنے گاؤں واپس گیا۔ جان کے 'جان لیوا' خوف سے چھٹکارا پا کر وہ بہت خوش تھا۔ ان گرفتاریوں سے بہت سے لوگ خوش ہوئے لیکن میرے خیال میں سب سے زیادہ خوشی اس عورت کو ہوئی ہو گی، قہر سنگھ جس کا 'مرد' تھا۔ یقیناً جہانی نے جب قہر سنگھ کی عمر قید کا سنا ہو گا تو وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ گردوارے ماتھا ٹیکنے گئی ہو گی۔

آج بھی کبھی جب میں اس کیس کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ بعض اوقات غرور اور بے جا ہٹ دھرمی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اگر اس روز ست نام سنگھ میری بات مان لیتا اور یوسف کو معاف کر دیتا تو میرے ذہن میں کبھی اس کے باپ سے ملنے کا خیال نہ آتا اور یوں اس کے جرم پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان خود اپنے پاؤں پر چل کر اپنے انجام تک پہنچتا ہے۔

بجو کا شکر گنجی

نعیم کوثر

کیا تھا، کیا ہو گیا، چمن تھا، گل ہو گیا
اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے......
اور اس جیسی صدائیں لگانے والے فقیر کے راز کا افشا!

"صدا فقیر کی!
فرید شکر گنج۔ نہ رہے دکھ، نہ رہے رنج!
کیا تھا، کیا ہو گیا۔ چمن تھا، گل ہو گیا!
یا رب کی اور خیر سب کی!
یہاں لے اور وہاں دے!
تیرے آگے کی بھی خیر، پیچھے کی بھی خیر!
اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے!
دھم قلندر، دودھ ملیدا!
مست قلندر، دودھ ملیدا!"

کندھوں تک الجھے بکھرے سفید بال جیسے کباڑی کی دکان کے کونے میں دھول سے اٹا باریک تار کا گچھا۔ ہاتھ لگائیں تو انگلیوں پر خون کی

بوندیں چھلک اٹھیں۔ ناف سے اوپر سینے کو چھوتی لمبی ڈاڑھی ایسی ویران اجاڑ جھاڑی دکھائی دیتی جہاں مکڑیاں بھی جالا بننے سے کترائیں۔ سانولا رنگ، پستہ قد اور منمناتی کمزور آواز۔ موٹے ہونٹ، گھٹنوں سے پاؤں تک سیاہ کُرتا اور اسی رنگ کی تہہ بند۔ جوہری بازار سے صدر ہسپتال کی لانبی سڑک پر وہ صبح سے شام تک یوں ہی آواز لگاتا گھومتا رہتا۔

''دم قلندر، دودھ ملیدا! مست قلندر، دودھ ملیدا!''

نہ ہاتھ میں کٹورا نہ بغل میں تھیلا اور نہ کسی کے آگے بھیک مانگنے کو اس کی ہتھیلی کھلتی۔ جوہری بازار میں جب کبھی بنیوں کی چھوٹی بڑی دکانوں میں گاؤں کے کسان اور ان کی دبلی اور اجڑی صورتوں والی عورتیں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں بازو میں دابے داخل ہوتیں تو وہ درد میں ڈوبی آواز میں چیختا:

''تیرے آگے کی بھی خیر، تیرے پیچھے کی بھی خیر!''

گود میں بے جان سے بچے کو سمیٹے بلکتی روتی ماں ہسپتال میں بھاگتی ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچتی تب بھی وہ اس طرح صدا لگاتا:

''یا رب کی اور خیر سب کی!''

وہ بے چینی کی حالت میں بڑے دروازے پر سر تھامے بیٹھ جاتا۔ تبھی اندر سے اسٹریچر پر سفید چادر میں کسی لاش کو ڈھانپے باہر لایا جاتا تو وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں بولتا۔

''کیا تھا، کیا ہو گیا۔ چمن تھا، گل ہو گیا!''

گرمی ہو، یا بارش، یا سردی، اس کی چال ڈھال اور آواز پر کسی بھی موسم کا اثر نہ پڑتا۔ موسلا دھار بارش اور بجلی کی کڑک سنتے ہی کسی دکان کے سائبان تلے بیٹھتا تو مینڈکوں کی بولتی بند ہو جاتی۔ برفیلی سردی میں حکیم ہوٹل کی بھٹی کے پاس جا لیٹتا اور جلی ہوئی روٹی کی سگندھ سے بھٹکی بھوک کو تسلی دے لیتا۔ سورج کی آگ برساتی گرمی میں تالاب کے کنارے پیپل کے پیڑ تلے سکون سے خراٹے بھرتا۔ ڈیل ڈول چہرے کی جھریوں اور حلق کے نیچے لٹکی کھال سے اندازاً اس کی عمر 70 سال سے کم نہ ہو گی۔ شہر کے لوگ اسے ''بابا'' کہا کرتے تھے۔

میں نے دسویں کا امتحان پاس کیا تو ماں نے چار سوتی شرٹ اور دو پینٹ جو پتے دسہرے میں سلوائے تھے، کپڑے کے تھیلے میں رکھ دیئے۔ پچاس روپے کا ایک نوٹ، ڈھیر ساری دعائیں اور چٹاچٹ گالوں، پیشانی پر پیار کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں روزگار کی تلاش کا چٹان جیسا بوجھ اُٹھائے ودھوا ماں کے مچلتے ارمان پورے کرنے کے لیے گوالیار اپنے ماما کے پاس آ گیا۔ ایشور ان جیسا ماما سب کو دے، جتنا پیار اپنے بچوں کو دیتے، اتنا ہی مجھے دیتے۔ ماں اور وہ، نانا نانی کے دو ہی بچے تھے۔ وہ ضلع پولیس آفس میں اپر ڈویژن کلرک تھے اور دو کمروں کے سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ ماما نے سب سے پہلے روزگار کے لیے میرا نام درج کرایا اور کئی نجی کمپنیوں میں درخواستیں لگوا دیں۔ تین مہینے دن بھر پیدل چلتے چلتے چمڑے کی چپلیاں سارا رنگ روغن کھو بیٹھیں۔ پنڈلیاں درد سے بلکنے لگیں۔ گاؤں کی پگڈنڈیوں نے تارکول کی سڑکوں سے ناتا کیا جوڑا، گائے بھینسوں کے تازہ شدھ دودھ سے پیدا خون شرما گیا۔ ایک دن دل گھبرایا، ماں کی تھپکیاں اور دلار یاد آیا تو گھومتا ہوا تالاب کے کنارے چلا آیا۔ پیپل کے تنے سے کمر ٹکائی اور آنکھیں موند لیں۔ اسی حالت میں رات کے نو بج گئے۔ اچانک کڑکتی آواز سے نیند ہوا ہو گئی۔

''فرید شکر گنج۔ نہ رہے دُکھ، نہ رہے رنج!''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تاریکی میں شہر کے

روشن قمقمے تاروں جیسے چمک رہے تھے۔ سناٹے میں جھینگروں کے بولنے کے سلسلے کو، بابا کے ڈراؤنے قد و قامت اور بھاری قدموں کی چاپ نے توڑ دیا۔ میرا تھکا ماندہ جسم خوف سے لرز اٹھا۔ دس قدم دور کھڑے بابا کی، اندھیرے میں چمکتی آنکھیں میرے بدن کو پسینے میں تر کر رہی تھیں۔ میں نے چاہا کہ دوڑ لگا دوں لیکن زمین نے دونوں پاؤں جکڑ لئے۔ تبھی آگے پیچھے دو کاریں ادھر کو آئیں۔ تیز ہیڈ لائٹس نے تاریکی کی چلمن اُتار پھینکی۔ بابا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی کے آثار نظر آئے تو میری خوفزدگی کا پارہ بھی بکھر گیا۔ لاکھوں کی آبادی میں شاید میں پہلا انسان تھا جسے اس نے مخاطب کیا۔ ہمدردی سے شرابور تھے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔

''چیل کے گھونسلے میں گوشت کی بوٹی ڈھونڈنے نکلے ہو۔ مگر لڑکے، ابھی اللہ کا حکم نہیں ہوا ہے۔''

میں اس کا دھرم پہچان گیا مگر اس کے وشواس کی شکتی نے میری ناامیدی بڑھا دی۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ بابا کیسے جان گیا کہ بیروزگاری کے تھپیڑوں نے میرے حوصلوں کے چیتھڑے اُڑا دیئے ہیں۔

''بابا میری مدد کرو۔ گاؤں میں ماں میرے کارن روتی ہے۔''

کاریں کب کی گزر چکی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کا صرف احساس ہی کر پا رہے تھے۔

''ساری دنیا کی مائیں روتی رہتی ہیں۔ ان کی تقدیر بارش کے موسم میں لکھی گئی ہے۔ میرے بیٹے کی ماں بھی چلائی اور گڑگڑائی تھی۔ سنتا کون ہے۔''

☆..........☆..........☆

یونس کے پاس دو راجستھانی بیلوں کی جوڑی تھی۔ پانچ ایکڑ زمین ہانکنے اور جوتنے کو کافی تھی۔ وہ سوچتا تھا، ایک جوڑی اور مل جائے تو اناج منڈی لے جانے کا خرچ بچ جائے۔ دوسروں کا مال ڈھونے سے آمدنی بھی بڑھ جائے گی۔ سرپنچ کے ٹریکٹر ٹرالی سے، منڈی تک کا بہت زیادہ بھاڑا تھا۔ تین سال سے مون سون کی چاہ میں کئی ضلعوں کے کسان جمع پونجی کھا چکے تھے۔ بھکمری اور اکال نے ساہوکار کی ہتھیلیوں کی کھجلی کافور کر دی۔ کبھی کبھی کالی بدلیاں آسمان کو ڈھانکتیں۔ کسان دوڑے دوڑے کھیتوں میں آتے۔ فضا میں نمی گھل جاتی لیکن طوفانی ہوائیں پل بھر میں بدلیاں اُڑا لے جاتیں اور سورج امیدوں کا منہ چڑاتا، آگ برسانے پھر نکل آتا۔ سب کی کھوکھلی چھاتیاں دل کی دھڑکنوں سے کھلواڑ کرنے لگتیں۔ کتنے تہوار آئے اور سانپ جیسے لہراتے بل کھاتے گزر گئے۔

اب کے برس بادل اتنے ٹوٹ کر برسے کہ تال تلیاں ابلنے لگیں۔ کنوئیں منڈیریں توڑنے لگے۔ گاؤں سے چار میل دور بہتی ندی نے کنارے بسے کئی گاؤں ہڑپ کر لیے۔ کسانوں کے سوکھے ہونٹ کھل اٹھے اور گھروں میں چھائی مردنی چھٹ گئی۔ بال بچوں والیوں نے ابھی سے سپنے میں ڈوبنا شروع کر دیا کہ اس برس بیٹیوں کی ڈولیاں اُٹھ جائیں گی۔ یونس اور اس کی بیوی صغریٰ کے سر سجدے میں گر گئے۔ رات گئے بھیگی بھیگی ہواؤں کے شور میں وہ یونس سے بولی ''اللہ نے ہم لاچاروں کی سن لی۔ اب کی فصل کاٹ لو تو لڑکیوں کی بھی فکر کریں۔ کب تک چیتھڑوں سے جوانی ڈھانپتی رہوں گی۔''

''جتنی فکر تجھے ہے اتنی مجھے بھی ہے، پر کیا کریں۔ کنوئیں کے لیے ساہوکار جی سے دس ہزار لیے ہوئے ہیں۔ تین سال سے ایک روپیہ نہیں دیا۔ بھکاری کی طرح ہر سال مہلت لیتا ہوں۔ اس فصل پر تو ہر حال میں چکانا ہی پڑے گا۔''

قرض تو بینک سے بھی مل جاتا مگر لکھا پڑھی اور انگوٹھے لگانے کے بعد بھی پوری رقم نہیں ملتی۔ بیچ کے دلالوں کو کمیشن اور بابوؤں کی جیب قدم قدم پر منہ پھاڑے رہتی ہے۔ کسان گھبرا کر بینک کی سیڑھیاں اُترتے اور سیدھے بالم پور تحصیل پہنچتے۔ ساہوکار کے سامنے کھتونی رکھی۔ لال رنگ کے بہی کھاتے میں انگوٹھا لگایا اور نوٹ گنتے گنتے تھوک سوکھتا دیکھ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ یونس چھوٹا کسان تھا۔ گھنے جنگلوں سے گھرے دور دراز کے چھوٹے گاؤں میں پانچ ایکڑ زمین کی اوقات کیا ہوتی ہے۔ مٹی کے تیل سے جلتی چھوٹی سی بتی کی روشنی میں پڑوس کے جھونپڑے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ چار طرف دیواریں اینٹ گارے سے بنا لیں۔ مشکل سے بیس فٹ کی جگہ میں یونس اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ دھواں دھار بارش میں سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرانی کھپریل کی چھت دو تین جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ اس کی بیٹیوں نے دروازے کا ٹاٹ اتارا اور اپنے بھائی کے اوپر ڈال دیا۔ دونوں دیوار کی اوٹ میں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ کافی رات گزری اور بارش رُکی تو ہر طرف مینڈکوں کے ٹرٹرانے کی گونج میں یونس اٹھ بیٹھا۔

''اللہ کی رحمت ہے صغرابی۔ اس بار قرضہ ادا کر دینا ہی اچھا ہے۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے۔ گئے سال ہی ساہوکار کے تیور اچھے نہ تھے۔ اب نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''

''ابھی تین مہینے باقی ہیں مکا جوار پکنے میں۔ کچھ نہ کچھ راستہ کھوج لیں گے۔'' صغرابی آہستہ سے بولی تاکہ بچوں کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔

یونس کی سمجھ میں ترکیب آئی اور کہنے لگا ''ایسا کریں بشیرا کو شہر بھیج دیں۔ وہاں اچھی مزدوری مل جاتی ہے۔ فصل کٹنے تک دو ڈھائی ہزار کما لے گا۔''

''چھی چھی چھی! کیسا ظلم کرتے ہو۔ ابھی بارہ سال کا ہے میرا بشیرا۔ شہر پھر شہر ہوتا ہے۔ تمہارے گاؤں جیسا نہیں۔ وہاں ریل گاڑی چلے ہے، موٹر اور پھٹ پھٹیاں۔ کیڑے مکوڑوں جیسے لوگ۔ بشیرا پل بھر سانس نہ لے سکے گا۔''

''اری عقل کی دشمن، روپے پیسے کے آگے نہ گاؤں، نہ شہر۔ میری بات مان لے۔ لڑکیوں کے لیے سہارا ہو جائے گا۔''

''نا بابا، کبھی نہیں۔ یہاں بھی تو وہ تمہارا ہاتھ بٹائے ہے۔ بیل جیسا دن بھر کھیت میں جتا رہے۔''

''میں کہتا ہوں، اوس سے کہیں پیاس بجھے ہے۔''

صغرابی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ سر جھکائے روتی رہی۔ تھک ہار کر یونس خراٹے بھرنے لگا۔

یونس کے کھیت میں مکا جوار نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ادھر گاؤں سے تیس میل دور رہنے والے ساہوکار کے بہی کھاتوں کا پیٹ پھولنے لگا۔ اس کی نگاہیں لہلہاتی فصلوں کو گدھ کی طرح تاکنے لگیں۔ ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں اس کے مخبر تھے جو قرض داروں کی آتی جاتی سانس تک کی خبر ساہوکار کو پہنچاتے رہتے تھے۔ ویسے بھی اچھے مانسوں کو دیکھتے ہی اس کے کان کسی چوکس چوہے جیسے کھڑے ہو جاتے۔ یونس کے کھیت کی مینڈھ پر بھی ساہوکار کے کارندوں کے بھاری قدموں کی چاپ پھنکارنے لگی۔ مٹی پر ان کی لاٹھیوں کی دھمک پڑتی تو یونس کے گھر کی دیواروں پر بیٹھی چھپکلیاں ادھر ادھر دوڑنے لگتیں۔ یونس اور بشیرا خوف زدہ نظروں سے آسمان چھوتی مکا کی بالیوں کو تکتے رہتے، جو ٹاٹ کے پردے جیسی صغرابی اور اس کی جوان بیٹیوں کی عزت و ناموس کی رکھوالی کا حوصلہ کر رہی تھیں۔

ساہوکار بھی بڑا سیانا گھاگ تھا۔ پرکھوں کے ریت

رواج نے اس کے مزاج اور بدھی میں وقت کی نزاکت اور سیاست کی پوتھیوں کا بیج بو دیا تھا۔ جو مون سون کے رحم و کرم سے نہیں بلکہ دماغ میں بکھری زرخیزی سے کسی بھی وقت پھوٹ پڑتا ہے۔ کھیتوں کو لٹھ بازوں سے گھیرنے اور کھلیانوں کو آگ لگانے کا زمانہ نہیں تھا۔ جیسے ہی اسے خبر ملی کہ یونس اناج بیچنے منڈی گیا ہے، وہ چیتے کی رفتار سے گاؤں پہنچا اور یونس کے دروازے کے باہر دونوں نوکروں کے ساتھ کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ وہ کن اکھیوں سے ٹاٹ کے پردے کے پار جھانکنے میں مصروف تھا۔ ٹاٹ میں اتنی تاب نہ تھی۔ بے شمار موسموں کی مار جھیل چکا تھا۔ کہاں تک ساہوکار کی بھیڑیے جیسی ہوس ناک نگاہوں کی تپش روکتا۔ ہوا کے جھونکے پردے کے چھوٹے چھوٹے چھیدوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ساہوکار نے یونس کی بیٹیوں کو جی بھر کے تاکا، گھورا اور پھر کڑک آواز میں بولا ''اوئے بشیرے، کب آئے گا تیرا باپ!'' ٹاٹ کا پردہ گرج دار گونج کو نہیں روک پایا اور صغرابی نے دہشت سے کانپتی بیٹیوں کو اپنی کمزور چھاتی میں سمیٹ لیا۔

''سیٹھ جی، وہ منڈی گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔'' بشیرے نے کتے کے پلے کی طرح دم ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ آس پڑوس کے لوگ باگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ برسوں سے ربیع اور خریف کی فصلیں کھلیان میں آتے ہی ایسا تماشا گاؤں گاؤں ہوتا آیا ہے۔

''اپنی ماں سے کہہ دے، ننھی مل آج پائی پائی لے کر جائے گا۔''

بشیرا سہما ہوا اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد منہ لٹکائے ساہوکار کی کرسی کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا ''سیٹھ جی، اماں کہتی ہے آپ جاؤ۔ ابا منڈی سے سیدھے آپ کے گاؤں آ جائیں گے۔''

''ابے الو کہیں کے! جا اس سے کہہ دے، ننھی مل بھگوان کے ہاں سے ضرور خالی ہاتھ آیا تھا۔ پرنتو قرض دار کے گھر سے دونوں ہاتھ بھر کے واپس جاتا ہے۔''

ساہوکار کی آواز میں بگولے ناچ رہے تھے جو بل کھاتے ہوئے پردے کے پار پہنچے تو بشیرے کی بہنوں کی سانس رُک گئی۔ دونوں سمٹتیں اور دیوار سے جا لگیں۔ اس طوفانی برسات کی رات جیسی جب چھت ٹپک رہی تھی، تبھی سر پہ بھاری گٹھڑ رکھے ہانپتا ہوا یونس آ پہنچا۔ ساہوکار پر نظر پڑتے ہی اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ دس منٹ کا فاصلہ دس دن میں طے کرتا ہوا قریب آیا اور سامان دروازہ پر اوندھا کر ننھی مل کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''یہ ہزار روپے بچے ہیں، رکھ لیجیے۔ تین مہینے میں باقی بھی ادا کر دوں گا۔ منڈی میں بھاؤ بہت گر گئے۔ بس بچوں کے لیے کپڑے لے سکا۔''

ننھی مل نے سارے کے سارے نوٹ یونس کے منہ پر دے مارے اور ہاتھی کی طرح چنگھاڑا۔ ''پورے نکالو۔ ایک دھیلا کم نہیں۔''

وہاں موجود تمام لوگ ڈرے ڈرے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ چوں بھی کرتا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک یونس گڑگڑاتا رہا۔ اس کے ہر لفظ پر گھر کے اندر سے سسکاریاں اُبھرتیں اور یونس کی پسلیوں کو جھنجھوڑ دیتیں لیکن ننھی مل پچاس کوس سے برساتی نالے جیسے دھڑدھڑاتا آیا تھا اور تین سال کے سوکھے کا تمام کیچڑ کوڑا اسمیٹ لے جانے کا اٹل ارادہ تھا۔ سمجھاتے ہوئے بولا ''مورکھ کہیں کے۔ اس وقت جب بھیڑ بکریوں کی طرح ہر ایک بھاگا جا رہا تھا، میں نے کتنا کتنا کہا کہ بھاگ لو۔ یہاں رہو گے تو ایک ایک کو بٹوارے کا قرض چکانا پڑے گا۔ بس میاں، اب میرا حساب چکتا کرو۔''

اس نے کرسی چھوڑی اور اپنے کارندوں کو حکم دیا۔
"جاؤ، دروازے کا چیتھڑا کھینچ پھینکو۔"
وہ ٹاٹ گھسیٹا گیا اور جیسے ظلم اور ناانصافی نے لکڑی کی صلیب سے پوترتا اور تقدیس کو کھینچ لیا۔ یونس کی بیٹیاں ننگی چھاتیوں پر ہاتھ رکھے دور کنوئیں کی طرف دوڑ پڑیں۔ ان کے پیچھے بشیرا تھا۔ آنگن میں صغرابی کی لال لال آنکھیں سبکتگین کے تیر کی طرح ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔

☆............☆............☆

میں تھکا ماندہ گھر لوٹا تو ماما ناراض سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا اور بھڑک اُٹھے۔ "کہاں گئے تھے نریندر؟" ان کی آنکھوں میں غصہ لیکن چہرے پر باپ جیسا پیار بھی تھا۔
"ماماجی، یوں ہی تالاب تک گھومنے چلا گیا تھا۔" میں سر جھکائے کھڑا رہا۔
"ارے پاگل، ہماری نہیں اپنی ماں کی پریشانی کا خیال کیا کرو۔ وہ ہر پل تمہاری فکر میں کھلتی رہتی ہے۔ تمہارے سوا اس کا کون ہے دنیا میں۔"
"دل گھبرا رہا تھا ماماجی۔ چھما کر دیں۔"
اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ نظروں میں بابا ہی گھومتا رہا اور کانوں میں وہی درد بھری صدا گونج رہی تھی۔ "فرید شکر گنج۔ نہ رہے دُکھ، نہ رہے رنج!"
صبح نہا دھو کر ناشتہ کیا اور ماماجی کے دفتر جاتے ہی کاغذوں کا پلندہ اٹھایا اور باہر جانے لگا کہ مامی نے کھنکھارتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا "کہاں چل دیئے راج کمار!"
میں چھ مہینے سے ماما کی روٹیاں توڑ رہا تھا مگر ان کی پیشانی پر بل بھی نہ آیا۔ چاہت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ برابر افسروں کی خوشامدیں کرتے رہتے کہ کہیں کیسی بھی نوکری مل جائے۔ میری قسمت ہی کھوٹی تھی۔ دوسری طرف مامی اپنے دو بچوں کی پڑھائی لکھائی کے خرچ اور میری روٹیوں کی ہر دن گنتی کرنے لگی۔ مجھے بوجھ سمجھتی تھی۔ اس کے بدلے تیور، بیروزگاری کا عذاب اور ماں کا تنہا آنسو بہانا اب میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔
"روٹی ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔"
"کب تک نوکری کے پیچھے بھاگتے رہو گے؟ میں کہتی ہوں محنت مزدوری کر لو۔ کچھ تو ہاتھ میں آئے گا۔"
"ٹھیک ہے مامی۔ وہ بھی کر لوں گا۔"
"تم نے مورکھتا کی نریندر۔ گاؤں میں ماں کے ساتھ ہی رہتے۔ وہاں بھی کھیت کھلیان ہیں۔ کہیں بھی مزدوری کر لیتے۔"
آنسو پیتا ہوا میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ دل میں ٹھان لیا کہ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ مامی کی رسوئی میں ہرگز قدم نہ رکھوں گا۔ پورا دن دفتر اور ہوٹلوں کی خاک چھانتے بیت گیا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے بھوک نے آنتوں کو کھرچنا شروع کر دیا۔ ہفتے میں ایک بار ماماجی جیب خرچ کے لیے مامی سے چھپا کر پانچ روپے دیتے تھے۔ آج جیب میں اٹھنی بچی تھی۔ اس کی مونگ پھلی خریدی اور تالاب کا رخ کیا۔ اس وقت وہاں خاصی بھیڑ تھی۔ چہل قدمی کرنے لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے وہی پیپل کا پیڑ چنا جہاں پچھلی رات بیٹھا تھا اور پاؤں پھیلائے مونگ پھلی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ ایکا ایکی مجھے ماں کی یاد ستانے لگی۔ دسویں کلاس پاس کی تو ماں کے ارمان پھلجھڑی بن گئے۔ سمجھتی تھی کہ بیٹا زمیں دار اور جاگیردار ہو گیا۔ کچھ نہیں تو پٹواری ضرور بن جائے گا۔ اسے کیا معلوم کہ دسویں پاس صبح سے بھوکا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ ماں کیوں روتی ہے اور مامی کے تیور اب راون کے بان کیوں بن گئے؟ میرے سامنے مونگ پھلی کے خالی

شوہر مفکرین کی نظر میں

☆......وہ شوہر جو اپنی بیوی کو حیران کرنے کا منصوبہ بناتا ہے بعض اوقات وہ خود حیران رہ جاتا ہے۔(وائیٹ)

☆......میرا شوہر ایک ایسا آئینہ ہے جس میں، میں اپنا عکس دیکھ سکتی ہوں۔(بٹلے)

☆......ایسا شوہر جو اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ میں سب جانتا ہوں دراصل وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔(فرائیڈ)

☆......شوہر کا کیا اعتبار! اکثر شوہروں کی محبت بندر کا پیار ہوتی ہے۔(شوکت تھانوی)

☆......ایسے شوہروں کی دنیا میں کمی نہیں جو باہر کی دنیا میں شیر اور بیویوں کے سامنے چوہے۔(جی کنگ)

☆......میں ہر اس عورت کو حسین سمجھتا ہوں جو اپنے شوہر کی توقعات اور امنگوں پر پورا اترے۔(ٹوپا)

☆......شوہر کے انتخاب کا معاملہ بادام کی طرح ہے جو کڑوا بھی نکل سکتا ہے اور میٹھا بھی۔

☆......ایک ہی ہستی کے ساتھ زندگی بھر نبھا کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔(ڈسرائیلی)

☆......ایک بہرہ شوہر، ایک اندھی عورت، ایسا جوڑا ہمیشہ خوش رہتا ہے۔(ڈینش کہاوت)

مرتب: تسنیم انور سلیمی

چھلکے ہوا سے زمین پر تھرک رہے تھے۔ اندھیرا بہت گھنا ہو گیا۔ جھینگروں نے خاموشی کو گدگدانا شروع کیا تو مجھے لگا جیسے بھوک اور نیند میرے دل و دماغ کو تھپکیاں دے رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مایوسی نے ہاتھ پاؤں کا خون چوس لیا۔ دُور دُور تک میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ پھر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی، ساتھ ہی مانوس کھنکتی آواز۔

''تیرے آگے کی بھی خیر، پیچھے کی بھی خیر!''

''فرید شکر گنج۔ نہ رہے دُکھ، نہ رہے رنج!''

میری آنکھوں میں جھماکا سا ہوا اور آخری فیصلے نے دماغ کے نقارے پر چوٹ ماری۔ بڑی تیزی سے دوڑا اور تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ لمحے بھر بعد کوئی اور بھی تالاب میں کود پڑا۔ پانی سانپ کی طرح میرے حلق میں گھس رہا تھا اور میں بوکھلاتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مجھے احساس ہوا میرے بال کسی کی مٹھی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کوئی مجھے گھسیٹ رہا ہے۔ ہوش آیا تو آنکھیں پھاڑ کر بابا کے گھنے سفید بالوں سے ٹپکتی بوندوں کو دیکھا جو میرے ہونٹوں سے پھسل رہی تھیں۔

''اٹھو بیٹا! زندگی بڑی انمول ہوتی ہے۔ کیا نام ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''نریندر!'' میرے کیچڑ بھرے منہ سے نکلا ''بالم پور سے آیا ہوں۔''۔

''بالم پور!'' بابا نے نفرت میں ڈوبی آواز میں دہرایا۔

''کس کے بیٹے ہو؟''

''پرمیندر گوسوامی کا!''

''وہ...... ننھی مل کا لڑکا؟''

''ہاں بابا۔''

''ننھی مل...... ننھی مل!'' بابا زخمی شیر جیسا گرجا۔ ''لے ننھی مل! یہ لے، اُٹھا لے اپنے پوتے کو۔ یہ قرض کی پہلی قسط ہے۔ ایسی قسطیں بار بار ادا کرتا رہوں گا۔'' وہ اٹھا اور چلاتے ہوئے دُور نکل گیا:

''یاد رب کی اور خیر سب کی!

اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے۔

فرید شکر گنج، نہ رہے دُکھ، نہ رہے رنج!''

...... ✿ ...... ✿ ......

بھاگنے نہ پائے

بشیر خالد

چور نہ ہوتا تو پولیس کے محکمہ کا کوئی جواز نہ تھا۔ عدالتیں قائم نہ ہوتیں، جیل اور محکمہ جیل خانہ جات وجود میں نہ آتا۔ وکیلوں کی فوج ظفر موج سے محروم رہ جاتے یعنی وہ کھیت ہی نہ ہوتا جہاں لیڈروں کی کاشت کی جا سکے۔ چور نہ صرف اپنے غریب بیوی بچوں کی کفالت کرتا ہے بلکہ ہمارے لیے روزگار کے نہ ختم ہونیوالے ذرائع مہیا کرتا ہے۔

جی ہاں......! آپ ٹھیک سمجھے یہ شریر تحریر چوروں کے بارے ہی میں ہے

آپ شاید خیال فرماتے ہوں کہ چور کسی ناانصاف معاشرہ کی پیداوار ہے۔ جی نہیں! معاشرہ چور کی پیداوار ہے۔ چور ہمیشہ سے اپنے ہم وطنوں کی بے لوث خدمت میں سرگرم عمل رہا ہے۔ بے لوث ان معنوں میں کہ آپ اس کی تشہیر کرتے پھریں تو اور بات ہے چور نے خود ہمیشہ اپنی پبلسٹی سے اجتناب کیا ہے اور شاید یہی اس کی کسمپرسی کی وجہ بھی ہو۔ سعدیؒ (یا شاید رومیؒ) کا مصرعہ کہ

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ایسے تو ہم سب پر لاگو ہے مگر چور کی افادیت کے حق میں تو یہ سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اس امر میں مزید کسی غور و فکر یا بحث و تکرار کی

چنداں ضرورت نہیں تاہم اس میں حرج بھی کوئی نہیں کہ چور جیسی اہم شخصیت زیرِ غور ہی نہ آئے البتہ سوچ بچار کا انداز بجائے منفی ہونے کے مثبت ہونا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں نفرت کرنا زیادہ پسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے بہ نسبت محبت کرنے کے۔ چنانچہ آج اگر سوئے اتفاق کوئی قسمت کا مارا چور ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو اس غریب کا کچومر نکالنے میں ہم ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے مستقل طور پر چور کے خلاف محاذ آرائی کی جو کیفیت پیدا کر رکھی ہے وہ ہمارے حق میں مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہماری حالت کو شاعر ایک مصرعہ میں بیان کرتا ہے۔

جس شاخ پہ بیٹھے ہیں اسے کاٹ رہے ہیں

چور کے احسانات پر اگر آپ میری اس اپیل کے مطابق غور فرمائیں تو آہستہ آہستہ آپ کو چور سے ہمدردی ہوتی جائے گی حتیٰ کہ آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ چور کا وجود نہ صرف ایک صحت مند معاشرہ کے لیے ناگزیر ہے بلکہ اس کے وجود کے بغیر آپ کا اپنا وجود خطرے میں ہے۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ چور کی خدمات کا ابھی تک اعتراف نہیں کیا گیا۔ چور نہ ہوتا تو پولیس کے محکمہ کا کوئی جواز نہ تھا۔ عدالتیں قائم نہ ہوتیں، جیل اور محکمۂ جیل خانہ جات وجود میں نہ آتا۔ وکیلوں کی فوج ظفر موج سے محروم رہ جاتے یعنی وہ کھیت ہی نہ ہوتا جہاں لیڈروں کی کاشت کی جا سکے۔ چور نہ صرف اپنے غریب بیوی بچوں کی کفالت کرتا ہے بلکہ ہمارے لیے روزگار کے نہ ختم ہونے والے ذرائع مہیا کرتا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فی الحال چوروں کی صفوں میں انتشار یا نفسانفسی کی وجہ سے ان کی اپنی کوئی الگ انجمن یا ٹریڈ یونین قائم نہیں ہو سکی۔ اگر خدانخواستہ آج چور برادری متحد ہو جائے اور ہم سے انتقام لینے کی ٹھان لے یعنی چوری کرنا ترک کر دے تو ذرا سوچیے کہ ہمارا کیا حشر ہو۔ پولیس کے محکمہ کو فی الفور توڑنا پڑے۔ عدالتوں میں تالے لگ جائیں۔ وکلات کا جنازہ نکل جائے۔ جیل خانوں میں الو بولنے لگیں۔ قوم بیروزگاری کا شکار اور معیشت تباہ ہو جائے۔ لوگ باگ آہیں بھریں کہ۔

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

چوروں کی نمائندہ کمیٹی کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو اور انسانیت کا واسطہ دے کر اپیل کی جائے کہ۔

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اقتصادیات اور عمرانیات کے ماہرین جرائم کی شرح سے کسی ملک کی ترقی یا تنزلی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ملک جتنا ترقی یافتہ ہوگا جرائم کی شرح اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

جرائم کی فیلڈ میں بھارت ہم سے بھی گیا گزرا ملک ہے۔ ہم میں اور ترقی یافتہ ممالک میں ایک فرق دوسرا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں چوری کی تکنیک ابھی تک روایتی ہے۔ سیدھی سادی اور شریفانہ یعنی سیدھی طرح ڈاکہ ڈالا، پچھلی دیوار میں نقب لگائی یا پھر بھینس وینس چرا کر ہی حرص پوری کر لی۔ ہمارا چور ابھی تک لکیر کا فقیر ہے۔ اس کے برعکس یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں چور نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے چوری کے فن کو سائینٹیفک طریقہ سے آگے بڑھایا ہے۔

ہم اپنے کچھ پرانے کاغذات دیکھ رہے تھے کہ ایک سروے رپورٹ پر نظر ٹھہر گئی۔ لکھا تھا کہ لاہور شہر میں گزشتہ گیارہ سال کے دوران ۹۰۶ افراد کو قتل کیا گیا۔ چوری کی ۱۹ ہزار اور نقب زنی کی ۲۰ ہزار وارداتیں ہوئیں۔ سروے رپورٹ میں جو پولیس کی

طرف سے شائع ہوئی تھی اس بات کی کوئی وضاحت نہ تھی کہ گیارہ سال کے طویل عرصہ میں صرف ۹۰۶ افراد ہی کیوں قتل کیے گئے، باقیوں کو کیوں قتل نہ کیا گیا۔ چوری کی وارداتیں اور نقب زنوں کی کارکردگی بھی کچھ حوصلہ افزا نہ تھی۔ اتنی بڑی آبادی والے شہر میں گیارہ سال کی مدت میں ۱۹ یا ۲۰ ہزار وارداتیں بھی بھلا کوئی وارداتیں ہوئیں......؟

وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے اس خیال کی علامہ اقبالؒ مرحوم نے تائید فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اپنے قریب ترین اور عزیز ترین ہمسائے ملک ایران ہی کی مثال لیجیے کہ جہاں مشرق و مغرب گلے ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، صاف ستھرے شہر، حسین و جمیل لوگ، آبادی کم، وسائل وافر، خدا نے تیل کے ذخائر اور معدنیات کے اتنے خزانے عطا کر دیے ہیں کہ چوری کی صنعت بالکل ہی ڈوبتی ہوئی نظر آتی ہے۔

''انقلابِ سفید'' دراصل اس پرانی صنعت کو تباہ کرنے کا ایک جامع منصوبہ ہے لیکن اس کے باوجود کچھ وضع دار قسم کے چور محض ''نبھانے'' کی خاطر اپنے دیرینہ پیشے کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ فقط آرٹ برائے آرٹ والی بات ہے ورنہ ملکی وسائل کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ ہر خورد و کلاں کو اچھا پہننے کو اور بغیر ملاوٹ کے پنیر، مکھن کھانے کو میسر ہے۔ اسی ایران میں ''انقلابِ سفید'' سے پہلے چوروں کے لیے فضا اچھی خاصی سازگار ہوا کرتی تھی۔

آج سے کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ ابن انشا پہلی مرتبہ تہران تشریف لائے تھے۔ شام کے وقت تفریح کی خاطر ہوٹل سے نکل کر ٹہلتے ٹہلتے جب خیابان فردوسی کی طرف سفارت انگلستان کے قریب پہنچے تو ایک شخص سلام کر کے ان سے لپٹ گیا۔ پہلے یہاں کے دستور کے مطابق انشا جی کے دونوں گالوں کا بوسہ لیا اور پھر خیر خیریت پوچھنے لگا۔ انشا جی نے مصافحہ والا ہاتھ چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی کہ بداخلاقی کے مترادف ہوگا مگر حیران تھے کہ تہران میں ان کی بلائیں لینے والے پہلے ہی سے موجود ہیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ کچھ اس وقت آنا شروع ہوا جب ایک اور شخص ان کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر گھڑی کھولنے میں مصروف تھا۔ گھڑی پرانی تھی اور اس سے آسانی سے چھٹکارا حاصل ہونے والا تھا کہ بدقسمتی سے انشا جی نے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا۔ غلطی کی نہ تھی بلکہ شاید ہو گئی ہو یعنی مصافحہ والا ہاتھ چھڑا کر بجلی کی سی تیزی سے پہلے شخص کے منہ پر زور کا تھپڑ جڑ دیا جس کے تھپڑ لگا تھا وہ تو خیر بھاگ جانے میں حق بجانب تھا ہی مگر گھڑی اُتارنے والے نے جیسے ہی تڑاخ کی آواز سنی، گھڑی پھینک کر بھاگنے والے سے آگے نکل گیا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ''انقلابِ سفید'' سے پہلے کی بات ہے۔ اس تہران اور اس تہران میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اب چوری فنون لطیفہ میں شمار ہوتی ہے جسے ایک خاص قاعدے اور ضابطے کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تہران میں رات کے وقت چوریاں نہیں ہوتیں کہ آخر بنیادی طور پر چور بھی تو انسان ہے اور رات کا سونا اس کی صحت کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہم آپ کے لیے۔ لہٰذا جس کسی نے تہران میں چوری کروانی ہو وہ صرف دن کے وقت کروا سکتا ہے کیونکہ چور محض آپ کی ذاتی سہولت کی خاطر اپنی رات کی نیند خراب نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اسے دن کے وقت زیادہ آسانی ہے۔ جس ملک میں ہر کوئی

ہیٹ، ٹائی، کوٹ، پتلون اور بوٹ جرابیں پہنے پھرتا ہو وہاں اگر کوئی شخص ریڈیو اٹھائے جارہا ہو تو کیا پتہ چلتا ہے کہ یہ چوری کے سلسلے کی کوئی کڑی ہے یا صاحب خانہ خود اپنے فرائض منصبی کے تحت ریڈیو ٹھیک کروانے جارہے ہیں۔

تہران میں عمارتوں کے اندر شیشہ کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ ہر کمرے کی کوئی نہ کوئی دیوار ضرور شیشہ کی ہوگی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مالکان اور چوروں کے درمیان کوئی زبانی معاہدہ ہو چکا ہو کہ چوری کے سلسلہ میں شیشہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا بلکہ اسے پتھر کی دیوار سمجھا جائے گا۔ تالا تڑوا لو، دروازے کے نیچے والی اینٹیں اکھڑوا لو، لوہے کی سلاخیں کٹوا لو، سب منظور لیکن اگر آپ یہ خواہش فرمائیں کہ چور شیشہ توڑ کر اندر گھسے تو نامنظور۔ بظاہر اس کی دو وجوہات نظر آتی ہیں۔ اول یہ کہ شیشہ توڑنے سے آواز پیدا ہوگی یعنی چھناکا ہوگا۔ خیر یہ اتنا بھی برا نہیں کہ کچھ بیک گراؤنڈ میوزک ہی سہی مگر دیکھا گیا ہے کہ شیشہ ٹوٹ جائے تو نوکیلی نوکیں بھی نکل آتی ہیں جو بسا اوقات چھری سے بھی تیز ہوتی ہیں اور اگر خدانخواستہ لگ جائے تو خون نکلے گا۔ لہٰذا نقب زنی کا یہ طریقہ ایران میں متروک ہو چکا ہے۔

تقریباً ہر جگہ چور اور پولیس میں آپس کے مراسم ایسے ہی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں یعنی ایک دوسرے کے ساتھ فنی تعاون، ایران میں پولیس تفتیش کے سلسلے میں چور سے بداخلاقی کی مرتکب نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ چور کا نام عباس ہے تو اسے جب بھی پکارا جائے گا آغا عباس کہہ کر پکارا جائے گا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چور نے ضرورتاً چوری کی ہو۔ ہمارے ایک ہمسائے نے اوپر نیچے دو فلیٹ کرائے پر لے رکھے تھے۔ نیچے خود رہتے اور اوپر فالتو سامان رکھا رہتا تھا۔ ایک دن پتہ چلا کہ اوپر کا فلیٹ کسی چور کے قدموں سے شرفیاب ہو چکا ہے کیونکہ سب چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک گرم سوٹ، قمیص، ٹائی اور بوٹ لاپتہ تھے۔ دوسرے دن وہی بوٹ دروازے کے باہر رکھے ہوئے مل گئے۔ ساتھ ایک کاغذ پر پنسل سے فارسی لکھی ہوئی تھی۔ سلام اور ادب آداب کے بعد تحریر تھا کہ برا نہ مانیے گا بوٹ واپس کر رہا ہوں کیونکہ مجھے چھوٹے ہیں۔

سعودی عرب اور کچھ دوسرے عرب ممالک میں چور ناخوشگوار حالات سے دوچار ہیں اور یہ پرانی صنعت اپنی طبعی موت تقریباً مر چکی ہے۔ نہ پولیس والے چور کو پکڑ کر لے جاتے ہیں نہ وکیل نہ وکالت۔ دوسرے دن چور دونوں ہاتھ کٹوا کر صحیح و سالم واپس گھر آجاتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ رازق ہے اور صنعت ونعت کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان لے آئے اور اللہ نے ان کی ریتلی زمین اور گدلے سمندروں میں تیل کے خزانے رکھ دیئے کہ ضروریات زندگی پوری ہوں اور بوقت ضرورت دشمن کا گلا بھی گھونٹا جا سکے۔

ایک دفعہ ہم نے کسی سعودی سے عرض کیا ”یا شیخ! ہمارے حق میں دعا کرو۔ ہمارے ملک میں بھی کچھ تیل ویل قسم کی چیز نکل آئے۔“ کہنے لگا ”انشاء اللہ یا اخی! مگر تمہارے اور ہمارے ایمان میں فرق ہے۔ تم چور کے سہارے جیتے ہو اور ہمارا تکیہ اللہ پر ہے۔ تم چور کے ہاتھ مضبوط کرتے ہو اور ہم چور کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں۔ تمہارے ہاں چور رازق ہے، ہمارے ہاں اللہ رازق ہے۔“ ہم نے کہا:

”یا شیخ! ہم صرف تفریحات کر رہے تھے۔ آپ تو سنجیدہ ہو گئے۔“

پھول کی موت

ایک سیدھے سادے پاکستانی نوجوان کی عبرت خیز سچی کہانی
جو مغرب کی چکا چوند میں گم ہو کر سنگدل قاتل بن گیا

رحمٰن مذنب

ہر شخص کی طرح حبیب اللہ کے دل میں بھی گدگدی اُٹھی کہ وہ بھی بیرون ملک جائے اور ڈھیروں روپیہ لائے۔ صدیوں پرانا گھروندا ڈھا کر نئی کوٹھی بنائے، کار خریدے اور بینک بیلنس بنائے۔ پھر عیش و عشرت کی زندگی گزارے۔ یوں تو اپنے ملک میں راتوں رات لکھ پتی بننے کے کم مواقع نہ تھے۔ سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، رشوت خوری اور جعلسازی سے اندھا دھند، بے روک ٹوک روپیہ کمایا جا سکتا تھا۔ نودولتیوں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی تھی لیکن حبیب اللہ بھلا آدمی تھا۔ بالکل اناڑی تھا۔ اسے کوئی استاد نہ ملا جو اسے نودولتیا بننے کے طریقے سکھاتا، کوئی ایسا گروہ بھی نہ ملا جو اسے اپنے ساتھ ملا لیتا اور اسے باہر جانے سے بچا لیتا۔

جب وہ مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتا تو کاروں کا اٹوٹ کارواں اس کی آرزوؤں میں ہلچل مچا دیتا۔ کسی بڑی دکان کے پاس سے گزرتا تو بجیلی چمکیلی چہکتی مہکتی عورتوں کا جھرمٹ دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا۔ وہ اپنے دیس میں اجنبی تھا۔ اس کی کوئی حیثیت نہ

تھی۔ وہ کسی شمار میں نہ تھا۔ اس کا کوئی مقام نہ تھا۔ یہی صورتحال اس کی پریشانی کا سبب تھی۔

وہ ۲۶ سال کا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک زندگی میں داخل نہ ہوا تھا۔ اسے تشخص کی محرومی کا شکوہ تھا۔ پنجاب کے ایک دورافتادہ گاؤں چھبیلاں کا رہنے والا یہ نوجوان شہر بہ شہر گیا لیکن اسے روزی کمانے کا معقول ذریعہ نہ ملا۔ شہر کی دمکتی بھڑکیلی روشنیوں نے اس کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں اور اس کا دل بجھا دیا تھا۔ وہ ایک چلتا پھرتا خواب پریشاں تھا۔ آخر وہ اپنی کوشش اور کچھ دوسروں کی کوشش سے بیرون ملک چلا ہی گیا۔

انگلستان کے تاریخی شہر آکسفورڈ میں پہنچا جہاں اسے کتنے ہی پاکستانی ملے۔ یہاں وہ بس ڈرائیور ہو گیا۔ اسے لال رنگ کی ڈبل ڈیکر مل گئی جو آکسفورڈ اور ایلفلے آن ٹیمز کے درمیان چلتی تھی۔

انگلستان کی فضا میں آ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ گھٹن جاتی رہی جو پیسہ نہ ہونے کے باعث وطن عزیز میں پائی جاتی تھی۔ افلاس کے ایک معنی شرافت تھے اور دوسرے معنی گھٹن۔ یورپ کے ایک ترقی یافتہ اور خوشحال ملک میں آ کر اسے روشنی اور روشن خیالی ملی۔ اس کا ذہن کھلا، بدن کھلا اور وہ آکسفورڈ مارکیٹ کے ہنگاموں میں کھو گیا۔ اس کے سامنے سے سائیکل سوار طالبعلموں، مورس موٹرز اور سٹیل ملز کے مزدوروں کا لشکر گزرتا۔

شروع شروع میں جب ابھی اس کے پاس زیادہ پیسے نہ تھے، ایک منظر سے وہ خاصا گھبراتا رہا، لیکن جوں جوں پیسے آتے گئے وہ اس سے مانوس ہوتا گیا۔ پیسے کے ساتھ حجاب اٹھتے گئے، آداب بدلتے گئے۔ منی سکرٹ پہنے لڑکیاں بے تکلفی سے گزرتیں انہیں بہت زیادہ بدن چھپانا نہ آتا تھا...... بے حجابی، بے باکی اور بے تکلفی ان کا شعار تھا۔ کھلے گریبانوں، کھلی پنڈلیوں اور کھلے بازوؤں والی لڑکیاں ہر طرف منڈلاتی پھرتی تھیں۔ چست اور انتہائی مختصر کپڑوں سے کفایت شعاری کا جو تصور پیدا ہوتا تھا وہ بے سود تھا، کیونکہ یہ لڑکیاں بے حد فضول خرچ تھیں۔ کچھ یہ بڑھیں، کچھ وہ بڑھا اور یوں مشرق و مغرب ایک سنگم پر آن کھڑے ہوئے۔

حبیب اللہ کے مذاق میں بہت تیزی سے تبدیلی آ گئی۔ پہلے وہ بس میں بیٹھے یا بازار میں سے گزرتے ہوئے ان تتلیوں کو صرف دیکھتا تھا، اب ان کے ساتھ اُڑنے لگا۔ یہ پل پل بے کل رہنے والی لڑکیاں کبھی ایک پھول، ایک ڈالی پر نہ بیٹھتیں، لحظہ بہ لحظہ وفاداریاں بدلتی رہتیں۔ حبیب اللہ کو جلد ہی ایسے ساتھی مل گئے جو اس سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور مغربی معاشرے کے بھیدی تھے۔ انہوں نے اسے گندی گلی کا راستہ بتا دیا جہاں جسم فروشی کا دھندا ہوتا تھا۔ وہ پرانی وضع کے خاندان کا رکن تھا لیکن نئے ماحول نے اسے یکسر بدل دیا۔ اس کے اندر چھپا ہوا شیطان باہر نکل آیا اور اس پر حاوی ہو گیا۔ وہ عیش و نشاط کی محفلوں میں کھو گیا۔ اسے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔

گندی گلی میں وہ اتنی دور چلا گیا کہ واپسی کا امکان نہ رہا۔ اسی اثناء میں ایک نئی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کا باپ، بھائی، دو ماموں اور تین چچا زاد بھائی بھی آکسفورڈ میں آ گئے۔ یہ لوگ ”برٹی پلیس“ کے دو ملواں فلیٹوں میں مقیم ہوئے۔ انہوں نے دیوار میں سوراخ کر لیا اور یوں ہر وقت پیام و کلام کا سلسلہ جاری رہتا۔ حبیب اللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ لوگ کھانا بھی خود ہی تیار کرتے۔ سبزی گوشت، کوفتہ سالن، پوری کچوری، حلوہ، کھچڑی اور ایسے ہی پکوان مشورہ کر کے تیار کر لیتے۔ انہیں حبیب اللہ کی عادتیں اچھی نہ لگیں جو انہی صدیوں پرانی وضع داری اور موروثی روایات یک قلم

ترک کر کے مغرب زدہ ہو چکا تھا۔ ایک دن جب حبیب اللہ ڈرائیور کا لباس پہن کر ڈیوٹی پر جانے لگا تو اس کے باپ نے کہا ”بوبے! اپنے آپ کو مت بھول! ہم لوگ یہاں روپیہ کمانے آئے ہیں، اپنے آپ کو گنوانے نہیں۔“

حبیب اللہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہنس کر باہر چلا گیا لیکن اس کے جانے کے بعد اہلخانہ دیر تک اس کے بارے میں تشویش انگیز باتیں کرتے رہے۔ بہت غور و خوض کے بعد اہل خانہ نے طے کیا کہ اسے علاقے کے ایک ضعیف العمر بزرگ کے پاس لے جائیں جو سیانا بھی تھا اور دین دار بھی۔ لوگ اکثر اس سے مشورہ کرتے اور اپنے مسائل بیان کرتے۔ ان بزرگ کا نام ملک قمر الزماں تھا۔ موصوف مشرق اور مغرب کے حالات، خیالات اور رجحانات سے بخوبی آگاہ تھے اور ربع صدی سے یہیں آباد تھے۔ انہوں نے حج بھی کیا تھا اور اہل وطن کے سدھار اور فلاح و بہبود کے کاموں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ہر وقت سر پر ہیٹ رکھتے کیونکہ جب آکسفورڈ اور انگلستان میں رنگ و نسل کے امتیاز کی لہر چلی تو چند شریر گوروں نے کسی چیز سے ان کے سر پر غلاظت مل دی اور پریشان کیا تھا۔ حبیب اللہ کے والد اور ماموں اسے لے کر حاجی صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ لڑکا بالکل چوڑ ہو گیا ہے اور جو کچھ کماتا ہے وہ فاحشہ عورتوں کی نذر کر دیتا ہے۔

حاجی صاحب نے نہایت تحمل سے سب کی باتیں سنیں پھر کہا ”جوانی کی جوالا مکھی ایندھن مانگتی ہے۔ جہنم کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو اس پر ڈالنا ہی پڑتا ہے۔ حبیب اللہ کو تو بیوی کی ضرورت ہے جو تندرست و توانا ہو، جوان ہو جو اس کی آرزوؤں کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تاب جھیل سکے۔“

حاجی صاحب نے زندگی کے گرم و سرد کا ذائقہ چکھا تھا۔ زمانے کے نبض شناس تھے۔ ان کی تشخیص بھی صحیح تھی، علاج بھی صحیح تھا۔ حبیب اللہ سمیت سب لوگ قائل ہو گئے لیکن یہ مسئلہ ایسا سیدھا نہیں تھا جتنا سمجھا گیا۔ حبیب اللہ کے والد شریف اللہ نے کہا ”جب ابھی بوبا پاکستان میں تھا تو ہم نے اس کے بیاہ کی کوشش کی۔ خاندان کی کئی لڑکیاں ہمارے خیال میں اس کے لیے موزوں تھیں لیکن اس نے کسی کو پسند ہی نہ کیا۔ اس کی پسند اور اس کے معیار کو ہم تو سمجھ نہیں سکے۔“

حاجی صاحب سوچ میں پڑ گئے اور کچھ دیر کے بعد بولے ”اتفاق سے میرے ذہن میں ایک لڑکی ہے۔ دیہاتن ہے لیکن بڑی ذہین اور حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خوبصورت ہے، تندرست و توانا ہے۔ شریف گھرانے کی ہے۔ کوٹ داد و خان کی رہنے والی ہے۔“

حبیب اللہ نے حاجی صاحب کی باتیں بغور سنیں اور چپ ہو رہا۔ حاجی صاحب اس کی چپ کا مفہوم جان گئے۔ انہوں نے کہا ”بیٹے گھبراؤ نہیں تمہیں گڑھے میں نہیں پھینکا جا رہا۔ وہ لڑکی تمہیں خوشیاں دے گی۔ میری مان لو، اس کا بھائی آنے والا ہے وہ اس کی تصویر لائے گا۔ تصویر دیکھتے ہی تم اس پر فریفتہ ہو جاؤ گے۔ وہ لڑکی ہی ایسی ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔“

یہ لوگ اطمینان سے گھر لوٹ آئے۔ ایک دن برٹی پلیس میں حبیب اللہ کے یہاں ایک دراز قامت آدمی آیا جو برٹش انڈین آرمی کا سابق افسر تھا۔ اس کا نام محمد افضل تھا۔ یہ فیروزہ کا بڑا بھائی تھا اور آکسفورڈ میں کاروبار کرتا تھا۔ اسے حاجی صاحب نے بھیجا تھا۔ لوگ لڑکیوں کے رشتے کے لیے اچھے لڑکوں کی ٹوہ میں رہتے اور اگر کوئی لڑکا غیر ملک میں گیا ہوتا تو اسے ہر مقامی لڑکے پر ترجیح دیتے۔ وہ

جانتے تھے کہ ان کی لڑکی کو جلد ہی ریفریجریٹر، ائیر کنڈیشنر، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، کوٹھی، کار، دولت اور دنیا بھر کی نعمتیں مل جائیں گی۔ لڑکی سکھی رہے گی۔

جب سب لوگ چائے کی میز پر بیٹھ گئے تو افضل نے البم کھولا جس میں فیروزہ کی چھوٹی بڑی چند تصاویر تھیں۔ ہر تصویر کا پوز الگ الگ تھا۔ حبیب اللہ نے یہ البم بڑی بے تابی سے دیکھا۔ لڑکی ہر انداز سے کمال تھی۔ دیہات کا الھڑ پن اور جوانی کی شادابی حیرت انگیز تھی۔ وہ تصاویر میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ اسے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے بزرگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا۔ دراصل مغرب کے ماحول نے اسے آزاد خیال کر دیا تھا اور اس میں جھجک نام کو نہ رہی تھی جو پاکستان میں اسے ہر دم محسوس ہوتی۔ جب تک وہ البم دیکھتا رہا اس کے بزرگ محمد افضل سے باتیں کرتے رہے۔ لڑکی کی عادات و صفات اور گھریلو حالات کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کرتے رہے۔

افضل نے بتایا کہ اس کی بہن بڑی سگھڑ اور گھریلو لڑکی ہے۔ کھانے پکانے اور سینے پرونے میں طاق ہے۔ پلاؤ، زردہ، قورمہ، فیرنی، حلوہ پوری، شامی کباب، مرغ مچھلی، سب کچھ پکا لیتی ہے۔ ہر قسم کے اچار ڈال لیتی ہے۔ اتنی سلیقہ شعار ہے کہ ہر سال موسم کی سبزیاں سکھا کر گھر میں رکھتی ہے۔

حبیب اللہ کو گھریلو زندگی کے ان پہلوؤں سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو صرف بھرپور بدن، دل آواز نقش و نگار اور پرجوش امنگوں والی لڑکی کا طلبگار تھا۔ جہاں تک البم میں چسپاں کی ہوئی تصاویر کا تعلق تھا، فیروزہ ایسی ہی لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے لڑکی پسند کر لی۔ افضل نے فوراً گھر والوں کو اطلاع دی اور شادی کی تاریخ طے ہو گئی بلکہ وقت بھی مقرر ہو گیا۔

فیروزہ کو اس کے میاں کی کوئی تصویر نہ دکھائی گئی۔ بہرحال وہ اپنے بڑے بھائی کے فیصلے سے مطمئن تھی جو اسے دل سے چاہتا تھا اور اس کی بہتری کے لیے سب کچھ کرتا تھا۔ سہیلیاں جمع ہوئیں۔ ڈھولک کے گیتوں کی محفلیں ہونے لگیں۔ نئے جوڑے تیزی سے سلنے لگے۔ گوٹا کناری اور سلمہ ستارے کا کام ہونے لگا۔ آخر مقررہ دن آ گیا۔ فیروزہ کو مہندی لگائی گئی اور بنا سنوار کر دلہن بنایا گیا۔ اس کا ہونے والا میاں ہزاروں میل دور تھا۔ دونوں میں ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ قائم ہوتا۔ آکسفورڈ کی والٹن سٹریٹ کی مسجد کے امام صاحب نے نکاح پڑھایا۔ اس کے بعد ہوائی ڈاک سے نکاح نامہ بھیجا گیا جس پر فیروزہ نے دستخط کیے۔ ایک کاغذ رکھ لیا، دوسرا لوٹا دیا۔

ادھر آکسفورڈ میں ادھر کوٹ دادو میں عزیزوں اور دوستوں کی ضیافتیں کی گئیں۔ سب سہیلیوں نے فیروزہ کی قسمت پر رشک کیا جسے بیرون ملک کام کرنے والا میاں مل گیا تھا۔ بعض نے تو اس سے علیحدگی میں یہ بھی کہہ دیا کہ جب میاں کے پاس انگلستان جائے تو اس کے ملنے والوں میں ان کے لیے بھی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ نکالے۔ وہ بھی باہر چلی جائیں۔ فیروزہ نے انہیں بڑی تسلی دی اور حق دوستی ادا کرنے کا پکا وعدہ کیا۔

چند دن کے بعد اسے آکسفورڈ آنے کا بلاوا مل گیا۔ دام بھی مل گئے۔ ماں باپ اسے کراچی لے گئے اور نئے کپڑے اور زیور دے کر اسے ہوائی جہاز پر چڑھا دیا۔ دو روز کے بعد لندن کے ہوائی اڈے پر جہاز اُترا۔ اس کا ان دیکھا شوہر حبیب اللہ، اس کا والد شریف اللہ، ماموں، چچا زاد بھائی اور فیروزہ کا بھائی پہلے سے موجود تھے۔ حبیب اللہ اسے دیکھتے ہی پھڑک اُٹھا۔ وہ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ حسین و

جمیل تھی۔ جوانی کا سونا انگ انگ میں چمک دمک رہا تھا۔ میک اپ کے بغیر ہی چہرے پر ارغوانی رنگ تندرستی کی ابھری تجیلی علامت بنا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر سب کو دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔ حبیب اللہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

پارٹی گھر آئی۔ ایک بار پھر جشن منایا گیا اور احباب کی ضیافت کی گئی۔

حبیب اللہ بیوی کو لے کر آکسفورڈ کی ڈاؤن سٹریٹ میں اُٹھ آیا۔ یہاں انہوں نے انتہائی گرمجوشی سے ہنی مون منایا۔ ایک ماہ تک دونوں رات دن کی گردش سے بے نیاز رہے۔ دونوں میں گہرا پیار ہو گیا۔ چھ ماہ گزر گئے۔ اس کے بعد ان کی عمارت آکسفورڈ ہاؤسنگ کونسل کی تحویل میں چلی گئی۔ اب میاں بیوی برٹی پلیس میں آ گئے جہاں شریف اللہ اور لڑکے کے ماموں اپنے بیٹوں کے ساتھ رہتے تھے۔

حبیب اللہ کے سر میں سودا سمایا تھا کہ اس کی بیوی مغربی معاشرے کی روایات اور عادات اختیار کرے۔ کوٹ دادو خان کو یکسر بھول کر ماڈل گرل بن جائے۔ اس نے بیوی کے بال بھی کٹوا دیئے۔ پردے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بس میں اپنے میاں کی عین پشت والی نشست پر بیٹھ جاتی اور سیر کرتی۔ نیم عریاں بدنوں والی بے باک لڑکیوں کو دیکھتی اور شرما جاتی لیکن زبان سے کچھ نہ کہتی۔ کان میں بالیاں پہنتی۔ لونگ بھی لگا لیتی۔ حبیب اللہ نے اسے خوبصورت گھڑی لے کر دی تھی جسے وہ ہر وقت کلائی پر باندھے رہتی۔

بس بین بری روڈ سے ہو کر میگر الین، کارن مارکیٹ اور کارفیکس کے چوراہے پر پہنچتی۔ دریائے ٹیمز کے خالی برج پر ٹریفک کا ہجوم دیکھ کر وہ دنگ رہ جاتی۔ کوٹ دادو خان کی لڑکی کے لیے یہ ایک عجوبہ تھا۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ، گاڑیاں، بسیں کس خوش اسلوبی سے گزر جاتیں۔ ڈنر جیکٹ پہنے آکسفورڈ کے طالبعلم سیٹیاں بجاتے اور گیت گاتے سائیکلوں پر سوار ہزاروں کی تعداد میں گزرتے۔ انہی کے ساتھ کالے لوگوں سے بدسلوکی کرنے والے "سکن ہیڈ" موٹر سائیکلوں پر ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم ان کے علاوہ تھا۔ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں آکر وہ تو جیسے پاگل ہی ہو گئی۔

رفتہ رفتہ اس کی جھجک کم ہوئی اور وہ قصائی کی دکان سے جا کر گوشت لے آتی۔ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی لانے لگی۔ محلے کے لوگ اسے آتے جاتے دیکھتے...... پھر اچانک وہ غائب ہو گئی۔ ۱۹۶۸ء کے وسط اکتوبر کے بعد کسی نے اسے آکسفورڈ میں نہیں دیکھا۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے، ایک نوجوان عورت نے رات بسر کرنے کے لیے برٹی پلیس میں جگہ لی تھی۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں فیروزہ اپنے میاں اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ رہتی تھی۔ بدقسمتی سے یہ عورت اس المیے کی چشم دید گواہ تھی جس میں بدنصیب فیروزہ نے ہیروئن کا پارٹ ادا کیا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ یہ عورت دوپہر کے وقت کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اچانک ساتھ کے حصے میں باغ کے اندر شور و غل ہوا۔ پہلے تو عورت کی چیخیں سنائی دیں اور پھر وہ دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہ بُری طرح ہاتھ ہلا رہی تھی۔ دو آدمی پیچھے آئے اور انہوں نے عورت کو پکڑ لیا۔ ایک اسے بُری طرح گھونسے مارنے لگا اور دوسرا ہتھوڑے سے ضربیں لگانے لگا۔ آخر چیخیں تھم گئیں۔ عورت زمین پر گر گئی۔ دونوں مرد واپس اندر گئے اور ایک صندوق لے آئے۔ انہوں نے عورت کو گٹھڑی مڈی کر کے صندوق میں بند کر دیا۔ صندوق کو

اٹھا کر پھر مکان کے اندر چلے گئے۔

یہ پڑوسن اس ہولناک منظر سے خوفزدہ ہو گئی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ پہلے اس نے سوچا کہ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے لیکن پھر طے کیا کہ چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ اس معاملے میں پہل نہ کرے۔ ڈرتی تھی کہیں پولیس کو خبر دے کر وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ مالکن یا کسی پڑوسی کو خبر کرے لیکن اس کے نزدیک یہ بھی خطرناک اقدام تھا۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ ڈرپوک تھی۔ اس کے ڈرپوک ہونے اور خاموش رہنے کا ایک سبب اور بھی تھا۔ اس کے پاس تھوڑی سی مقدار میں حشیش تھی۔ اسے ڈر تھا کہ پولیس پوچھ گچھ کے لیے اس کے کمرے میں آئی تو وہ پکڑی جائے گی۔ پولیس یہ بھی جان لے گی کہ اس کا واضح طور پر کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ اگر آکسفورڈ کے جری طلباء دیواریں پھلانگ کر اس کے پاس نہ آئیں تو وہ کرایہ بھی ادا نہ کر سکے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پولیس کو اس واردات کی خبر دے کر اپنے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرے۔ چنانچہ اس نے زبان بند رکھنے میں ہی خیریت جانی لیکن اس طرح وہ نئے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ کشمکش بڑھتی گئی...... وہ چپ رہے یا سچ کہہ ڈالے۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ اس لیے وہاں رہنا حرام ہو گیا۔ آخر اپنی مشکل پر قابو پانے کے لیے اس نے ایک فیصلہ کن اقدام کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا اور سامان باندھ کر دوسری جگہ چلی گئی۔ ۱۹۶۸ء گزر گیا۔ ۱۹۶۹ء آ گیا لیکن اس کے دل میں وہی خلش رہی۔ اب بھی اس نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ نئے سال کے بھی چھ مہینے گزر گئے۔ آخر اس کے ضمیر پر بوجھ ناقابل برداشت ہو گیا اور وہ مجبور ہو گئی۔ اس نے کاغذ اور قلم سنبھالا۔ پولیس کو گمنام خط بھیج دیا۔

ادھر فیروزہ کا بھائی افضل اطمینان سے اپنے کاروبار میں مصروف رہا۔ جانتا تھا کہ اس کی بہن اپنے میاں کے گھر میں خوش ہے۔ وہ بھی اس کے یہاں نہ گیا۔ حبیب اللہ کے گھر میں ٹیلیفون بھی نہ تھا۔ اس لیے وہ رابطہ قائم نہ کر سکا۔ پاکستانی حلقوں میں حبیب اللہ کے بارے میں طرح طرح کی خبریں اُڑتی رہتیں۔ وہ خاصا مشہور شخص تھا۔ اکثر سننے میں آتا کہ وہ خوب پیسہ بٹور رہا ہے اور کار خریدنے کی فکر میں ہے۔ فیروزہ باہر چلتی پھرتی دکھائی نہ دی تو لوگوں نے سمجھا کہ گھر میں ٹیلی ویژن آ گیا ہے۔ فیروزہ اسے دیکھتی رہتی ہو گی۔ باہر کے کام کسی اور کے سپرد ہوں گے۔ پھر ایک خبر پھیلی جس نے تمام خبروں اور افواہوں کو کھا لیا...... حبیب اللہ اپنی فیروزہ کو لے کر پیرس جا رہا ہے۔ کرسمس کی چھٹیاں میاں بیوی وہیں گزاریں گے۔

بعد ازاں جب پولیس نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ ہر خبر ہر افواہ کا منبع و ماخذ ہر حالت میں خود حبیب اللہ، اس کا والد شریف اللہ یا اس کا بھائی انعام اللہ ہوتا تھا۔ اس کی معقول وجہ تھی۔ فیروزہ کی پراسرار گمشدگی کے سلسلے میں یہ من گھڑت خبریں اور افواہیں بہت ضروری تھیں۔

آکسفورڈ کی ایک بازاری عورت نے اپنی ہی داستان سنائی۔ اس نے سی آئی ڈی کو بتایا کہ شادی سے پہلے حبیب اللہ اس کے یہاں آتا جاتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے آنا جانا بند کر دیا۔ پھر اچانک نومبر ۱۹۶۸ء میں اس کے یہاں آ دھمکا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا، پیاری سلومی! مجھے بیتے دن بُری طرح یاد آتے ہیں۔ تم نے میری زندگی کے گزرے ہوئے لمحوں میں جو رنگ بھرے ہیں وہی رنگ پھر بھر دو! مجھے تم سے پیار ہے۔ اس کی زبان سے یہ

الفاظ سن کر سلومی بہت حیران ہوئی۔ اس نے کہا، ہے بب! تم کیا کر رہے ہو؟ تم شادی شدہ ہو اور میں نے تو یہ تک سنا ہے کہ تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہے۔ اب تمہارے لیے مجھ میں کیا کشش رہ گئی۔ حبیب اللہ نے جواب دیا، کبھی شادی شدہ ضرور تھا لیکن اب نہیں۔ میری بیوی کی روح واپس پاکستان جا چکی ہے۔ میں اب اسی طرح آزاد ہوں جس طرح شادی سے پہلے تھا۔

تاہم یہ امر واقع ہے کہ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ء بروز جمعہ دوپہر کو حبیب اللہ بوٹ ٹرین کے ذریعے ڈنکرک روانہ ہوا لیکن اس سفر پر وہ اکیلا نہیں تھا۔ کئی لوگوں نے پولیس کو بتایا کہ جب وہ روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان پاکستانی عورت تھی اور ایک پاکستانی مرد بھی تھا۔

جلد ہی فیروزہ کے بھائی محمد افضل کو آکسفورڈ میں تار وصول ہوا۔ ہفتے کی رات تھی۔ تار پر تاریخ اور مقام یوں رقم تھا، ۱۱:۳۰ صبح، ۲۸ دسمبر ۱۹۶۸ء مضمون انتہائی دلشکن تھا۔

”بڑے دکھ سے اطلاع دے رہا ہوں کہ آج صبح پیاری فیروزہ کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ میں معجزانہ طور پر بچ گیا ہوں۔ کاش ایسا نہ ہوتا اور میں بھی اپنی بیوی کے ساتھ موت کی آغوش میں چلا جاتا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی ہے۔ حکام نے مرحومہ کو سڑک کی ایک جانب خالی جگہ میں دفن کرنے کی اجازت دے دی ہے۔“

افضل پر تو جیسے بجلی سی گر گئی۔ وہ دیوانہ وار برٹی پلیس گیا۔ اس کے آنے سے پہلے یہاں بھی فیروزہ کے مرنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ افضل پر بدحواسی کا عالم طاری تھا۔ فیروزہ کی حادثاتی موت کی تصدیق تو ہو گئی لیکن کسی نے اسے کوئی تار نہ دکھایا۔ دراصل ان کے پاس کوئی تار آیا ہی نہیں تھا۔ خبر سے وہ اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس وقت سب لوگ گھر میں موجود تھے اور سوگ منا رہے تھے لیکن حبیب اللہ کا چھوٹا بھائی غیر حاضر تھا۔ افضل نے فیض اللہ کی غیر حاضری محسوس ہی نہ کی۔ اس بیچارے کو تو اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ پھر اس نے یہ بھی نہ محسوس کیا کہ گھر کی حالت بڑی ابتر ہے۔ ہر طرف کوڑا کچرا پھیل رہا ہے۔ یہ کوڑا کچرا ۲۷ دسمبر کے بعد کا ہرگز ہرگز نہ تھا۔ جب اس کی بہن اپنے میاں کے ساتھ پیرس گئی تھی یہ تو کئی دن کئی ہفتوں کا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ خاتون خانہ خاصی مدت سے گھر سے غائب ہے۔

چار دن کے بعد افضل کو پیرس سے ایک اور خط ملا۔ یہ اس کی بہن کی جانب سے تھا لیکن اس کا لکھا ہوا نہ تھا۔ وہ کہاں خط لکھ سکتی تھی؟ معمولی سی حرف شناس ضرور تھی، دو چار اُلٹے سیدھے، ٹوٹے پھوٹے لفظ لکھ سکتی تھی۔ خط کا مضمون یہ تھا:

”بھائی صاحب! تمہاری بہن فیروزہ نے اصرار کیا ہے کہ اس سنسنی خیز سفر اور پرلطف لمحات کے بارے میں تمہیں لکھوں۔ روشنیوں کے اس حیرت انگیز شہر میں آکر تمہاری بہن بہت خوش ہوئی ہے۔ ہماری سیاحت کی ہر گھڑی قابل رشک ہے۔ ہم خود کو بڑا خوش نصیب خیال کرتے ہیں۔ ہم کرسمس کے بعد آکسفورڈ آجائیں گے۔

فیروزہ اور میری طرف سے بہت بہت سلام!

یہ تحریر حبیب اللہ کی بھی نہیں تھی۔ اس کے بھائی کی تھی جو بلا کا ذہین اور شرپسند تھا لیکن افضل کو اس سے کیا کہ کس نے خط لکھا تھا اس کے دل میں تو ایک ایک لفظ تیر بن کر چبھا۔ اسے تو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اس کی بہن نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا کہ موت کے منہ میں چلی گئی اور سڑک کنارے دفن ہوئی۔ اس نے عمر بھر تک خوش رہنے کے لیے سوچ سمجھ کر اور حاجی قمر الزمان جیسے عمر رسیدہ، تجربہ کار اور ہوشیار آدمی

سے مشورہ کر کے اسے حبیب اللہ سے بیاہا تھا لیکن یہاں انیسویں بہار کے ساتھ ہی خزاں آ گئی۔

اس نے لفافے کی مہر دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ خط ۲۸ دسمبر کو آدھی رات سے کچھ ہی پہلے پیرس کے ریلوے سٹیشن کے پوسٹ بکس میں ڈالا گیا تھا۔

افضل غم واندوہ اور پریشانی کی حالت میں حاجی قمر الزماں کے گھر گیا۔ خط اور تار ان کے حوالے کیے۔ وہ بھی معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ حسب معمول انہوں نے صبر کی تلقین کی اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت مانگی۔ پھر انہوں نے کہا ”وہاں تو کوئی مولوی نہ ہوگا جس نے نماز جنازہ پڑھائی ہو۔ بیچاری کو یوں ہی لب سڑک دفنا دیا ہوگا۔“

حاجی قمر الزماں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ پولیس کو اطلاع دے۔ ہوسکتا ہے کہ تار اور خط کی آڑ میں کوئی خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہو۔ فیروزہ کی لاش اور اس کی تدفین کے بارے میں صحیح صورتحال معلوم ہونی چاہیے۔ افضل ان کی ہدایت پر آکسفورڈ میں سی آئی ڈی کے صدر دفتر پہنچا۔ ڈیسک پر بیٹھے ہوئے افسر نے تار اور خط لے لیے۔ اس سے زبانی بات چیت کی لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچا۔ اس نے اصرار کیا کہ اسے سراغ رسانوں کے افسر اعلیٰ...... چیف سپرنٹنڈنٹ امین جونز سے ملایا جائے۔ اس کی خواہش پوری کر دی گئی۔ ڈیٹیکٹو چیف نہایت زیرک، تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے ساری کہانی شروع سے لے کر آخر تک سنی۔ ایک ایک لفظ پر غور کیا۔ اس کے بعد تفتیش شروع ہوئی جو ۱۳ ماہ تک جاری رہی اور جس کے لیے انٹرپول...... (بین الاقوامی) کی خدمات حاصل کی گئیں اور آدھی دنیا کا سفر کیا گیا۔ انگلستان سے فرانس، اٹلی، جرمنی، کارسیکا، مغربی پاکستان، پرشین گلف، دبئی ہر جگہ پولیس افسر اور سراغ رساں گئے۔

چیف سپرنٹنڈنٹ امین جونز کی تفتیش کا نقطۂ آغاز وہ قبر تھی جس کا ذکر تار میں کیا گیا تھا۔ امین کو معلوم تھا کہ فرانسیسی حکام حادثے کے فوراً بعد لب سڑک قبر بنانے کی اجازت نہیں دے سکتے پھر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ حادثے میں فیروزہ ہلاک ہو جاتی اور حبیب اللہ بچ جاتا! اسے خراش تک نہ آتی۔ پھر پولیس کے ریکارڈ میں حادثے کی تفصیل اور مرحومہ کی تصویر ضرور ہوگی۔

انٹرپول سے رابطہ قائم کیا گیا اور فرانسیسی سراغ رسانوں کی ایک جماعت پیرس بھیجی گئی تاکہ رود بار پیرس کے سڑک کے کناروں پر قبر کا سراغ لگائے لیکن مبینہ قبر کا نشان نہ ملا۔ پولیس کے ریکارڈ میں حادثے کی تفصیل ملی نہ تصویر ملی۔ پولیس اس کے بارے میں بے خبر تھی۔

معاملے کو زیادہ پراسرار بنانے کے لیے حبیب اللہ بالکل غائب ہوگیا۔ یہ تو معلوم ہوگیا کہ وہ تو توز اور مارسیلز میں آیا تھا لیکن پھر اکیلا ہی وہاں سے چلا گیا۔

چیف سپرنٹنڈنٹ نے آکسفورڈ کی والٹن سٹریٹ میں تفتیشی دفتر قائم کیا اور سراغ رساں انٹونی سینا کی خدمات حاصل کیں۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا یہ افسر اردو بول لیتا تھا اور زیر تفتیش واردات کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرسکتا تھا۔ حبیب اللہ کے گھر والوں سے اچھی طرح پوچھ گچھ کی گئی۔ ہر ایک کی کہانی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف تھی۔ ایک بات ہر ایک نے دہرائی۔ حبیب اللہ بیوی کو سیر کروانے پیرس لے گیا۔ بدقسمت بیوی حادثے کا شکار ہوگئی اور پھر غمزدہ حبیب اللہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ وہ روپوش ہوگیا اور اب کبھی اس گھر میں نہ آئے گا۔ بیچارہ غم غلط کرنے کے لیے جانے کہاں کہاں پھر رہا ہوگا۔

چیف سپرنٹنڈنٹ امین ان لوگوں کے بیانو

سے بالکل مطمئن نہ ہوا۔ اس نے اس شخص سے پوچھ گچھ کی جو ۲۷ دسمبر کو دوبارہ انگلستان سے ''ڈوور ڈنکرک فیری'' پر سوار ہوا تھا اور فرانس گیا تھا۔ پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ حبیب اللہ اپنے بھائی فیض اللہ کے ہمراہ فرانس گیا تھا لیکن فیروزہ بدنصیب ہمراہ نہ تھی۔

بدنصیب لڑکی پر جو کچھ بیتا انگلستان ہی میں بیتا۔

مقامی ٹیلی ویژن سٹیشن کے تعاون سے فیروزہ کی تصویر بار بار دکھائی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اپیل کی گئی کہ جس کسی کو فیروزہ کے بارے میں کچھ معلوم ہو وہ پولیس کو مطلع کرے۔ کتنے ہی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے وسط اکتوبر تک فیروزہ کو ضرور دیکھا لیکن اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آئی۔

چیف سپرنٹنڈنٹ ایلن نے علاقائی تفتیشی دفتر میں پچاس آدمی متعین کیے۔ حبیب اللہ کے گھر میں کنکریٹ کا نیا فرش بچھایا گیا تھا۔ تفتیشی عملے نے اسے اکھاڑ پھینکا۔ یہاں سے کچھ نہ ملا۔ مارگریٹ روڈ سے قبرستان تک کی نہر کو کھنگالا گیا۔ غوطہ زن دریائے ٹیمز کے ایک حصے میں بھی اُتر گئے۔

جون ۱۹۶۹ء میں چیف سپرنٹنڈنٹ کو ایک گمنام خط ملا۔ اس خط کی راقمہ ایک نوجوان عورت تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے برٹی پلیس کے پائیں باغ میں ایک پاکستانی عورت کی ہلاکت کا منظر دیکھا۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ اس وقت پولیس کو مطلع نہ کر سکی۔

نام پتہ کچھ بھی تو درج نہ تھا خط پر۔ سکاٹ لینڈ یارڈ نے پندرہ ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر معمہ حل کر ہی لیا۔ انہوں نے برٹی پلیس اور گردونواح کے ہر باسی سے پوچھ گچھ کی۔ آکسفورڈ کے طلباء سے بات چیت کی۔ آخر ایک طالبعلم نے اس لڑکی کی تصویر مہیا کر دی جس نے گمنام خط لکھا تھا۔ لڑکی اب تک ڈری سہمی ہوئی تھی اور پولیس سے رابطہ کرنے سے کتراتی تھی۔ تصویر ملنے کے بعد خاتون لندن میں مل گئی۔ وہ خاصی مدت پہلے آکسفورڈ چھوڑ گئی تھی۔ ۳۶ گھنٹے کی پوچھ گچھ کے بعد تفتیش مکمل ہوئی۔

خاتون نے اپنی حفاظت کے لیے پولیس سے مدد طلب کی جو اسے فی الفور مہیا کر دی گئی۔ پولیس کے لیے وہ خاتون اس کی اپنی ذات سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی کیونکہ اس واقعے کی وہی تنہا گواہ تھی۔ اس کی حفاظت ہر قیمت پر کرنا ضروری تھا۔ زنانہ پولیس کی تین کانسٹیبلز اور تین سراغ رساں متعین کر دی گئیں۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ انہیں یقین تھا کہ حبیب اللہ نے اپنے عزیزوں کی مدد سے فیروزہ کو ہلاک کیا ہے لیکن اسے ثابت کرنا سہل نہ تھا۔

فیروزہ کی لاش کی تلاش کے سلسلے میں آکسفورڈ کے قریب ۷۰۰ ایکڑ کے رقبے کا کونہ کونہ چھانا گیا۔ لاش نہ ملی۔ یہ بھی قرار پایا کہ برٹی پلیس کے پہلو میں کچرے اور فضلے کا جو گڑھا ہے اسے کھدیڑا جائے۔ تخمینہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس پر ۷۵۰۰۰ پاؤنڈ صرف ہوں گے۔ بہرحال بہ احتیاط اسے جگہ جگہ سے کھودا اور کریدا گیا۔ قتل سے متعلق ۱۲۸ چیزیں جمع کی گئیں۔

نومبر ۱۹۶۹ء میں جا کر پولیس کو وہ بنیاد ملی جس پر حبیب اللہ کے خلاف قتل اور شریف اللہ اور فیض اللہ کے خلاف قتل کی سازش کرنے کے الزام میں مقدمہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ سراغ رسانوں اور تفتیشی افسران نے ساؤتھ ہال سے بریڈفورڈ تک پاکستان کے باشندوں سے جو پوچھ گچھ کی تو اس المیے کی کڑیاں مرتب ہو گئیں جو فیروزہ کی ہلاکت کے

بارے میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حبیب اللہ نے دوسری شادی کر لی تھی اور اس سلسلے میں فیروزہ کو جان دینی پڑی۔ اب وہ انگلستان کے انتہائی سخت گیر اور بے درد نظام عدل سے خائف ہو کر نئی بیوی کے ساتھ کراچی بھاگ گیا تھا۔ شریف اللہ اور فیض اللہ کو ان کی رہائش برٹی پلیس سے حراست میں لے لیا گیا اور ان پر قتل کی سازش کرنے اور قتل کی واردات چھپانے پر فرد جرم لگائی گئی۔ حبیب اللہ کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کیے گئے۔ چیف سپرنٹنڈنٹ امین جونز اور سراغ رساں کانسٹیبل سینا ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی آ گئے۔ انہیں یقین کامل تھا کہ وہ قاتل کے ہمراہ واپس آکسفورڈ آئیں گے۔

ادھر حبیب اللہ بڑا کائیاں تھا۔ اس نے اب تک ذرا غفلت نہیں برتی تھی۔ وہ اپنی نقل و حرکت کے بارے میں بڑا محتاط تھا۔ اسے برطانوی پولیس کی فرض شناسی اور مستعدی کا بھی علم تھا۔ کراچی پولیس نے برطانوی پولیس حکام سے پورا پورا تعاون کیا اور قاتل کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ٹیلی ویژن پر اپیل کی گئی۔ کراچی کے ایک اخبار کے پہلے صفحے پر اس کی تصویر بھی چھاپی گئی۔

اخبار کی تصویر کام کر گئی لیکن یہ سب کچھ بے سوچے سمجھے اور اتفاقاً ہوا۔ دو تاجر مال لے کر دبئی جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس وہ اخبار تھا لیکن تصویر کی خاطر نہیں، خبروں کی خاطر۔ اس زمانے میں اخبار بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا کیونکہ بھارت اپنی روایتی پاکستان دشمنی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور مشرقی پاکستان کو اپنا مقبوضہ علاقہ بنانے کے لیے سازشیں کر رہا تھا۔ دبئی جانے والے تاجر نے بھارتی سازشوں سے مطلع رہنے کی غرض سے اخبار لیا تھا۔ بھارت اسلامی ممالک میں بھی پاکستان کے خلاف سازش کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔

اخبار لیے یہ تاجر دبئی پہنچا۔ پرشین گلف میں دبئی کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ وہیں بڑے پیمانے پر تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ ایک تعمیراتی منصوبے پر سینکڑوں پاکستانی کام کر رہے تھے۔ دبئی پہنچتے پر تاجر نے اخبار کو بے کار جان کر تعمیراتی پراجیکٹ کے قریب ردی کے پیپے میں پھینک دیا اور اپنی راہ لی۔ ایک پاکستانی مزدور وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے اخبار اٹھا لیا تاکہ دو چار خبریں پڑھ لے۔ اکثر پاکستانی اخبار نہیں خریدتے۔ مانگ تانگ کر گزارا کرتے ہیں۔ اخبار اٹھاتے ہی اس کی نظر پہلے صفحے پر حبیب اللہ کی تصویر پر پڑی جو نمایاں طور پر چھپی تھی۔ وہ ایک دم ٹھٹکا۔ وہ اس چہرے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ یہ یقیناً حسین علی تھا جو شیخ کے تعمیراتی پراجیکٹ پر کرین آپریٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس نے فوراً مقامی پولیس کو آگاہ کیا۔ تفتیش پر پتہ چلا کہ حبیب اللہ اور حسین علی درحقیقت ایک ہی شخص ہے۔ اسے فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۰ء کو چیف سپرنٹنڈنٹ ایلین جونز دبئی آیا۔ اس نے جیل میں حبیب اللہ سے ملاقات کی۔ پوچھ گچھ کی۔ برطانوی پولیس افسر کے پاس اس کے خلاف اتنا مواد تھا کہ وہ منحرف نہ ہو سکا۔ بالآخر اس نے مندرجہ ذیل بیان پر دستخط کیے:

"میں نے اپنی بیوی فیروزہ کو ہلاک کیا تھا۔ یہ کرسمس سے پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ اچھی بیوی تھی۔ ایک صبح ہم میں جھگڑا ہو گیا۔ اسے یہ شکایت رہتی تھی کہ میں گھر پر اس کے پاس نہیں رہتا۔ میں نے اسے مارا۔ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میرے والد نے اسے ضرب لگائی۔ اب وہ چیخنے لگی۔ وہ بھاگی۔ میں نے پکڑ کر اسے پیٹا۔ اس کی چیخیں بند ہو گئیں اور وہ زمین پر گر گئی۔ میں نے اس کے منہ میں پانی ٹپکایا

تاکہ وہ ہوش میں آ جائے لیکن شاید اس کے اندر بہت زیادہ پانی چلا گیا۔ میں نے ڈاکٹر کو لانے کا خیال ظاہر کیا لیکن والد نے منع کر دیا کیونکہ بہت دیر ہو چکی تھی۔ والد نے یقین دلایا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں...... اس کے بعد جو کچھ کیا والد نے کیا۔

مجھے خبر نہیں کہ فیروزہ کہاں ہے۔"

قاتل کو آکسفورڈ لایا گیا اور آکسفورڈ کی عدالت میں اس کے، شریف اللہ اور فیض اللہ کے خلاف مقدمہ شروع ہوا۔ سرکاری وکیل بری این گبنز نے جسٹس برج کو بتایا کہ ملزمان نے جو لمبی لمبی کہانیاں سنائی ہیں وہ جھوٹ کے پلندوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ لوگ کسی منطق، کسی اصول شرافت اور کسی صحیح طریق کار کے پابند نہیں۔ ہر ایک نے ایک دوسرے کو بے خطا ثابت کرنے کی پوری کوشش کی۔ ہر ایک نے یہی بتایا کہ قتل کی واردات سرے سے ہوئی ہی نہیں۔

وکیل صفائی نے بھی من گھڑت قصہ سنا ڈالا۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ روئے زمین پر فیروزہ نام کی عورت کا قتل نہیں ہوا جس کے لیے تین بے خطا لوگوں کو پکڑا گیا۔ چونکہ پیرس کے حادثے کو بھی بے بنیاد اور غلط قرار دیا جا چکا تھا اس لیے وکیل صفائی نے بتایا کہ اس فرضی حادثے سے اہل خانہ کی آبرو بچائی گئی تھی۔ دراصل فیروزہ اچھے چلن کی عورت نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی اور پانچ سو پونڈ بھی چرا کر لے گئی۔

حبیب اللہ اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہو گیا جو اس نے دبئی کی جیل میں چیف سپرنٹنڈنٹ ایلین کو دیا تھا۔ وکیل صفائی نے اس کے فرار کے بارے میں بتایا کہ وہ خوفزدہ تھا۔ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے کا خوف تھا...... جب عورتیں اپنے شوہروں کو چھوڑ جاتی ہیں تو وہ خطرناک ہو جاتی ہیں۔ آشناؤں کے ساتھ مل کر شوہروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں۔ پاکستان میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ شادی شدہ عورتیں رستے بستے ہنستے کھیلتے گھر چھوڑ جاتی ہیں اور پھر جنون عشق میں اپنی پیاری اولاد، اپنے جاں نثار شوہروں کو مار ڈالتی ہیں۔

جج نے دبئی والے بیان کا حوالہ دیا تو وکیل صفائی نے کہا کہ یہ بیان مار پیٹ کر کے لیا گیا تھا۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس پر چیف سپرنٹنڈنٹ ایلین جونز نے احتجاج کیا کہ یہ سراسر غلط ہے۔ پولیس افسران نے مہینوں تک تفتیش کی، سینکڑوں لوگوں سے پوچھ گچھ کی۔ ایک ایک واقعے کی حقیقت معلوم کی۔ معمولی سے معمولی تفصیل پر غور کیا۔ جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ آدھی دنیا کا سفر کیا۔ کیا اس کے بعد ڈنڈے کی کسر رہ گئی تھی؟ یہ الزام نہایت توہین آمیز اور تکلیف دہ ہے۔ میں پوری ذمہ داری، احساس فرض شناسی اور دیانتداری سے کہتا ہوں کہ ملزم کو طمانچہ تک نہیں مارا گیا۔ واقعات ایسے ہیں کہ دبئی جیل کے بیان کو کسی طرح غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سرکاری وکیل نے نہایت مدلل طریقے سے ملزمان کے کردار پر روشنی ڈالی۔ جیوری نے ساڑھے چار گھنٹے غور و خوض کرنے کے بعد حبیب اللہ کو قاتل قرار دیا۔ شریف اللہ اور فیض اللہ پر حقیقت حال پر پردہ ڈالنے اور عدل و انصاف کی راہ میں روڑا اٹکانے کا جرم عائد کیا۔

قتل کی واردات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد مجرموں کو سزا ہوئی۔ حبیب اللہ دس سال کے لیے اور شریف اللہ ڈھائی سال کے لیے جیل گیا۔ فیض اللہ کو بورسٹل جیل بغرض اصلاح بھیجا گیا۔

ریالوں کی بارش

اقبال تبسم

میں کبھی اس کار کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنے پاؤں میں بکھرے ہوئے نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ میں سڑک پر بکھرے نوٹوں کو اٹھا نہیں رہا تھا......

سعودی عرب میں ایک پاکستانی کے ساتھ پیش آئے عجب ماجرے کی روداد......

اس پر اچانک نوٹ ''برسنے'' لگے تھے!

اس وقت مجھے سخت حیرت ہوئی جب میں ''بلد'' کی ایک سڑک پر خراماں خراماں ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک خوبصورت سی کار نے تیزی کے ساتھ بریک لگائے اور میرے پاس آن کھڑی ہوئی اور پھر جس تیزی سے وہ کار میرے پاس پہنچی تھی اسی تیزی سے اس میں سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے چلا کر کہا ''پاکستان'' ......اور سو ریال کے نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف پھینک دی اور پھر اسی تیزی سے کار کے بریک چرچرائے اور نہایت سبک رفتاری سے کار آگے بڑھ گئی اور میں بھونچکا سا ہو کر کار کو تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔ پھر میں نے اپنے

پاؤں کی طرف دیکھا جہاں نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پھر کار کی طرف غیر یقینی نظروں سے دیکھا کہ یہ کیا کارروائی ہے کہ ایک کار والا میرے قریب نوٹ پھینک کر چلا جائے! لیکن اب کار نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور میں اپنی جگہ پر متحیر کھڑا تھا۔ میرے لئے یہ اچنبھے کی بات تھی۔ میں چند لمحے پہلے اپنے ساتھ بیتے واقعہ کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ صورت کیا ہے؟ یہ کارروائی کیا ہے؟

ایک کار کا اچانک میرے پاس آنا، اس میں ڈرائیور کا مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے تقریباً چیخ کر پکارنا اور پھر میری طرف نوٹ پھینک کر اس طرح بھاگنا جیسے وہ نشے میں ہو یا اللہ نہ کرے کہ وہ کسی راہگیر پر اچانک فائر کر کے بھاگا ہو! حیرت ہے، اچنبھا ہے، آخر یہ سب کیا ہے......؟ اور کیوں ہے......؟ میں سوچ رہا تھا......

بلد میں میرے قیام اور رہائش کی کہانی بھی دلچسپ ہے جو آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نیا نیا سعودی عرب آیا تھا اور اپنے پاکستانیوں کے ڈیرے پر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ڈیرے پر رہنے کا کرایہ بھی دینا پڑتا تھا اور کرایہ بھی خاصا تھا اس لئے میں ذرا مشکل میں تھا کہ ایک تو بیکاری پھر کھانے پینے کے اخراجات اور پھر کرایہ بھی دینا پڑتا تھا اور بجلی کا بل بھی۔

ایک روز میں بلد میں گھوم رہا تھا کہ مجھے ایک پاکستانی راہگیر مل گیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اسے اپنے ڈیرے کی مشکلات بتائیں تو وہ سب کچھ سُن کر مجھے کہنے لگا ''آپ میرے ساتھ آیئے۔''

''کہاں......؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ بس مطمئن ہو کر میرے ساتھ چلیں میں ابھی آپ کی رہائش کا بالکل مفت بندوبست کر دوں گا......''

اور میں مفت رہائش کا سُن کر چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے بلد سے ایک فرلانگ دور عین سمندر کے کنارے پر لے گیا۔ میں عرض کر دوں کہ جدہ شہر ایک دم سمندر کے کنارے پر ہے۔ اب ہم سمندر کے کنارے پر واقعہ ایسے علاقے میں تھے جہاں پر سمندر کے کنارے کنارے بے شمار اور نہایت قیمتی سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے کچرے کی طرح بکھرا قیمتی سامان دیکھ کر حیرت سے کہا......

''یہ کیا ہے؟......''

جواب ملا ''یہ قیمتی سامان بیکار سمجھ کر یہاں کے دکاندار اور عمارتوں کے ٹھیکیدار یہاں پھینک جاتے ہیں۔''

''کیا......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو پاکستانی ساتھی کہنے لگا ''آپ حیران نہ ہوں، یہ کروڑوں روپے کا سامان سعودی ہمارے ہی لئے پھینکتے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ آپ یہاں سے درمیانے سائز کے دو بانس اُٹھا لیں اور دو میں اُٹھا لیتا ہوں اور وہ سامنے دیکھو وہ ذرا سا دُور جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ ان ''ہٹس'' میں کرایوں سے بچنے کے لئے صرف پاکستانی ہی رہتے ہیں۔ خود میں نے بھی اپنی رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے یہیں پر ایک جھونپڑی بنا رکھی ہے اور وہیں رہتا ہوں۔ نہ کرایہ دینے کی فکر نہ بجلی کا بل۔ ایک مٹی کے تیل کی لیمپ خرید کر رکھی ہوئی ہے۔ مٹی کا تیل نصف ریال کا پورا ایک گیلن بھرا ہوا مل جاتا ہے جو کم از کم چار ماہ سے پہلے خالی نہیں ہوتا لہٰذا آپ کے لئے بھی مفت رہائش کا بندوبست ابھی کئے دیتے ہیں اور ہاں آپ کو یہ جان کر شاید مسرت ہوگی کہ وہاں جھونپڑیوں

میں زیادہ تر سندھی رہتے ہیں اور بمعہ اپنے بچوں کے رہتے ہیں۔"

"لیکن وہاں پر پانی کی مشکل تو ہوگی؟" میں نے مشکل کا اظہار کیا تو کہنے لگا "صبح سویرے آپ نے صرف منہ ہاتھ ہی دھونا ہے نا؟...... اس کے لئے آپ ایک گیلن پانی بھر کر لے آیا کیجئے گا۔ دو تین دن آسانی سے آپ کے نکل جایا کریں گے۔"

"اور نہانے دھونے کا کیا ہوگا......؟" میں نے سوال کیا تو جواب ملا "جہاں سے آپ پانی بھر کر لائیں گے وہیں نہا لیجئے گا یا کپڑے دھو لیجئے گا، کوئی منع نہیں کرے گا۔"

"زبردست......" میں نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا اور مناسب سے لمبے لمبے چار بانس ہم دونوں نے مل کر اٹھا لئے اور "جھونپڑوں" کی طرف چل دیئے۔ یہاں پر پاکستانی ساتھی کی جھونپڑی کے پاس چاروں بانس رکھے اور پھر واپس سمندر کنارے پہنچ گئے۔ اب پہلے ہم نے "کیلوں" کی تلاش کی۔ آپ کو یہ جان کر حیرانگی ہوگی کہ ایک جگہ پر پڑے ہوئے دو تین سو کیل بھی ہمیں مل گئے۔ ایک سو کے قریب ہم نے کیل اپنی اپنی جیبوں میں ٹھونسے اور اب ایک جگہ پر پڑے ہوئے کارٹن کے 4 بڑے بڑے گتے اُٹھائے۔ ایک اور جگہ سے ہتھوڑا نما لوہا سا اٹھا لیا اور ساتھی کی کٹیا پر لے آئے۔ اب ہم دونوں نے مل کر کچی زمین میں چار گڑھے کھودے۔

ان میں بانسوں کے سرے دبا کر انہیں مضبوطی سے کھڑا کیا پھر ان پر تین اطراف سے کاٹن کے گتے کیلوں کے ساتھ مضبوطی سے ٹھونک دیئے۔ بعد ازاں ان چاروں بانسوں پر دو بڑے بڑے گتے ڈال کر چھتیں ڈال دیں اور یوں تقریباً جھونپڑی تیار ہوگئی۔ اب صرف دروازہ لگانا تھا۔ ایک گتے کو کاٹ کر دروازہ بنایا اور کیلوں سے ٹھونک دیا۔ اس طرح دروازہ بھی تیار ہوگیا اور یہی دروازہ چوتھی دیوار بھی تھا۔ چلیں جی میری رہائش کے لئے مفت کی جھونپڑی تیار تھی۔ اس کے تیار ہو جانے پر میں نے دل کی گہرائیوں سے پاکستانی کا شکریہ ادا کیا۔ اب دروازے پر کنڈی اور تالہ لگانا باقی تھا۔ وہ میں بازار سے خرید لایا تھا اور انہیں بھی "کٹیا" پر نصب کر دیا تھا۔ لیجئے جی ایک پاکستانی کی معرفت میری مفت کی رہائش کے لئے میرا ہٹ تیار تھا جس پر ہمارا پورا دن لگ گیا تھا۔ بس پھر کیا تھا دوسرے ہی روز میں نے کرائے کے مکان سے اپنے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کھانے پینے، بجلی اور کرائے کا حساب کتاب کر کے اپنا سامان اٹھایا اور نئی رہائش گاہ میں لے آیا اور اب میں مفت کی رہائش میں آباد تھا اور تقریباً مزے میں تھا۔ پڑوسیوں سے بھی میرے اچھے تعلقات بن گئے تھے۔

اب میں واپس اس عجیب واقعہ کی طرف آتا ہوں۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں بلد یعنی شہر کی ایک بڑی سڑک مدینہ منورہ روڈ پر ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک نئی اور خوبصورت سی کار والے نے مجھے "پاکستانی" کہہ کر تیز آواز میں پکارا اور میں نے بھی لپک کر اس کار کی طرف دیکھا۔ جونہی میں نے دیکھا اس نے سرعت کے ساتھ میری طرف نوٹوں کی ایک گڈی پھینک دی اور جس سرعت کے ساتھ وہ میرے قریب آیا تھا اسی سرعت کے ساتھ وہ آگے بڑھ گیا اور میں بھونچکا سا اس کار کو پیچھے سے جاتے ہوئے دُور تک دیکھتا رہ گیا۔ میں کبھی اس کار کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنے پاؤں میں بکھرے ہوئے نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ میں سڑک پر بکھرے نوٹوں کو اٹھا نہیں رہا تھا۔ آپ کو یہ جان کر بھی حیرت ہوگی کہ اطراف کے دکاندار بھی میری طرف یا نوٹوں کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ آپ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ

اپنے پاؤں میں بکھرے ہوئے نوٹ میں اٹھا کیوں نہیں رہا تھا......؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ سعودی عرب کا قانون بہت سخت تھا اور آج بھی بہت ہی سخت ہے۔ چور کا فوراً ہی ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور اگر چورِ چوری کر کے بھاگ جائے اور بعد میں پکڑا جائے تو اس چور کا ایک ہاتھ پاؤں سمیت کاٹ دیا جاتا ہے اور یہ عمل میں نے خود چوک میں کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ہر آنے والے جمعہ کو سعودی ریڈیو اور ٹی وی سے باقاعدہ یہ خبر نشر ہوتی تھی کہ فلاں چوک میں آج جمعہ کی نماز کے فوراً بعد دو چوروں کے ہاتھ یا پاؤں کاٹے جائیں گے یا پھر زانیوں کی گردنیں اُتاری جائیں گی اور اس پر باقاعدہ عمل بھی ہوتا تھا۔ کسی بھی بڑے چوک میں جمعتہ المبارک کی نماز کی ادائیگی کے فوراً بعد سینکڑوں لوگوں کے سامنے چوروں کے ہاتھ اور پاؤں یا پھر گردن کاٹ کر وہ اعضاء وہیں چوک میں نصب بانسوں کے ساتھ باندھ کر لٹکا دیئے جاتے تھے اور وہ تقریباً دو دو تین تین گھنٹے وہاں لٹکے رہتے تھے۔ حد یہ بھی ہے کہ دیکھنے والے (تماشبین) گردنیں، ہاتھ اور پاؤں کٹ جانے پر بلند آواز سے تالیاں بجاتے تھے۔"

بس ان ہی سخت قوانین سے گھبرا کر میں سڑک پر بکھرے ہوئے نوٹوں کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ آخر کافی انتظار کے بعد میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سڑک پر بکھرے نوٹ جمع کئے اور انہیں اپنے ہاتھ میں تھامے کھڑا ہو گیا۔ اب پھر میں خوف کے مارے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی شخص یا خود پولیس والا مجھے دیکھ تو نہیں رہا یا مجھے کسی نے نوٹ جمع کرتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو کہ میں لے کر چل پڑوں اور وہ پولیس کا چھاپہ ڈلوا کر مجھے پکڑوا دے۔ کئی قسم کے وسوسے، اندیشے جنم لے رہے تھے۔ دل میں ہلچل سی پیدا ہو رہی تھی۔ خوف کے مارے میری گھگھی بندھ رہی تھی۔ ایک دہشت سوار تھی کہ کہیں نوٹ چرانے کے الزام میں دھر نہ لیا جاؤں اور اللہ نہ کرے کہ ہاتھ یا پاؤں کٹوا بیٹھوں لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ سو میں نوٹ ہاتھ میں تھام کر وہاں سے نہایت سلو موشن میں نکل پڑا کہ مبادہ کوئی بھی فرد پیچھے سے پکڑنے والا نہ آ جائے یا خود کار والا ہی مجھے پکڑنے کے لئے آ جائے اور کہہ دے کہ میں نوٹ اٹھائے کہاں جا رہا ہوں؟......!

بہرکیف ایسی کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ امن ہی امن رہا۔ میں خیریت کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ دہشت میرے سر پر اب بھی سوار تھی کہ اللہ نہ کرے کہ کوئی بھی شخص یا پولیس والا میرا پیچھا کرتے ہوئے میرے ڈیرے تک پہنچ جائے اور میں پکڑا جاؤں اور وہ بھی رنگے ہاتھوں...... لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ سب کچھ ٹھیک رہا۔

اب میں نے اپنے نئے گھر کے تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنا تھا کہ مجھے اچانک نیا جھٹکا لگا۔ جی ہاں باقاعدہ جھٹکا۔ میرے دروازے کے اندر کی طرف ایک سو ریال کا نیا نکور نوٹ پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر میرے جسم میں جھرجھری سی پھیل گئی۔ بجائے خوشی کے میرے جسم و جان میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟...... یہ کیسا جادو ہے، کیا عمل ہے کہ آج ہر طرف سے نوٹ ہی نوٹ برس رہے ہیں، کیا یہ غیبی مدد ہے یا کچھ اور ہے؟...... یا اللہ! یہ کیسے بھید ہیں کہ آج نوٹ ہی نوٹ مل رہے ہیں۔ کوئی آواز دے کر مجھے نوٹ دے رہا ہے اور کوئی دروازے میں ڈال گیا ہے؟ حیرت ہے..........؟

بہرحال میں نے دروازے میں پڑا نوٹ بھی اُٹھا لیا۔ اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا کہ مبادہ صبح جب میں ڈیوٹی پر جا رہا تھا تو میں نے اپنے تن کے کپڑے تبدیل

کیے تھے مبادہ اس وقت میری ہی جیب سے گرا ہو؟ لیکن نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ایک تو یہ کہ میری جیب میں نوٹ پورے تھے دوسرے یہ کہ یہ نوٹ بالکل نیا تھا جیسے ابھی ابھی بینک سے نکلوایا گیا ہو اور تیسرے اس سو ریال کے نوٹ میں کوئی تہہ یا بل نہیں تھا۔ بہر کیف اس سو ریال کے نوٹ کو میں نے الگ رکھ کر پہلے سڑک سے اٹھائے گئے نوٹ گنے تو وہ پورے چار ہزار ریال تھے اور ایک سو ریال الگ تھے۔ اب میرے دل کی دھڑکن نارمل ہو چکی تھی لہٰذا میں نے چار ہزار ایک سو ریال کو خوشی خوشی اپنی جیبوں میں ٹھونسا۔

آپ حیران ہوں گے کہ دوسرے روز میں سارا دن گھوم گھام کر واپس اپنے ڈیرے پر آیا اور دروازہ کھولا تو پھر ایک سو ریال کا نیا نوٹ پڑا ہوا تھا۔ تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے روز بھی تقریباً ایسا ہی ہوا۔ کبھی دو سو ریال ملتے کبھی تین سو اور کبھی پانچ سو۔ اب تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ معاملہ کیا ہے؟ یہ نوٹ کون پھینک جاتا ہے؟ دوسری طرف میں اللہ کی طرف سے اس غیبی مدد پر بہت خوش بھی تھا لیکن جب مجھ پر ان نوٹوں کا راز افشاء ہوا، نوٹوں کے جھونپڑیوں سے برآمد ہونے کا بھید کھلا تو عقل دنگ رہ گئی کہ سعودی عرب میں لوگ اتنے دولت مند ہیں اور ان کے پاس اتنی دولت ہے کہ سڑکوں پر پھینکتے پھرتے ہیں۔ جھونپڑیوں میں ڈالتے پھرتے ہیں۔ لٹاتے پھرتے ہیں۔ حیرت ہے......؟

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ سعودی عرب میں غریب نہیں ہیں۔ سعودی عرب میں بہت سے لوگ امیر ترین ہیں مگر جو غریب ہے وہ انتہائی غریب ترین ہے۔ مجھے اس بات کا اس طرح پتہ چلا کہ میں جدہ میں جرمن کمپنی کے اسمبلنگ پلانٹ میں مینٹی نینس فورمین تھا۔ یہاں پر نئے ٹرک بنتے تھے اور روزانہ آٹھ گھنٹوں کے اندر چوبیس ٹرک مکمل ہو کر باہر نکلتے تھے۔ روزانہ بارہ بجے سے ایک بجے تک کھانے کا وقفہ ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے کھانے کے لئے صبح ہی اپنے گھر سے کھانا ساتھ لے آیا کرتا تھا اور دوپہر کے وقفے کے دوران کھا لیا کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ایک سعودی بھی میرے ماتحت بھرتی ہو گیا۔ اب بارہ بجے کے وقفے کے دوران میں نے اپنا کھانا کھولا تو سعودی بھی میرے پاس آ بیٹھا اور میرے کھانے کی طرف نادیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بھی اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسی انتظار میں تھا کہ میں اسے کھانے کی دعوت دوں اور وہ کمبل ہو جائے اور وہ واقعی ہی میں کمبل ہو گیا کہ اس کی روزانہ کی روٹین بن گئی تھی کہ اس نے میرے ساتھ ہی کھانا کھانا ہے۔ چھٹے ساتویں روز میں نے اس سے کہہ دیا ”اخویا (بھائی) میں صرف اپنے لئے کھانا لاتا ہوں، آپ روزانہ شریک ہو جاتے ہیں اس طرح میں بھوکا رہ جاتا ہوں۔“

بس میرا اتنا کہنا تھا کہ دوسری طرف تو گویا بھونچال آ گیا۔ اس نے اسی لمحے دھڑا دھڑ رونا شروع کر دیا۔ میں نے قدرے گھبرا کر پوچھا ”کیا ہوا ہے......؟ کیوں رونے لگے ہو؟“ جواب میں کہنے لگا ”یا رئیس (فورمین) آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ یقیناً بھوکے رہ جاتے ہوں گے لیکن میں کیا کروں......؟ میری بیوی بہت بُری ہے۔ میں اسے صبح سوتے سے اٹھاتا ہوں تو آگے سے مجھے لات مارتی ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے، ناشتہ بنا کر دو تو مجھ سے سخت لہجے میں ”بطال کلام“ (گالی گلوچ) کرتی ہے۔ کہتی ہے ”یلہ براراہ“ یعنی نکلو باہر، دفع ہو جاؤ۔“

میں نے ایک دفعہ ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کی تو اس نے بھی مجھے تھپڑ مار دیا۔

”تو اپنے ماں باپ کو بتاؤ......“ میں نے کہا۔ اس پر وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور کہنے لگا

"میرے ماں باپ نے اس کی زبردست بدتمیزیوں کی بنا پر ہمیں کرائے کا علیحدہ گھر لے دیا تھا لیکن میری بیوی کو اب بھی امن نہیں۔ اب بھی مجھ سے لڑتی رہتی ہے، میں نے اپنے ماں باپ سے اپنی بیوی کی شکایت کی تھی کہ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ میرے ماں باپ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ان کے بھی گلے کو آ گئی۔ ان کے ساتھ بھی لڑنے مرنے کو تیار ہو گئی تھی۔" اس کے بعد میں نے کہا "اسے طلاق دے دو۔"

جواب میں کہنے لگا "میں نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا کہ میں اسے طلاق دے دیتا ہوں لیکن وہ مجھے کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہ کرنا اس لئے کہ ہم نے لڑکی کے ماں باپ کو بیس ہزار ریال دیئے ہیں وہ واپس کہاں سے ملیں گے بلکہ اُلٹا حق مہر بھی دینا پڑے گا۔ سب سے زیادہ مشکل یہ ہو گا کہ تمہارا نیا نکاح پڑھانے کے لئے مزید بیس ہزار ریال کہاں سے لائیں گے؟ ہم تو غریب لوگ ہیں پہلے بھی لڑکی کے باپ کو دینے کے لئے بیس ہزار ریال پتہ نہیں کیسے کیسے اور کہاں کہاں سے جمع کئے تھے۔"

"یعنی تمہارے یہاں لڑکیاں فروخت ہوتی ہیں؟"

"ہاں...... حلوہ "اختک" پچاس ہزار ریال شویئے حلوہ تیس ہزار ریال کی اور معافی حلوہ بیس ہزار ریال کی......"

(خوبصورت ترین لڑکی پچاس ہزار ریال کی، کم خوبصورت تیس ہزار ریال کی اور اس سے ذرا کم خوبصورت لڑکی بیس ہزار ریال کی)۔

"اور سعودی عرب میں غربت بھی ہے؟"

"بہت زیادہ...... خود میں بہت غریب ہوں۔"

"حیرت ہے......؟" میں نے کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔

میں کہہ رہا تھا کہ سعودی باشندوں میں اس قدر امیر اور دولت مند لوگ بھی ہیں کہ سڑکوں پر راہگیروں پر نوٹ لٹاتے پھرتے ہیں اور جھونپڑیوں کے اندر سے بھی نوٹ ملتے ہیں، ایسے ہی لوگوں نے مجھے حیرت میں مبتلا کر رکھا تھا......؟ لیکن اب ان نوٹوں کا بھید کھلا تھا کہ میرے جھونپڑے میں اور سب ہی جھونپڑوں میں نوٹ کہاں سے آتے تھے......

ہوا یوں کہ اس روز جمعہ کے دن کی چھٹی تھی۔ سبھی پڑوسی اپنے اپنے جھونپڑوں میں تھے لہٰذا میں نے اپنے ایک پڑوسی سے پوچھا "یار یہ میرے جھونپڑے سے روزانہ ہی نوٹ برآمد ہوتے ہیں یہ کہاں سے آ جاتے ہیں؟"

جواب ملا "یہ آپ ہی کی جھگی میں سے نہیں ہم سب کی جھگیوں سے برآمد ہوتے ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے وضاحت چاہی۔

اس پر جواب ملا "یہ نوٹ سعودی ہمیں زکوٰۃ کا حقدار سمجھ کر دیتے ہیں۔"

"یعنی یہ زکوٰۃ کی رقم ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اور جواب ملا "جی ہاں یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، سعودی باشندوں کو بخوبی علم ہے کہ ہم غریب پاکستانی لوگ یہاں اس مخصوص مقام پر جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور رہ ہمیں مستحق سمجھ کر اپنی زکوٰۃ ہمیں دے جاتے ہیں۔" اس پر میں نے پڑوسی کو کار والا واقعہ سنایا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو کہنے لگا "وہ بھی زکوٰۃ ہی کے پیسے ہوں گے اور کار والے کو کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں مل رہا ہو گا لہٰذا وہ چلتے چلتے زکوٰۃ کی رقم تمہاری طرف پھینک گیا۔"

اور یہ سن کر میں نے فوراً ہی جھگی چھوڑ دی اور مرسڈیز اسمبلنگ پلانٹ کی کالونی میں آ گیا کہ دراصل میں زکوٰۃ کا حقدار نہیں تھا۔

......❁......❁......

کنویں کا مینڈک

فہمیدہ کوثر

"لیکن قوت ارادی بہت بڑی چیز ہے" پہلا پرامید لہجے میں بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کنویں سے ہر حالت میں باہر نکلنا چاہتے ہو" دوسرے نے پوچھا۔ "ہاں...... یہاں میرے لیے مایوسیت ہے، میں زندگی اور روشنی کی طرف بڑھنا چاہتا ہوں۔"

ایک شخص کی کہانی جسے "روشنی" کی تلاش تھی

"مجھے باہر نکلنا ہے" پہلا شخص غصے سے بولا۔

"باہر نکلو گے" دوسرے نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" پہلے نے جواب دیا۔

"نامعلوم ہمیں کتنا عرصہ بیت گیا ہے اس اندھیرے کنویں میں" پہلا انتہائی کرب سے بول رہا تھا۔

"تم یہاں سے کبھی نہیں نکل سکو گے" دوسرے شخص نے پہلے شخص کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"کوشش ہی انسان کو کامیاب بناتی ہے" پہلا شخص آنکھوں میں امید کی کرن لئے بولا۔

"بفرض محال اگر تم نکل بھی گئے تو باہر کے ماحول میں کبھی ایڈجسٹ نہیں کر سکو گے۔"

دوسرے نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن یہاں کی بدبو...... اور تعفن سے دماغ پھٹنے لگا ہے۔ اب میں مزید کرب سے نہیں گزر سکتا" پہلے شخص نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

"دیکھو......تم جیسے کتنے لوگ یہاں پر موجود ہیں لیکن وہ یہاں کی بدبو اور تعفن کے عادی ہو چکے ہیں۔ میری بات مان جاؤ۔ تمہیں کبھی بھی باہر کی فضا راس نہ آئے گی۔" دوسرا شخص بولا۔

"ضروری نہیں کہ میں بھی عادی ہو جاؤں۔ مجھ میں اور ان میں فرق ہے۔ یہ سب یہاں آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہیں۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔" پہلے شخص نے غصے سے کہا۔

دوسرا شخص طنزیہ ہنس پڑا اور بولا۔

"سنو......تم نے وہ کہاوت سنی ہے کہ ایک بستی کا سردار مارا گیا، سب لوگ فکر مند ہوئے کہ مستقبل کا سردار کسے بنایا جائے۔

ان لوگوں کا دستور تھا کہ علی الصبح شمال کی جانب سے جو شخص بستی میں داخل ہوتا تھا، اسے سردار بنالیا جاتا تھا۔

چنانچہ سب لوگ صبح ہونے سے پہلے شمال کی جانب چل دیئے۔

علی الصبح ایک گداگر شمال کی جانب سے بستی میں داخل ہوا اور اس گداگر کو باہمی مشورہ اور رضامندی سے سردار بنالیا گیا۔

گداگر کے وارے نیارے ہو گئے، دن رات عیش وعشرت ونشاط کی محفلوں میں گزرنے لگے۔ نہ فکر رہا نہ فاقہ۔

ایک دن اچانک وہ اپنی عادت سے مجبور ہوا۔ اس کی مانگنے کی عادت بچپن سے تھی۔

اب وہ اپنی عادت کو محل میں رہتے ہوئے پورا نہیں کرسکتا تھا۔

وہ سارا دن پریشان رہا۔

اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے رات کو بھیس بدلا اور محل سے باہر نکل گیا۔

وہ سات گھروں میں گیا، وہاں سے اپنے کھانے کے لیے کچھ مانگا۔ دہلیز پر بیٹھ کر پیٹ بھرا اور واپس محل آ گیا۔

اس کا یہ روز کا معمول بن گیا۔

محل کے بڑے بڑے عہدیدار فکرمند ہوئے کہ ان کا سردار کہاں جاتا ہے۔

آخرکار انہوں نے بھید پا لیا کہ چونکہ سردار ماضی میں گداگر رہ چکا ہے اسی لیے وہ عادت سے مجبور ہے۔

اب تمام امراء و روسا نے سردار پر پابندی لگا دی کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ چند محافظ اس کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیئے گئے۔ چند دن گداگر نے عافیت میں گزارے۔

پھر اس کی طبیعت اچاٹ ہوئی، باہر پہرہ تھا۔ وہ اب کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا، اسے ایسی سرداری سے بھی بیزاری محسوس ہوئی کہ جس میں اس کو اپنی عادت ترک کرنا پڑی تھی۔ پھر اس نے حل تلاش کر لیا۔

اس نے اپنے محل میں سات ڈیوڑھیاں بنوائیں، ان میں سات طاق بنوائے اور کنیزوں کو حکم دیا کہ شام کے وقت ہر طاق میں ایک روٹی رکھ دی جائے۔

جونہی رات ہوتی اور تمام لوگ محو خواب ہوتے، گداگر سردار اُٹھ بیٹھتا۔ ہر طاق پر جا کر روٹی مانگتا اور اُٹھا کر کھا لیتا، اس طرح وہ اپنی عادت پوری کر لیتا۔

اس کے درباری اس کی عادت سے تنگ آئے اور اسے سرداری سے علیحدہ کر دیا اور اسے واپس شمال کی طرف بھیج دیا اور یوں وہ جہاں سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔

پہلا شخص بڑی دلچسپی سے دوسرے شخص کی کہاوت سن رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ہم سب یہاں پر کتنے عرصہ سے رہ رہے ہیں۔ اس ماحول کے عادی ہو چکے ہیں۔"

"ہم اپنی عادت نہیں بدل سکتے۔ باہر جا کر ہم لوگ چین کی نیند نہیں سو سکیں گے۔"

دوسرے نے پہلے شخص کو سمجھایا۔ "اب تمہیں ایک کہاوت سناتا ہوں" پہلا بولا۔

"یہاں سے کوسوں میل دور ایک قبیلہ تھا۔

وہاں کے لوگ فسق و فجور کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کے ہاں نیکی بدی کی تمیز نہ رہی تھی۔ برائی اور برائی کرنے والے کو افضل سمجھا جاتا تھا۔

شرافت روپے پیسے میں تولی جاتی تھی اور خاندانیت کا تصور ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

ان لوگوں میں سے چند لوگ اکٹھے ہوئے اور ولی اللہ کے پاس گئے اور اصلاح احوال کے لیے مشورہ لینے لگے۔

ولی اللہ نے اپنے علم کے زور سے بتایا کہ اس ریاست کے جنوب سے ایک نیک آدمی داخل ہوگا اور وہ اپنی طاقت سے تمام معاملات کو درست کرلے گا۔

اب قبیلے کے تمام لوگ صبح سویرے بستی کی سرحد پر پہنچ گئے اور نیک آدمی کی راہ تکنے لگے۔

لیکن کافی دنوں تک وہ نیک آدمی نہ آیا۔

وہ تمام لوگ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ جس روز وہ مایوس ہو کر لوٹے اسی روز جنوب کی طرف سے چند نامعلوم لوگوں نے ریاست پر حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام علاقہ فتح ہو گیا۔

اگلے روز نامعلوم حملہ آوروں کے سردار کو قبیلے کا سردار بنایا گیا۔

اس سردار نے تمام تلواریں پھینکنے والوں کو امان دی۔

عورتوں اور بچوں کے احترام کا حکم دیا اور تمام لوگ جو برائی کے عادی ہو چکے تھے، نیکی کی راہ پر چل دیئے۔ تمام لوگ اس سردار کو دیوتا بنا کر پوجنے لگے۔"

پہلا شخص کہاوت ختم کر کے پرامید نظروں سے دوسرے شخص کی جانب دیکھنے لگا۔

دوسرا خاموش رہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی قوت فیصلہ سے اور نیک ارادے کی وجہ سے بہت بڑی تبدیلی لا سکتا ہے" پہلا شخص بولا۔

"نہیں" دوسرا شخص بولا۔

"نہیں؟" پہلا شخص حیران ہو کر بولا۔

"کسی بھی بڑی تبدیلی کے لیے اجتماعی قوت کی

جائزہ

ایک غریب لڑکا محلے کی ایک دکان پر پہنچا اور دکاندار سے ٹیلیفون کرنے کی اجازت مانگی اور فون کرنے لگا۔ دکاندار وہ باتیں سنتا رہا...... لڑکا کہہ رہا تھا "وکیل صاحب! آپ کو باغ کی صفائی کے لئے کسی لڑکے کی ضرورت تو نہیں؟...... اچھا کوئی لڑکا پہلے ہی آپ کے پاس کام کرتا ہے...... تو آپ اس کے کام سے خوش ہیں؟...... اچھا جناب۔ شکریہ۔"

دکاندار نے لڑکے سے کہا "یہ تو اچھا نہ ہوا۔ تمہیں نوکری نہیں ملی۔"

"میں تو وکیل صاحب کے ہاں ملازم ہوں۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "ذرا اپنے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔"

☆☆☆

ضرورت ہے، فرد واحد کبھی بھی بڑی طاقت سے نہیں لڑ سکتا" دوسرا شخص بولا۔

"لیکن قوت ارادی بہت بڑی چیز ہے" پہلا پرامید لہجے میں بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کنویں سے ہر حالت میں باہر نکلنا چاہتے ہو" دوسرے نے پوچھا۔

"ہاں...... یہاں میرے لیے مایوسیت ہے، میں زندگی اور روشنی کی طرف بڑھنا چاہتا ہوں۔"

....

"تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" پہلے شخص نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ تم ہم سے مختلف ہو" مجمع میں سے ایک آواز آئی۔

"مختلف ہونا تو کوئی جرم نہیں ہے" پہلے شخص نے کہا۔

"لیکن مختلف ہونا مشکوک ہونے کو ظاہر کرتا ہے اور تم مشکوک ہو" مجمع سے پھر آواز آئی۔

"میں اس اندھیرے کنویں میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میرا وہاں دم گھٹتا تھا۔"

"میں روشنی کی تلاش میں باہر آیا ہوں" پہلے شخص نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے روشنی کو پا لیا ہے؟"

مجمع میں سے ایک اور آواز آئی۔

"میرا خیال ہے"...... پہلا شخص بولا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارا واہمہ ہو" مجمع میں سے آواز آئی۔

"نہیں، یہ میرا وہم نہیں ہے" پہلا شخص بولا۔

"لیکن تم نے اپنی روایات سے بغاوت کی ہے اور ہمارے ہاں روایات سے خلاف ورزی کی سزا موت ہے" مجمع میں سے آواز ابھری۔

"لیکن میں روشنی کی طرف آنا چاہتا ہوں اور روشنی کی تلاش روایات سے خلاف ورزی نہیں" پہلے شخص نے دلیل دینا چاہی۔

"لیکن ہم اسے بغاوت اور ایسے شخص کو باغی کہتے ہیں" مجمع میں سے پھر آواز آئی۔ پہلا شخص سہم گیا۔

"اب بتاؤ کہ تمہاری آخری خواہش کیا ہے" مجمع میں سے ایک بولا۔ پہلا شخص کچھ دیر خاموش رہا، حواس درست کیے اور بولا "مجھے کچھ دیر اس اندھیرے کنویں کے پاس تنہا چھوڑ دو۔"

کچھ خاموشی رہی، مجمع سے آواز آئی۔

"ہمیں منظور ہے تم کچھ وقت یہاں تنہا گزار سکتے ہو۔"

کچھ دیر بعد مجمع میں سے دو آدمی باہر نکلے اور اسی کنویں کی جانب لپکے۔

"لیکن یہ کیا" وہاں تو کوئی بھی موجود نہ تھا۔

"ارے یہ کہاں گیا" سب حیران رہ گئے۔

"کہیں بھاگ گیا ہے" ایک آواز آئی۔

"لیکن چاروں طرف تو پہرہ تھا" دوسری آواز آئی۔

پھر سب خاموش ہو گئے۔

"اس نے پھر کنویں میں چھلانگ لگا دی ہے" سرگوشی اُبھری۔

"لیکن وہ تو روشنی کی طرف آنا چاہتا تھا اور روشنی کے لیے تو موت بھی قبول کر سکتا تھا" مجمع میں سے کسی نے کہا۔

"اوفوہ...... بیچارا ڈر گیا" مجمع میں سے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اور کچھ ہی دیر میں مجمع کے لوگ اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے واپس جا رہے تھے۔

...... ✿ ...... ✿ ......

معجزے بھی بے شمار ہوتے ہیں

تسنیم انور سلیمی

رشتہ کی تلاش کی مہم جاری تھی، ہم نت نئے لوگوں کے گھروں میں جاتے اور جب واپس آتے تو میرا اپنے شوہر سے ضرور جھگڑا ہوتا۔ میرا بیٹا قیصر جو کہ ڈاکٹر ہے اس کے لیے ہمیں لیڈی ڈاکٹر ہی کی تلاش تھی۔ میری بھانجی فائزہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔ میری خواہش تھی کہ اس سے ہی میرے بیٹے کی شادی ہو......

ایک سچا واقعہ...... بے شک اللہ تعالیٰ ہی دلوں کو بدلنے پر قادر ہے!

بے شک دلوں میں محبت ڈالنے والی ذات اللہ کی ہے۔ ہم چاہیں بھی تو تمام دنیا کی دولت خرچ کر کے دلوں میں محبت نہیں ڈال سکتے۔ انسان پر یہ حقیقت زندگی میں رونما ہونے والے واقعات عیاں کر دیتے ہیں۔

پھولوں کی پتیوں کی پلیٹیں پکڑے میں اور میرے میاں گیٹ پر میری بہن کے منتظر تھے جو کہ ابھی کچھ لمحوں کے بعد اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آنے والی تھیں۔ آج میرے بیٹے کی میری بھانجی فائزہ کے ساتھ منگنی ہونے جا رہی تھی۔

میں آج خوش ہونے سے زیادہ حیران ہوں۔ میری آج کی کیفیت کے لیے "خوشی" بہت چھوٹا لفظ ہے۔ خوشی کی زیادتی کی وجہ سے میرا پورا جسم قابو سے باہر ہے۔ ایک عجیب سی لرزش ہے۔ میں صحیح

ریکارڈ

ایک ڈرائیور: تیز رفتاری کے عالم میں تم نے کم از کم کتنے فاصلے کے اندر کار روکی؟
دوسرا ڈرائیور: ایک گز کے اندر اندر۔
پہلا ڈرائیور (ناقابل یقین لہجے میں): ایک گز؟
دوسرا ڈرائیور: ہاں۔ مگر اس سے قبل میں اینٹوں کی ایک مضبوط دیوار میں سے گزر چکا تھا۔

☆☆☆

سے بات بھی نہیں کر سکتی۔

میں سوچ رہی ہوں کہ واقعی دلوں کو بدلنے پر اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے۔ میرے میاں جو کہ پھولوں کی پتیاں لیے وارنے کے لیے میری بہن کی آمد کے منتظر ہیں، کبھی میری بہن اور ان کے بچوں کا نام لینا اور سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

میں اور بچے، میرے میاں کی غیر موجودگی میں چوری چھپے میری بہن کے گھر جایا کرتے تھے جو کہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی ہیں۔ آج میرے میاں اسی بہن کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی منگنی کر رہے ہیں اور بے انتہا خوش بھی ہیں۔

جب رشتہ کی تلاش کی مہم جاری تھی، ہم نت نئے لوگوں کے گھروں میں جاتے اور جب واپس آتے تو میرا اپنے شوہر سے ضرور جھگڑا ہوتا۔ میرا بیٹا قیصر جو کہ ڈاکٹر ہے اس کے لیے ہمیں لیڈی ڈاکٹر ہی کی تلاش تھی۔ میری بھانجی فائزہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔ میری خواہش تھی کہ اس سے ہی میرے بیٹے کی شادی ہو جبکہ میرے میاں میری بہن کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر میں نے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر فائزہ کا نام لینا ہی چھوڑ دیا لیکن رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں ضرور مانگنا شروع کر دیں کہ "اے اللہ! میں مجبور ہوں مگر تُو تو مجبور نہیں۔ تو جو چاہے ایک پل میں کر سکتا ہے بس "کن" کہنے کی دیر ہوتی ہے۔" کبھی راتوں کو اُٹھ کر نفل پڑھتی۔ کبھی روتی۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم کیا یا کوئی قبولیت کا لمحہ میرے نصیب میں آیا کہ ایک صبح میرے میاں خود ہی کہنے لگے "میرا خیال ہے کہ قیصر کے لیے فائزہ ہی ٹھیک رہے گی۔" میں ان کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر وہ اپنی دکان پر چلے گئے۔

شام کو جب واپس آئے تو کہنے لگے "اگر آپ کو فائزہ پسند ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔" میں اب بھی حیران اور اس معجزے پر ششدر تھی۔ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ ان کے دل کا حال کیسے تبدیل ہو گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میرے بھائی کا فون آیا جو کہ امریکہ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پاکستان اپنے سالے کی شادی میں آئے ہوئے ہیں۔ 3 دن کے لیے ہمارے پاس آنا چاہتے ہیں۔

جب وہ ہمارے گھر آئے تو میں نے انہیں بتایا کہ میرے میاں کا رجحان فائزہ کی طرف ہو رہا ہے۔ یہ سن کر وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ رات کا کھانا ان کا ہمارے ہاں تھا۔ کھانے کے بعد بھائی اور میرے میاں نے تمام منصوبہ بندی کر لی کہ کل رات کو ہم لوگ بہن کے گھر منگنی کرنے جائیں گے اور اگلے دن میری بہن ہمارے گھر آئے گی۔

سو آج ہم پھولوں کی پتیوں کی پلیٹیں پکڑے گیٹ پر اپنی بہن کے منتظر ہیں۔ واقعی دلوں کو بدلنے پر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات قادر ہے۔ اگر ہم پوری دنیا کی دولت خرچ کر لیں تو بھی دلوں میں محبت نہیں ڈال سکتے جو اللہ تعالیٰ ڈال سکتا ہے۔

کیا مریض کو روزہ رکھنا چاہیے؟

حکیم محمد عثمان
(چیف ایگزیکٹو مرحبا لیبارٹریز پاکستان)

مریضوں کے لیے رمضان المبارک باعث شفا ہو سکتا ہے، مختلف امراض میں مبتلا افراد روزہ رکھ کر خدا کی رحمتیں، برکتیں اور شفا حاصل کر سکتے ہیں۔ مریضوں کے لیے ضروری ہے کہ رمضان المبارک کے آغاز سے قبل اپنے تمام میڈیکل ٹیسٹ کروالیں!

حکم خداوندی ہے: "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دیتا ہوں" گویا روزہ رکھنے کی فضیلت اور ثواب خدائے بزرگ و برتر ہی جانتا ہے اور انسان کے لیے اسے حیطہ تصور میں بھی لانا ممکن نہیں ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ رمضان المبارک کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرا عشرہ جہنم سے آزادی کی نوید ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ہر مسلمان صدق دل سے رمضان المبارک میں روزے رکھنے اور اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کو سمیٹنے کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے روزے رکھنا فرض قرار دیا ہے وہیں یہ بھی حکم دیا ہے کہ مریض اور مسافر کے لیے یہ فرض ادا کرنا ضروری نہیں، مریض صحت یاب ہونے اور مسافر اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد روزے رکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روزے جیسی عبادت کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جذباتی وابستگی بھی ہوتی ہے اور اسی لیے ہر کوئی چاہے وہ مریض ہو یا مسافر، روزہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں تک مریضوں کا تعلق ہے تو ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو کسی مستقل عارضے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو اپنے مرض کی شدت اور نوعیت کے مدنظر اپنے معالج کے مشورے سے ہی روزے رکھنے کا فیصلہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں مریض کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور خداوند کریم نے واضح حکم دیا ہے کہ جان بچانا بھی فرض عین ہے۔

سب سے پہلے ہم بات کرتے ہیں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا افراد کی۔ ذیابیطس ایک ایسا مرض ہے جو تا حال لاعلاج ہے تاہم غذائی احتیاط، ورزش اور ادویات کے استعمال سے اس مرض کو کنٹرول میں رکھنا ممکن ہے۔

ذیابیطس کے مریض کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے جسم میں شکر کی مقدار مصنوعی طریقوں سے کنٹرول میں رکھنا ہوتی ہے کیونکہ ان کے اندر قدرتی نظام یہ کام ٹھیک طریقے سے سرانجام نہیں دے پاتا۔ خون میں گلوکوز کی مقدار کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں بہت سی پیچیدگیاں جنم لے سکتی ہیں۔ ماہرین طب اس خیال پر متفق ہیں کہ اگر کسی مریض کی ذیابیطس باوجود علاج اور دیگر کوششوں کے کنٹرول نہ ہو رہی ہو اور اس کی وجہ سے مریض کو ذیابیطس کی وجہ سے مختلف جسمانی پیچیدگیوں کا سامنا ہو تو ایسے مریضوں کو روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ تاہم اگر ذیابیطس کنٹرول میں ہے تو مریض نہ صرف روزہ رکھ سکتا ہے بلکہ رمضان المبارک کی خیر و برکت سے اس کے مرض کی شدت بھی کم ہو جاتی ہے۔

ذیابیطس کے مریض اگر روزہ رکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے لیے انہیں اپنے معالج سے رجوع کرنا چاہیے جو ان کی ادویات، انسولین، خوراک اور ورزش کے اوقات میں تبدیلی تجویز کرے گا۔ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا روزہ داروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سحر اور افطار کے وقت تجویز کردہ غذا ہی کھائیں اور خاص طور پر افطار کے بعد بہت زیادہ کھانا کھانے سے حتی المقدور گریز کریں۔ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا حاملہ خواتین روزہ نہ رکھیں۔ جو مریض انسولین کی بجائے دیگر ادویات کی مدد سے ذیابیطس کو کنٹرول میں رکھتے ہیں ان کے لیے اپنی ادویات میں تبدیلی ضروری ہے جو ان کا معالج ہی کر سکتا ہے ایسے مریض ذیابیطس کے لیے رمضان المبارک کے دوران وہ ادویات استعمال کریں جن کا اثر زیادہ دیر قائم نہیں رہتا کیونکہ دوران روزہ کچھ کھانے پینے کی اجازت نہیں ہوتی اور اگر اس حالت میں کسی دوا کی وجہ سے خون میں گلوکوز کی مقدار کم ہوتی رہے تو پھر بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح انسولین استعمال کرنے والے مریضوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے معالج کے مشورے سے انسولین لگانے کا عمل سحر اور افطار کے وقت پورا کریں۔ طویل دورانیے تک جسم

Marhaba Laboratories Lahore-Pakistan.
URL: www.marhaba.com.pk

میں فعال رہنے والی انسولین کی بجائے ایسی انسولین استعمال کی جائے جو صرف کھانے کے وقت ہی لگائی جاتی ہے اور سحر کے وقت عام دنوں کے مقابلے میں انسولین کم مقدار میں لگانی چاہیے تاکہ دوران روزہ مریض کے خون میں گلوکوز کی مقدار خطرناک حد تک کم ہونے کے خطرے سے بچا جاسکے۔ ذیابیطس کے مریض اپنی خوراک پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے ایسی غذا استعمال کریں جو آہستہ آہستہ ہضم ہوتی ہے۔ نیز اپنی روز مرہ خوراک میں بوقت افطار کوئی پھل ضرور استعمال کریں اور غذا میں سبزیوں کو ضرور شامل کریں۔ خون میں گلوکوز کی مقدار وقتاً فوقتاً قبل از سحر اور بعد از افطار چیک کرتے رہیں اور اس میں غیر معمولی تبدیلی محسوس کرتے ہی یہ بات اپنے معالج کے ضرور گوش گزار کریں۔

ذیابیطس کے مریض افطار کے وقت بہت زیادہ مرغن اور میٹھی اشیاء کے استعمال سے گریز کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رمضان المبارک میں غذائی احتیاط کی وجہ سے وزن کم کرنے کا ایک نادر موقع میسر آتا ہے لیکن اگر مرغن غذا اور مٹھائی وغیرہ استعمال کی جائے تو وزن کم ہونے کی بجائے بڑھنا شروع ہو جائیگا جس کے باعث ذیابیطس کے مرض میں شدت پیدا ہوسکتی ہے۔ افطار کے وقت ذیابیطس کے مریض زیادہ مقدار میں پانی پئیں تاکہ جسم میں پانی کی کمی کا ازالہ ہوسکے۔

ذیابیطس کے مریض اگر دوران روزہ یہ محسوس کریں کہ ان کے جسم میں گلوکوز کی مقدار کم ہو رہی ہے۔ ٹھنڈے پسینے آرہے ہیں۔ دل کی دھڑکن کم یا تیز ہوگئی ہے۔ سر چکرا رہا ہے یا غنودگی طاری ہو رہی ہے تو انہیں فوری طور پر کوئی میٹھی چیز کھانی چاہیے اور اس کے بعد نشاستہ دار غذا لینی چاہیے۔ اس انداز میں روزہ افطار کرنے سے گناہ سرزد نہیں ہوگا کیونکہ ازروئے شریعت جان بچانے کے لیے روزہ قبل از وقت افطار کیا جاسکتا ہے تاہم بعد میں اس کی قضا دینا ہوگی۔

ذیابیطس کے مریض اگر رمضان المبارک میں ادویات کا استعمال اور ورزش بالکل ترک کر دیتے ہیں تو ان کے خون میں گلوکوز کی مقدار میں اضافہ ہو سکتا ہے جو خطرناک صورتحال کا باعث بن سکتا ہے اس لیے ذیابیطس کے مریض روزہ دار کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

ذیابیطس کے ایسے مریض جو مرض پر کنٹرول کے لیے صرف غذائی احتیاط کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور انہیں ادویات کے استعمال کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی وہ باآسانی رمضان المبارک کے روزے رکھ سکتے ہیں اور اپنا وزن بھی کم کرسکتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مرض کی شدت میں بھی لازمی کمی ہوگی۔

اس کے بعد ہم بات کرتے ہیں بلڈ پریشر اور امراض قلب میں مبتلا ان مریضوں کی جو رمضان المبارک میں روزہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو وزن کی زیادتی کے ساتھ ساتھ درمیانے درجے کے ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہوں انہیں لازمی روزے رکھنے چاہئیں بشرطیکہ وہ دیگر کسی طبی پیچیدگی کا شکار نہ ہوں۔ ایسے مریض روزہ رکھ کر عبادت اور بیماری سے نجات یا کم از کم اس پر بہتر کنٹرول حاصل کرسکتے ہیں تاہم سب سے پہلے انہیں بھی اپنے معالج سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوگی جو ان کی بیماری کی شدت اور نوعیت کے پیش نظر ان کی ادویات میں ضروری ردوبدل کر دے گا۔ مثال کے طور پر جن مریضوں کو بلڈ پریشر کم کرنے کے لیے پیشاب آور ادویات دی جاتی ہیں ان کے لیے دوا کی مقدار کم کرنے کی ضرورت ہوسکتی ہے تاکہ

دوران روزہ جسم سے پانی کا اخراج زیادہ ہونے کے خطرے کو کم کیا جاسکے۔

تاہم ایسے مریض جن کو دل کا شدید عارضہ لاحق ہے یا ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک زیادہ ہو جاتا ہے انہیں روزہ نہیں رکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دل کے ہلکے پھلکے امراض یا معمولی بلڈ پریشر میں مبتلا مریض اگر روزہ رکھیں تو اپنی ادویات کے استعمال اور مقدار کا تعین اپنے معالج کی ہدایات کے مطابق کریں نیز مرغن اور موٹاپے کا باعث بننے والی خوراک کی بجائے سادہ لیکن صحت بخش غذا استعمال کریں جس کی بڑی مقدار پھلوں اور تازہ سبزیوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ موٹاپے کا شکار لوگوں کے لیے رمضان المبارک وزن کم کرنے کا سنہری موقع ہے اور انہیں اس موقعہ سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسی طرح سگریٹ نوش حضرات بھی رمضان المبارک کے دوران اس قبیح عادت سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔

حاملہ خواتین کے حوالے سے بات کی جائے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا، ''دودھ پلانے والی مائیں اور حاملہ خواتین روزہ نہ رکھیں اور اس حکم نبوی ﷺ کا ماخذ یہ فرمانِ خداوندی ہے کہ کسی جان کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ تکنیکی اعتبار سے بات کی جائے تو حمل کوئی بیماری نہیں ہے تاہم ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ حاملہ خاتون اگر روزہ رکھتی ہے تو اس کے ہونے والے بچے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ ماہرین صحت زچہ و بچہ کی رائے میں حاملہ خواتین کو حمل کے ابتدائی تین ماہ اور آخری تین ماہ کے دوران روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ جہاں تک درمیان والے تین ماہ کا تعلق ہے تو حاملہ خواتین اپنی صحت اور اپنے معالج کے مشورے کے پیش نظر روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرسکتی ہیں۔ ماں کے پیٹ میں موجود بچے کو غذائی کمی سے زیادہ پانی کی کمی سے خطرہ ہوتا ہے اس لیے بہت زیادہ احتیاط لازم ہے۔

2010ء میں گردوں کے امراض پر تحقیق کرنے والی ایک ٹیم نے نتائج مرتب کرتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ جن مریضوں کو آپریشن کے ذریعے نیا گردہ لگایا گیا ہو وہ پیوندکاری کے کم از کم ایک سال بعد روزہ رکھ سکتے ہیں۔ گردے کے دیگر امراض میں مبتلا مریضوں کے حوالے سے محققین نے نوٹ کیا کہ روزہ رکھنے سے ان کے مرض کی شدت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ تاہم اس تحقیق میں ان مریضوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا جن کے گردوں کو پانی کی کمی کی وجہ سے نقصان پہنچ چکا ہو، جن مریضوں کا بلڈ پریشر یا ذیابیطس کنٹرول میں نہ ہو، حاملہ خواتین، جگر اور امراض قلب میں مبتلا افراد معدے کے السر والے مریض یا ایسے لوگ ماضی میں جنہیں گردے میں پتھری کی شکایت رہی ہو یا وہ مریض جنہیں دن میں دو مرتبہ سے زائد بار دوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہو۔

متحدہ عرب امارات میں ہونے والی اس تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ CKD(Chronic kidney Disease) کے وہ مریض جنہوں نے روزے کا اہتمام کیا ان کے بلڈ پریشر اور وزن میں کمی کا رجحان دیکھنے میں آیا اور GFR بھی روزہ نہ رکھنے والے مریضوں کے مقابلے میں بہتر ہوگئی۔ گویا CKD میں مبتلا مریض باآسانی روزہ رکھ سکتے ہیں تاہم رمضان المبارک شروع ہونے سے قبل انہیں تمام ضروری میڈیکل ٹیسٹ کروانے اور ان کی روشنی میں اپنے معالج سے مشورہ کرنا چاہیے۔

اقوالِ حضرت علی رضی اللہ عنہ

☆ صبر تکلیف کے دفع کرنے کے لئے نہایت مضبوط ہتھیار ہے۔
☆ صبر تمام کڑوے اور تلخ کاموں میں معاون اور مددگار ہے۔
☆ صبر نہایت بہترین سامان اور سخاوت بہت اچھی سرداری ہے۔
☆ تواضع علم کا ثمرہ اور غصہ پی جانا بردباری کا پھل ہے۔
☆ حلم ریاست کا سر، بردباری سیاست کی زینت، معافی قدرت کا زیب اور انصاف حکومت کے انتظام کا باعث ہے۔
☆ عفو بزرگی کا سبب اور مال خرچ کرنا تعریف کا موجب ہے۔
☆ سخاوت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خلق اور دعا اولیاء اللہ کا ہتھیار ہے۔
☆ سخاوت کا ثمرہ دوستی اور صفائی اور بخل کا نتیجہ بغض اور دشمنی ہے۔
☆ بخیل ہمیشہ ذلیل اور حاسد ہمیشہ بیمار ہے۔
☆ احسان انسان کا غلام بنالیتا اور منت رکھنا احسان کو خراب کر دیتا ہے۔
☆ سنجیدگی عقل کا عنوان اور وقار بزرگی کی دلیل ہے۔
☆ بیوقوفی نہایت معیوب اور برا خلق ہے۔
☆ طیش (سبکی اور سفلہ پن) زندگانی کو خراب کرتا اور بخل کینہ پیدا کرتا ہے۔
☆ آہستگی سے کام کرنے والا کامیابی کے لائق اور مخلص قبولیت دعا کا سزاوار ہے۔
☆ خدا تعالیٰ کی نافرمانی قبولیت دعا کی مانع ہے۔
☆ ظلم دوزخ میں داخل ہونے کا موجب اور سرکشی ہلاکت کا باعث ہے۔
☆ تقویٰ آخرت کا ذخیرہ اور نرمی راست روی کا عنوان ہے۔
☆ برکت نرمی طبع کی رفیق اور نجات سچائی کی ساتھی ہے۔
☆ برائی غضب ابھارتی ہے۔
☆ جھگڑا ہلاکت کا سرنامہ ہے۔
☆ درشت گیری اخلاص کو بگاڑتی اور سہل گیری روزی جاری کرتی ہے۔
☆ ظلم تمام رذیل خصلتوں میں سے زیادہ بری خصلت اور انصاف تمام عمدہ صفات میں سے افضل صفت ہے۔
☆ انصاف مخلوق کی بقا کا باعث اور ظلم رعیت کی ہلاکت کا موجب ہے۔
☆ غضب طیش کی سواری ہے۔
☆ حسد زندگانی کا منغص اور خراب کر دیتا ہے۔
☆ غفلت نہایت موذی دشمن اور گناہ پر اصرار کرنا بہت بری رائے ہے۔

عرفان جاوید

اور جب ببلو گھر واپس نہ آیا

چوتھے روز تو اماں کو باقاعدہ غشی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ ابا بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ بہت سوچا کہ کہیں ناراض ہو کر تو نہیں چلا گیا مگر کچھ سوجھی نہیں کہ اگر ناراض ہوا ہے تو کس بات پر۔ بالآخر اخبار میں دوبارہ اشتہار دیا گیا کہ اگر کسی کو کچھ معلوم ہو تو بتائے اور اگر خود پڑھے تو گھر آجائے

ایک نوجوان کی کتھا، جسے شیخی بگھارنے کی کڑی سزا بھگتنا پڑی......!

ببلو کا لاپتہ ہو جانا اس کے گھر والوں کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔

اور پھر وجہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ سب کی معمے سے بڑھ کر ہی کچھ تھا۔

ویسے بھی گھر والے تو گھر والے، ببلو اپنے محلے کا مقبول ترین اور سب سے زیادہ چاہا جانے والا بچہ تھا۔

بچہ تو خیر وہ تھا نہیں، آخر اٹھارہ برس کی عمر کا جوان لڑکا بچہ تھوڑی ہی ہوتا ہے۔ مگر اس کے بھولپن اور بھلکڑ پن کی وجہ سے کوئی اسے بچے سے زیادہ مقام دینے کا اور سنجیدگی سے لینے پر تیار نہ تھا۔

اس کے چہرے پر موجود بھولپن اس کی شخصیت کا صحیح عکاس تھا۔ پھر داناؤں نے غلط تو نہیں کہا کہ

چہرہ شخصیت کی صحیح پہچان ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ایک سات سالہ بچے کا چھوٹا سا چہرہ ایک جوان کے چوڑے کندھوں پر دھر دیا گیا ہو۔

جب کبھی گول مٹول بلو گلی میں چلا آ رہا ہوتا تو دور سے یوں دکھتا جیسے ایک فٹ بال لڑھکتا چلا آ رہا ہو۔ ایک تو اس کا کھانے پینے کا انتہا کو چھوتا ہوا شوق اور پھر شوق بھی چٹپٹی تیل میں لتھڑی چیزوں کا، جیسا کہ سموسے پکوڑے اور وہ بھی کھٹی چٹنی میں گھٹنا گھٹنا ڈوبے ہوئے۔

نام تو اس کا فیضی تھا مگر پھر یہ بلو کیسے پڑا۔

کافی پہلے ایک روز ایسا ہوا اور یہ بات ہے سردیوں کی، وہ گھر بیٹھا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا اور پاپڑوں پر چورن ڈالے کھا رہا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ میچ ایک بہت اہم موڑ پر تھا۔ ایسے میں اسے جب کچھ اور بجھائی نہ دیا تو ہمسائے میں قریشی صاحب کے ہاں چلتے ڈیزل کے جنریٹر کی آواز اس کے کانوں میں بھنک کی طرح پڑی۔

اطلاعی گھنٹی پر قریشی صاحب نے دروازہ کھولا تو ان سا سنجیدہ شخص بھی بلو کا حلیہ دیکھ کر مسکراہٹ نہ روک پایا۔ ٹی شرٹ کے نیچے شلوار کا آدھا اڑسا آدھا لٹکتا ازار بند جھول رہا تھا۔ ہونٹوں کے گرد چورن کے ذرات اور پاپڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا آمیزہ ملا ہوا تھا اور آنکھوں میں التجا تھی۔

خیر، میچ انتہائی سنسنی خیز لمحات میں داخل ہو چکا تھا۔ قریشی صاحب ان کی گود میں بیٹھا ننھا موجو اور سامنے قالین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ان کے دیگر بچے اور ان کے دوست منہ کھولے آخری گیند کے منتظر تھے۔ آخری گیند پر قومی ٹیم کو جیتنے کے لیے ایک رن چاہیے تھا۔ باؤلر دوڑنے کا آغاز کر چکا تھا اور پھر اس نے یارکر پھینکنے کے زور پر بلے باز کو فل ٹاس دے دیا۔ بلے باز نے بلا گھمایا اور گیند گولی کی رفتار سے باؤنڈری لائن عبور کر گئی۔

کمرے میں تو گویا بھونچال آ گیا۔ سب بچے بڑی خوشی سے ناچنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں آس پاس ہوائی فائرنگ کی تڑتڑ کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔

قریشی صاحب بھی تھوڑی دیر مسکراتے رہے پھر سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا تاکہ میچ کے بعد کی تقریب دیکھی جا سکے۔ اس وقفے کے دوران اشتہارات چلنے لگے۔ یکدم ننھا موجو، قریشی صاحب کی گود میں اچھل اچھل کر چیخنے لگا ''فیضی بھائی! فیضی بھائی!'' سب ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سامنے بلو چیونگم کا اشتہار چل رہا تھا جس میں بچے برف میں ایک سنو مین بنا کر اس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ سنو مین کیا تھا ایک بہت بڑے بے ڈھنگے گول مٹول برفانی تودے پر ایک چھوٹا سا گولہ رکھ کر اس پر ایک چونچ لگا دی گئی تھی اور آنکھوں کی جگہ دو چوکور شیشے دھنسے ہوئے تھے مگر حیرت انگیز طور پر وہ بھالو نما برفانی آدمی فیضی سے مشابہ تھا۔

سب نے پہلے تو بلو ببل گم کے اشتہار کے برفانی آدمی کو دیکھا، پھر آنکھیں پٹ پٹاتے فیضی کو اور پھر دوبارہ ٹی وی کی جانب دیکھا۔ اس دوران فیضی کو گویا ہوش آ گیا اور اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز شور میں دب کر رہ گئی۔

سب کورس میں گا رہے تھے۔

''فیضی بھائی۔ بلو بھائی۔ فیضی بھائی۔ بلو بھائی۔''

فیضی نے کچھ دیر تو یہ سب بے بسی سے دیکھا پھر آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا ''مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا کہ اس گھر میں میری بے عزتی خراب ہونی ہے۔''

کافی دنوں بعد ایک صبح بلو کے والد کو ضروری

کام سے گھر سے جانا پڑ گیا۔ جاتے جاتے وہ بلو کو بجلی کا بل تھما گئے اور ہدایت کر گئے کہ وہ اسے ہر صورت میں بینک میں جمع کروا دے وگرنہ گھر کی بجلی کٹ جائے گی۔ ویسے بھی انہوں نے پچھلے ماہ بجلی کا بل جمع نہ کرایا تھا اور بجلی کا محکمہ دو ماہ کی عدم ادائیگی کے بعد نادہندہ کی بجلی کاٹ دیتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہفتے کا آخری دن تھا اور بینکوں کے اوقات ساڑھے بارہ بجے تک تھے اور اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ ادھر والد صاحب ذمہ داری بلو کے چوڑے کندھوں پر ڈال تو گئے مگر بعد میں سوچتے رہے کہ کیا بلو یہ کام کر بھی پائے گا یا نہیں۔ ادھر کچھ احساس ذمہ داری سے اور کچھ والد صاحب کی جانب سے آزمائش پر پورا اُترنے کی خواہش میں اس نے کچھ دیر سوچا پھر دیوار گیر گھڑی کو دیکھا اور صحن میں کھڑی سائیکل پر بیٹھ کر پیڈل تیز تیز چلاتا قریب ہی واقع بینک کی جانب روانہ ہو گیا۔

بینک کے باہر کھڑکی کے سامنے بل جمع کروانے والوں کی ایک طویل قطار چیونٹی کی رفتار سے سرک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر بلو کے گول مٹول چہرے پر شکنوں کا ایک جال سا پھیل گیا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کچھ دیر تو وہ تشویش سے قطار کو دیکھتا رہا پھر اس کے معصوم چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے سائیکل قریبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی کر دی اور اسے ایک زنجیر سے قریب ہی واقع درخت سے باندھ دیا۔

شام کو جب والد صاحب گھر لوٹے تو غیر متوقع طور پر بلو کو باہر صحن میں اپنے انتظار میں ٹہلتے دیکھا۔ والد صاحب کو دیکھ کر اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے ٹھپہ لگا بل ان کے سامنے لہرا دیا۔ والد صاحب کو اس کی کامیابی کی قطعی طور پر امید نہ تھی۔

''فیضی تم نے بل ادا کر دیا؟''

''جی ابا جی۔ ادا کر دیا۔''

''بیٹا یہ تو میں خود بھی جمع نہ کروا پاتا۔ تم نے تو کمال کر دیا۔''

''بس ابا جی دنیا کی ہوا لگے تو انسان تیز تو ہو ہی جاتا ہے۔''

''مگر بیٹا یہ ہوا کیسے؟''

اس پر بلو نے ساری بپتا ان کے گوش گزار کر دی کہ کس طرح وہ جب بینک سائیکل پر پہنچا تو اختتامی اوقات قریب تھے اور پھر کس طرح اس نے پندرہ سو روپے کے بل کے پیچھے پچاس روپے بینک کے سکیورٹی گارڈ کو بطور رشوت دیئے تھے اور اس نے خود ہی بل کے پیسوں کی ادائیگی کروا کے اس پر ٹھپا لگوا دیا تھا۔

یہ سن کر والد صاحب بجائے خوش ہونے کے، خاموش سنجیدگی کے غار میں اُتر گئے۔

یہ دیکھ کر بلو جس کے گول مٹول چہرے پر شوخی بھری فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور گردن تنی ہوئی تھی، پریشان سا ہو گیا کہ کہاں اس نے اس ہوشیاری سے بل جمع کروایا تھا مگر اس پر والد صاحب بجائے خوش ہونے کے افسردہ سے ہو گئے ہیں۔

کچھ دیر تو والد صاحب سر جھکائے بیٹھے رہے پھر جب انہوں نے بلو کی آنکھوں میں جھانکا تو ان میں بے چارگی دیکھ کر انہیں اس پر پیار آ گیا اور انہوں نے بیٹے کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ''شاباش بیٹا۔ اب لگتا ہے کہ تم دنیاداری کے قابل ہوتے جا رہے ہو مگر آئندہ کوشش کرنا کہ رشوت کے بغیر ہی کام ہو جائے۔''

یہ سن کر بلو خوش ہو گیا اور ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ رشوت کے چکر میں نہیں پڑے گا۔

حادثہ

ایک موٹر سائیکل سوار نے جب سڑک کا موڑ کاٹا تو اسے سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی سپورٹس کار اُلٹی پڑی نظر آئی۔ اس کار کے قریب ہی ایک نوجوان کھڑا تھا۔

"حادثہ کس طرح ہوا؟ کیا کوئی زخمی ہو گیا ہے؟" موٹر سائیکل سوار نے کار کے قریب رُکتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی حادثہ نہیں ہوا۔" نوجوان نے جواب دیا "بس ذرا کار کا ٹائر تبدیل کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

اس کے بعد والد صاحب نے والدہ کو آواز دی کہ وہ کھانا گرم کر کے لگا دیں اور صحن کی دیوار میں نصب واش بیسن کی جانب ہاتھ دھونے کے لیے چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر دیوار کی جانب ڈالی اور ببلو سے ضمناً پوچھا۔

"بیٹا تم نے سائیکل کہیں باہر تو نہیں کھڑی کر دی؟"

باہر ہمسایوں میں کوئی گولا چھوٹا۔ ایک دھما کہ ہوا اور آسمان پر پھلجھڑیوں کا ناچ شروع ہو گیا۔ سامنے ببلو گم صم کھڑا تھا۔

"وہ وہ ابا جی سائیکل تو میں بینک کے باہر ہی چھوڑ آیا۔"

"رہے نا نکھٹو کے نکھٹو۔ پندرہ سو کے بل کے پیچھے پچاس روپے رشوت دی اور اڑھائی ہزار کی سائیکل گنوا دی۔ نالائق کہیں کا۔"

اتنے میں آوازیں سن کر والدہ بھی باہر صحن میں آ گئیں۔

سامنے ببلو رونی صورت بنائے کھڑا تھا اور والد اس پر گرج برس رہے تھے۔ برستے برستے جب وہ بولے:

"تم واقعی ببلو ہو ببلو۔ ببلو کہیں کے۔"

یہ سن کر اسے تو گویا کرنٹ لگ گیا۔ وہ پھٹ پڑا۔ "غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے ابا جی۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ کبھی میری تعریف نہیں کریں گے۔ ہمیشہ میرے کام میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکالیں گے۔ میں نے سائیکل باندھ دی تھی۔ وہ تو میں خوشی میں پیدل ہی واپس چلا آیا۔ سائیکل وہیں ہو گی۔"

"اب زیادہ ٹر ٹر مت کرو اور جا کر سائیکل واپس لاؤ۔ خالی ہاتھ ہوئے تو گھر واپس نہ آنا۔"

یہ سن کر ماں کا تو گویا کلیجہ ہی کٹ گیا۔ وہ بھاگ کر ببلو کے پیچھے لپکیں لیکن وہ پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد جب صحن کا دروازہ کھلا تو چُور چُور باپ نے دروازے کی طرف دیکھا۔

ببلو سائیکل کی گھنٹی بجاتا اندر داخل ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر باپ گویا کھل اُٹھا اور ماں خوشی میں سسکنے لگی۔

وہ ایک عام سا دن تھا۔

چھٹیاں تھیں سو ببلو دیر سے سو کر اٹھا اور چندھی آنکھوں سے پہلے گھڑی کو دیکھا اور پھر انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔

تھوڑی دیر بستر میں بیٹھا۔ نیند کے خمار میں جھومتا رہا پھر پیروں سے بستر تلے چپل ٹٹولی اور کمرے کی واحد لکڑی کی کھڑکی صحن میں کھول دی۔

باہر کی تازہ ہوا کمرے میں بھر آئی اور ساتھ میں صحن میں دانہ چگتی مرغیوں کے کُڑکوں اور ٹھیلے پر آواز لگاتے پھیری والے کی آواز بھی لے آئی۔ دھوپ کی ہلکی تمازت سردیوں کی اس ڈیڑھ سویر کی ٹھنڈ میں گرماہٹ گھول رہی تھی۔ کھڑکی کھلی تو ساتھ میں اماں نے آواز لگائی۔

"فیضی بیٹا جلدی اُٹھ جایا کرو۔ آج ابا جی غصہ

کر رہے تھے کہ مست ملنگ کی طرح پلنگ پر پڑے رہتے ہو اور دن چڑھے اُٹھتے ہو۔"

"اماں چھٹیوں میں تو جی بھر کر سو لینے دیا کریں۔ اب اتنی بھی سختی ٹھیک نہیں۔"

ماں اب کمرے میں چلی آئی۔

"میرے دلارے میں کب کہتی ہوں کہ ماں کے جگر کو آرام نہ ملے۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ جلدی سو جایا کرو تاکہ صبح سویرے آنکھ کھل جایا کرے۔ ویسے بھی ہم تو تمہیں کہہ کہہ کر تھک گئے ہیں کہ صبح کی نماز پڑھ لیا کرو۔ اس وقت سورج کی کرنوں کے ساتھ رحمت کے فرشتے اُترتے ہیں اور ایک تم ہو کہ جو چاہے تم سے کروالو، ادھر نماز روزے کا نام لیا اور ادھر تم غائب۔" ماں کے لہجے میں پیار بھری ناراضگی تھی۔

پھر بات جاری رکھتے ہوئے اماں بولیں "لو بیٹا تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ گھر بیٹھے بیٹھے بچہ ناکارہ ہو جاتا ہے اور ویسے بھی اب ان کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کا بوجھ تمہی نے تو اُٹھانا ہے۔ اس لیے اب گھر کے اور باہر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا کرو۔"

بلو کے منہ سے ایک دبی دبی سی آواز نکلی "جی اماں جی۔ کیا کہا ابا نے؟"

"بیٹا وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے مکان کی مدتوں سے سفیدی نہیں ہوئی۔ اگر ٹھیکے پر یہ کام دیا تو بہت مہنگا پڑے گا کیونکہ ٹھیکیدار خرید میں بھی بچائے گا اور مزدوری میں بھی۔ سو وہ چاہ رہے تھے کہ تم سفیدی کا سامان خود ہی جا کر بازار سے خرید لاؤ۔"

اتنا کہہ کر ماں نے توقف کیا، پھر بولیں "میں اپنے راج دلارے پر بوجھ تو نہیں ڈالنا چاہتی مگر وہ کہہ رہے تھے کہ اگر تم ذرا سی ہمت کرو تو سفیدی بھی خود ہی کر ڈالو۔"

"تو گویا اماں وہ مجھے پینٹر بنانا چاہ رہے ہیں۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ اگر یہی کام کروانا ہے تو ان کو بتا دیجئے گا کہ فلمی بورڈ پینٹ کرنے کا زیادہ معاوضہ ملتا ہے۔ کیوں نہ یہی کام کر لوں۔"

ماں کے منہ سے بے اختیار آواز نکلی "توبہ کرو بیٹا۔ منہ سے کوئی اچھی بات نکالتے ہیں۔ ایک نمازی کا بیٹا ایسا کام کرنے کا سوچے بھی کیوں۔ بس بیٹا تمہارے ابا چاہتے ہیں کہ تمہارے اندر جلدی جلدی احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے۔ اس لیے کبھی کبھی سختی بھی کر گزرتے ہیں۔ اب بیٹا خود ہی سوچو کہ اگر آج شام جب وہ گھر آئیں گے تو باہر ورانڈے کی دیوار پر سفیدی ہوئی دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے۔"

والد صاحب کے خوشی سے تمتماتے چہرے کا سوچ کر بلو نے سر جھکا دیا۔

صبح کا سامان خریدنے نکلا بلو جب دوپہر تک واپس نہ آیا تو ماں کا دل غصے سے بھر گیا۔

"بیٹھ گیا ہوگا دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنے۔"

دوپہر کی کبھی چلچلاتی کبھی ٹھٹھرتی دھوپ شام کے ابتدائی سایوں میں تبدیل ہونے لگی۔ آسمان پر کووں کا شور بھی بڑھ گیا۔ نیلے آسمان پر تیرتی چیلیں گویا سلوموشن میں آسمان پر معلق تیر رہی تھی۔ کبھی کبھار چند چیلیں ہوا میں ڈبکی لگاتیں اور ہمسائے کے کسی گھر کی چھت پر ڈالے گئے صدقے کے گوشت پر جھپٹ پڑتیں۔

ماں نے تلملا کر سوچا "یہ بچہ تو کسی کام کا نہیں۔ اب اس کے ابا گھر آ کر اس کی جو درگت بنائیں گے تو ساتھ میں مجھ سے بھی ناراض ہوں گے کہ ناحق اس کا ساتھ دیتی ہوں۔"

اتنے میں ساتھ کی منڈیر سے ایک کوا اُڑا اور

ماں کے سر پر بیٹ کرتا گزر گیا۔ شام کا وقت اور ایک پرندے کی یہ پلید حرکت۔

"یہ تو اچھا شگون نہیں۔ کمبخت نے ناپاک کر دیا۔ اوپر سے شام کے سائے اُتر رہے ہیں۔ دو وقت مل رہے ہیں۔"

مگر اس بات کو اماں نے ایک غیر ضروری وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور غسل کرنے کے لیے صحن سے ملحق غسل خانے کی جانب چل دیں۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔

اماں کے دل پر وہم کا خوف ناک آسیب قابض ہونے لگا۔ اتنے میں اطلاعی گھنٹی بجی۔

اماں کی جان میں جان آئی۔ بے اختیار وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئیں اور تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھیں۔

"ایک تو اس نانجار کے خوب کان کھینچوں گی کہ ماں کو ستا کر اسے کیا ملتا ہے۔"

دروازہ کھولا تو ہمسائے سے بانو آپا سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے ہمراہ ان کا بیٹا اور فیضی کا دوست خورشید بھی تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔

"خیر تو ہے آپا۔ آپ کچھ پریشان سی دکھتی ہیں۔ اندر تو آیئے۔"

"بس بہن خورشید کے کہنے پر چلی آئی ہوں اندر نہیں آؤں گی۔ وہ دراصل شاید تم نے ٹی وی نہیں دیکھا۔ آج دوپہر صدر بازار میں بم کا دھماکہ ہوا ہے۔ ایک شخص ہلاک اور چار پانچ زخمی ہوئے ہیں۔ خورشید بتا رہا تھا کہ صبح بلو اسے ملا تھا۔ وہ سفیدی اور روغن کا سامان لینے جا رہا تھا۔ اسے کہا تھا کہ جلد ہی آ جائے گا۔ پھر دونوں مل کر تمہارے گھر میں سفیدی کریں گے۔ اس کے بعد وہ سامان لینے صدر بازار کو چلا گیا۔"

اب تک ماں کا چہرہ فق ہو چکا تھا اور جسم پر لرزہ طاری ہو چکا تھا۔

"بہن میرے منہ میں خاک مگر میں تو صرف اپنے بچے بلو کی خیریت دریافت کرنے آئی ہوں۔"

اماں ہوش میں ہوتیں تو بانو آپا کا سوال سنتیں اور کوئی جواب دیتیں۔

سر پر پتھر کوٹنا کسے کہتے ہیں اور جوان اولاد کی گمشدگی کا غم کیا ہوتا ہے یہ بات تو تبھی دونوں جان پائے۔

مُردہ کے کفن کو چہرے سے ہٹایا اور زخمیوں کا جائزہ لیا تو اماں اور ابا کی تسلی ہوئی کہ ان کا جگر گوشہ بلو زندہ ہے کہ وہ ان میں نہ تھا۔ مگر وہ گیا کہاں، اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

مساجد سے اعلان کروائے گئے، اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دیا گیا کہ اٹھارہ برس کا بچہ ہے، ذہنی توازن قائم نہیں، سو جس کو ملے گھر پہنچا دے۔

ذہنی توازن درست ہوتا تو خود ہی چل کر گھر نہ آ جاتا۔

چوتھے روز تو اماں کو باقاعدہ غشی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ ابا بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ بہت سوچا کہ کہیں ناراض ہو کر تو نہیں چلا گیا مگر کچھ سوجھی نہیں کہ اگر ناراض ہوا ہے تو کس بات پر۔

بالآخر اخبار میں دوبارہ اشتہار دیا گیا کہ اگر کسی کو کچھ معلوم ہو تو بتائے اور اگر خود پڑھے تو گھر آ جائے اور پھر انعام بھی رکھا گیا۔ ان سات دنوں میں اماں ابا گویا ستر ستر برس کے ہو گئے۔ چہرے مرجھا کر اور جسم کمہلا کر رہ گئے۔ اماں تو باقاعدہ رعشے کی مریضہ ہو گئیں۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئیں۔ ابا سب کے سامنے تو خاموش رہتے اور صبر کا دامن نہ چھوڑتے مگر ایک روز غسل خانے

پانچ خوبصورت رنگ......!

☆پہلی ملاقات میں کسی بھی شخص کے متعلق رائے قائم مت کیجیے۔ کیا معلوم اس کا آپ کے ساتھ اچھا یا برا پیش آنا وقت اور حالات کا تقاضا ہو۔ کوشش کر کے دوسروں کی تلخ باتوں کو نظر انداز کر دیجیے کیونکہ تلخی پیدا کرنے والے حالات ہوتے ہیں، حالات کو معاشرہ جنم دیتا ہے اور معاشرے کی تشکیل ہم خود کرتے ہیں۔

☆اہل دل حضرات ذرے ذرے میں دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں جبکہ پتھر دل انسانوں کو احساس کی دولت سے محروم ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

☆جہاں توقعات کی فصلیں پک کر کھڑی ہو جائیں، وہاں زیادہ تر مایوسی کا پھل لگتا ہے اس لئے کسی سے اتنی توقعات وابستہ مت کیجیے کہ اگر توقعات ٹوٹ جائیں تو ساتھ میں آپ خود بھی ٹوٹ جائیں۔

☆اگر آپ معافی کا مطلب سمجھنا چاہتے ہیں تو کسی ایک ایسے شخص کو معاف کرنے کی سعی کریں جو آپ کی کردار کشی کا مرتکب ہوا ہو۔ یقیناً آپ جان جائیں گے کہ معاف کر دینے کا اجر اتنا زیادہ کیوں رکھا گیا ہے۔

☆جب آپ کو اپنی شخصیت کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے تو سمجھ جائیے کہ آپ خود پسندی کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس مرض کو اپنے اندر سے اکھاڑ پھینکیے کیونکہ خود پسندی نہ صرف آپ کی زندگی کی راہوں میں مشکلات کھڑی کر دیتی ہے بلکہ آپ کو دوسرے کی نظر میں گرا بھی دیتی ہے۔

مرتب: ایس۔ امتیاز احمد (کراچی)

میں بند ہو کر ان کے سسکنے کی آواز سن کر اماں بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

ناامیدی مایوسی میں بدلنے لگی۔

محلہ دار جو شروع میں خیریت اور تازہ خبر معلوم کرنے آتے تھے اب تعزیت کے لیے آنا شروع ہو گئے۔

ایک روز شام کا وقت تھا، اور یہ دھماکے کے تیسرے ہفتے کی بات ہے کہ دھڑام سے دروازہ کھلا اور عجیب ہیئت کا ایک شخص صحن میں داخل ہوا۔

اماں ڈر گئیں اور ابا جلدی سے کمرے سے باہر نکلے اور اس شخص کو غور سے دیکھا۔

اماں اور ابا کی مشترکہ آوازیں فضا کو ریزہ ریزہ کر گئیں۔

وہ بلو تھا۔ ان کا جگر گوشہ۔ ان کا راج دلارا۔

اماں سسکتی ہوئی اس سے جا ٹکرائیں اور لپٹ کر اس کا چہرہ چومنے لگیں۔

اس کے چہرے پر نیل کے نشان تھے اور ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ ہونٹ ایک کونے سے پچکا ہوا تھا اور ہر قدم پر اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلتی تھی۔ اسے فوراً بستر پر لٹایا گیا اور گرم دودھ میں دیسی گھی اور شکر گھول کر پلائی گئی۔

دودھ پی کر وہ سو گیا مگر سونے سے پہلے اس نے بتایا کہ وہ دھماکے کے بعد سے صدر تھانے میں تھا اور دھماکے میں ملوث مشکوک لوگوں میں شامل تھا اور یہ کہ زیر تفتیش تھا۔

وہ دو روز تک سوتا رہا۔ جب اٹھتا بس خلا میں گھورتا رہتا اور پھر کھا پی کر دوبارہ سو جاتا۔ ماں نے دھو دھو کر زخم صاف کئے اور مرہم پٹی کی۔ کوئی ایک ہفتے بعد وہ کچھ ہوش میں آیا۔

مگر یہ اماں ابا اور محلے والوں، کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے شامل تفتیش کیوں کیا گیا۔ اگر

وہ جائے وقوعہ سے بھاگا تھا تو سبھی بھاگے تھے پھر اس کا کسی مذہبی تنظیم تو کجا، مذہب کی جانب ہی خاص میلان نہ تھا۔

جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ تذبذب میں ہکلاتا یا تو ٹال جاتا یا پھر لاعلمی کا اظہار کر دیتا۔

اس واقعے کے کئی ہفتے بعد کی بات ہے۔

خورشید اور بلو رات کے کھانے کو اکٹھے نکلے۔

نرم نرم ہوا بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی اور لطیف مہک ماحول کو معطر بنا رہی تھی۔ دونوں بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

اس روز بلو پہلی بار اپنی اصل فارم میں واپس آیا تھا۔ کھانے کے بعد دونوں چہل قدمی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ چہلیں کرتے، ٹھٹھے مارتے اور لطیفے سناتے یکدم خورشید بول اٹھا:

''یار بلو اب صحیح صحیح بتا۔ اپنے یار کو تو صحیح بتا دے کہ اس روز کیا ہوا تھا؟''

بلو کی آنکھوں کے سامنے ساری تصویر کھنچ گئی۔ وہ جھجک کر رہ گیا۔ اس کی جھجک دیکھ کر خورشید کا شک یقین میں بدل گیا کہ کوئی بات ہے ضرور جو بلو اس سے چھپا رہا ہے۔

''بلو تو نے مجھے یار نہیں بھائی بنایا تھا۔ اور وہ بات جو اماں ابا سے بھی چھپالی جائے وہ بھائی کو بتا دی جاتی ہے۔''

بلو جھینپ کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد رک رک کر بولا ''یار شرم آتی ہے۔ بات ہے ہی اتنی چھوٹی سی۔''

خورشید کو اور شہ مل گئی۔ وہ اور شیر ہو گیا اور بار بار اصرار کرنے لگا۔

اس پر بلو نے دھیمی آواز میں بات شروع کی

''یار بات یہ ہے۔ بات یہ ہے۔''

''اب بول بھی۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ اس روز سفیدی اور روغن کا سامان خریدنے جب میں بازار پہنچا ہی تھا کہ دھماکہ ہو گیا۔ اب تجھے ہمارے ملک اور شہر کے حالات تو اچھی طرح سے معلوم ہیں۔''

بلو نے کچھ دیر توقف کیا اور بات کی ڈور کا سرا پھر سے تھام لیا۔ ''تو جب دھماکہ ہوا اور سب لوگ جائے وقوعہ کی طرف بھاگے تو میں بازار سے باہر بھاگا۔ تجھے معلوم تو ہے کہ مجھے تو پٹاخوں سے بھی کتنا ڈر لگتا ہے۔''

''مگر وہ بات بتا جو اس سارے مسئلہ کی جڑ ہے۔''

تجسس اب خورشید کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ اس کا تجسس دیکھ کر بلو گویا ہوا۔

''اسی دوران قریبی تھانے سے پولیس بھی باہر نکل آئی اور دھماکے کے موقع کی جانب لپکی۔ میری جو شامت آئی تو میں نے بے ساختہ عادتاً ساتھ میں کھڑے شخص سے بول دیا۔''

''وہ کیا؟''

''مجھے تو پہلے ہی سے پتا تھا کہ یہ دھماکہ ہونا ہے۔''

''پھر؟''

''وہ سالا سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس والا تھا۔''

اس پر کچھ دیر کے لیے خورشید اور بلو کے درمیان خاموشی کا وقفہ حائل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب خاموشی کا پردہ اٹھا تو خورشید کے بلند بانگ قہقہے پر غصے سے بلو کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بے اختیار یہ بول کر وہاں سے چل دیا ''مجھے پہلے سے پتا تھا خورشید کہ تو دوست کی کینچلی میں ایک زہریلا سانپ ہے۔''

رمضان المبارک اور روزہ کی اہمیت

آمد رمضان کی بشارت

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو رمضان المبارک کی آمد کی یوں بشارت دیتے تھے:

"تمھارے پاس رمضان کا بابرکت مہینہ آیا ہے، اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں تمھیں اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لیتا ہے وہ اپنی رحمت نازل کرتا ہے اور گناہوں کو مٹاتا ہے، نیز دعاؤں کو قبول کرتا ہے وہ تمھاری رغبت، چاہت اور جوش وخروش کو دیکھ کر فرشتوں پر فخر کرتا ہے، اس لیے تم اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے بھلائی دکھلاؤ اور جو اس مہینہ میں اللہ کی رحمت سے محروم ہوگیا وہ انتہائی بدبخت ہے۔"

بشارت سننے والوں کے اندر خوشی اور سرور پیدا کرنے کا نام ہے اور رمضان جو بھلائیوں کا موسم ہے اس کے قریب آنے کی خبر سے بڑھ کر اور کون سی بشارت ہوسکتی ہے؟

مسلمانوں کو اس دعا کے ساتھ رمضان کا استقبال کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انھیں رمضان کا مہینہ اس حال میں میسر کرے کہ وہ صحت و عافیت سے ہوں تاکہ وہ پوری نشاط اور حوصلہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت (مثلاً صیام، قیام اور ذکر و اذکار) کر سکیں۔

کتنے لوگ ہماری نظروں کے سامنے ہیں جو رمضان کا انتظار کرتے کرتے اس کی آمد سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔

ماہ رمضان میں روزہ فرض ہونے کی وجہ

ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کی وجہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ فرمائی ہے۔

"یعنی ماہ رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔"

(البقرۃ: ۱۵۸/۲)

لہٰذا یہ مہینہ برکات الٰہیہ کے نزول کا موجب (سبب) ہے اس لیے اس میں روزہ رکھنے سے اصل غرض جو لعلکم تتقون میں مذکور ہے بوجہ اکمل (کامل طریقے سے) حاصل ہوجاتی ہے۔

فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی عقل کو اس کے نفس پر غلبہ اور تسلط دائمی حاصل رہے مگر بباعث بشریت (انسان ہونے کی وجہ سے) بسا اوقات اس کا نفس اس کی عقل پر غالب آتا ہے لہٰذا تہذیب وتزکیہ نفس کے

لیے اسلام نے روزہ کو اصول میں سے ٹھہرا لیا ہے۔

1-روزہ سے انسان کی عقل کو نفس پر پورا پورا تسلط و غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

2-روزہ سے خشیت اور تقویٰ کی صفت انسان میں پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ لعلکم تتقون۔ یعنی روزہ تم پر اس لیے مقرر ہوا کہ تم متقی بن جاؤ۔

3-روزہ رکھنے سے انسان کو اپنی عاجزی ومسکنت اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی قدرت پر نظر پڑتی ہے۔

4-روزہ سے چشم بصیرت کھلتی ہے۔

5-دور اندیشی کا خیال ترقی کرتا ہے۔

6-کشف حقائق الاشیاء ہوتا ہے (یعنی چیزوں کی حقیقتیں کھلتی ہیں)۔

7-درندگی وبہیمیت سے دوری ہوتی ہے۔

8-ملائکہ الٰہی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

9-خدا تعالیٰ کی شکرگزاری کا موقع ملتا ہے۔

10-انسانی ہمدردی کا دل میں ابھار پیدا ہوتا ہے۔

11-روزہ موجب صحت (صحت کا سبب) جسم و روح ہے۔ چنانچہ قلت اکل وشرب (کم کھانے اور پینے کو) اطباء نے صحت جسم کے لیے اور صوفیاء کرام نے صفائی دل کے لیے مفید لکھا ہے۔

12-روزہ انسان کے لیے ایک روحانی غذا ہے جو آئندہ جہان میں انسان کو ایک غذا کا کام دے گی جنھوں نے اس غذا کو ساتھ نہیں لیا وہ اس جہان میں بھوکے پیاسے ہوں گے اور ان پر اس جہان میں روحانی افلاس ظاہر ہوگا کیونکہ انھوں نے اپنی غذا کو ساتھ نہیں لیا اور یہ بات ماننے کے لائق ہے جبکہ کھانے پینے کی تمام اشیاء خداوند تعالیٰ کے خزانہ رحمت سے انسان کو ملتی ہے تو جن اشیاء کو وہ یہاں چھوڑتا ہے اس کا عوض وہاں ضرور دے گا۔ جو یہاں سے بہتر وافضل ہوگا۔

13-روزہ محبت الٰہی کا ایک بڑا نشان ہے جیسے کہ کوئی شخص کسی کی محبت میں سرشار ہوکر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور بیوی کے تعلقات بھی اس کو بھول جاتے ہیں ایسے ہی روزہ دار خدا کی محبت میں سرشار ہوکر اسی حالت کا اظہار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ روزہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزوں کی بابت بار بار فرمایا ہے۔ فرض کا انکار کفر وارتداد ہے۔ اس سے بھی روزے کی اہمیت واضح ہے۔

روزہ کا وقت مقرر کرنے کی وجہ

یہ بات ضروری ہے کہ روزہ کی ایک مقدار مقرر کی جائے تاکہ کوئی شخص اس میں افراط وتفریط نہ کر سکے لہٰذا امور مذکورہ کے لحاظ سے یہ بات ضروری ہوئی کہ ایک مہینہ تک ہر دن برابر کھانے پینے اور جماع کرنے سے نفس کو باز رکھنے کے ساتھ روزہ کا انضباط کیا جائے کیونکہ ایک دن سے کم مقدار کا مقرر کرنا تو ایسا ہے جیسا کہ دوپہر کے کھانے کو کچھ دیر کر کے کھانا اور اگر رات کو ان امور کے ترک کرنے کا حکم دیا جاتا تو لوگ اس کے عادی نہیں ہوتے اس کی وجہ سے ان کو کچھ پرواہ نہ ہوتی اور ہفتہ اور دو ہفتہ ایسی قلیل مقدار ہے کہ جس کا نفس پر چنداں اثر نہیں ہوتا۔ اور دو مہینے کی ایسی مقدار ہے کہ اس میں آنکھیں گڑ جاتیں اور نفس تھک کر رہ جاتا۔

ان امور سے روزہ کے لیے یہ بات ضروری ہوئی کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک دن کا انضباط کیا جائے کیونکہ عرب اسی کو دن شمار کرتے ہیں۔

رات کو روزہ مقرر نہ ہونے کی وجہ

چونکہ رات کا وقت بالطبع ترک شہوات ولذات کا ہے لہٰذا اگر رات کا وقت روزہ کے لیے قرار دیا جاتا تو عبادت کو عادت سے اور حکم شرع کے

مقتضائے طبع سے امتیاز نہ ہوتا۔ اسی واسطے نماز تہجد، وقت تلاوت اور مناجات شب کو قرار دیا گیا۔

روزے کا مقصد

اس تعریف اور عمل سے ہی روزے کا وہ مقصد واضح ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں روزے کا حکم دیتے ہوئے لعلکم تتقون (البقرة: ۲/۱۸۳) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کا مطلب ہے، دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اس کا خوف اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ ہر کام کرنے سے پہلے انسان یہ دیکھے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ حلال ہے یا حرام۔ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گا یا ناراض۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ جب ایک مسلمان روزے کی حالت میں گھر کی چار دیواری کے اندر بھی، جہاں اس کو کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے نہ اس کا کوئی مواخذہ کرنے والا، کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ ہی بیوی سے اپنی جنسی خواہش پورا کرتا ہے، کیوں؟ محض اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی حالت میں ان چیزوں سے اسے روک دیا ہے۔ تو پورے ایک مہینے کی تربیت سے، بشرطیکہ انسان خلوص دل اور کامل اذعان اور شعور سے کوشش کرے، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف راسخ ہو جاتا ہے کہ جب روزے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے حلال چیزوں سے بھی میں اجتناب کرتا رہا ہوں، تو جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دی ہیں، انکا ارتکاب میرے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

رمضان المبارک کی خصوصیت

اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک کو بہت سے خصائص و فضائل کی وجہ سے دوسرے مہینوں کے مقابلے میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ جیسے:

☆اس ماہ مبارک میں قرآن مجید کا نزول ہوا۔

شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن

(البقرة :۲/۱۸۵)

☆اس کے عشرہ اخیر کی طاق راتوں میں ایک قدر کی رات (شب قدر) ہوتی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔

ليلة القدر خير من الف شهر

''شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

(القدر :۹۷/۳)

ہزار مہینے 83 سال 4 مہینے بنتے ہیں۔ عام طور پر ایک انسان کو اتنی عمر بھی نہیں ملتی۔ یہ امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اسے اتنی فضیلت والی رات عطا کی۔

☆رمضان کی ہر رات کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم سے آزادی عطا فرماتا ہے۔

☆سرکش شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔

☆اللہ تعالیٰ روزانہ جنت کو سنوارتا اور مزین فرماتا ہے اور پھر جنت سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ میرے نیک بندے اس ماہ میں اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر اور مجھے راضی کر کے تیرے پاس آئیں گے۔

☆رمضان کی آخری رات میں روزے داروں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اگر انھوں نے صحیح معنوں میں روزے رکھ کر ان کے تقاضوں کو پورا کیا ہو گا۔

☆جب تک روزے دار روزہ افطار نہیں کر لیتے، فرشتے ان کے حق میں رحمت و مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔

☆روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ اور خوشگوار ہے۔

بلائے جاں

صدف شاہ

ایک قہقہہ انگیز تحریر..... اس مختصر تحریر میں ٹریفک پولیس کے اہلکاروں کے لیے عبرت کا تمام سامان موجود ہے

سپاہی نے سیٹی بجائی اور کار کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ بریک چرچرائے اور کار بیچ سڑک پر رُک گئی۔

''آپ نے سگنل توڑا ہے!'' سپاہی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون سے کہا۔

''شاید تمہاری نظر کمزور ہے...... سگنل تو بالکل ٹھیک ہے، کہیں سے بھی نہیں ٹوٹا'' خاتون نے مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔

''آپ نے سرخ بتی پر بھی کار نہیں روکی تھی!''

سپاہی کو غصہ آ گیا۔

''کون کہتا ہے!''

اس وقت سگنل سبز ہو چکا تھا۔

''میں کہتا ہوں۔ میں نے خود دیکھا تھا'' سپاہی

نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔
"تم کون ہو؟" خاتون نے جیسے پتھر مارا۔
"آپ کی نظر شاید کچھ کمزور ہے۔ میری وردی دکھائی نہیں دے رہی آپ کو؟" سپاہی تڑ سے بولا۔
"وردی! وردی سے کیا ہوتا ہے...... تمہیں شاید یاد نہیں رہا۔ پچھلے مارشل لاء کے دوران میں ایک شخص فوجی وردی میں ملبوس ایک بینک میں جا گھسا تھا اور وہاں پر موجود ساری دولت......"
"یہ آپ کیا داستان سنانے لگیں...... آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹا ہوں اور سپاہی کی وردی پہن کر آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں، لائیے اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھائیے!" سپاہی جھلا گیا۔
"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم اصلی سپاہی ہو...... وردی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں ابھی مثال دے چکی ہوں کہ پچھلے مارشل لاء کے دوران میں ایک شخص فوجی وردی پہن کر بینک میں داخل ہوا اور وہاں پر موجود ساری دولت......" وہ خاتون بغیر سانس لئے بول رہی تھی کہ سپاہی نے پھر اس کی بات کاٹی۔
"عجیب جھلی عورت سے پالا پڑا ہے!" وہ غصے سے بے قابو ہو کر کہہ گیا تھا۔
"دیکھو! دیکھو! گالی مت دو۔ ورنہ!" خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"آپ لائسنس دکھاتی ہیں یا چالان لکھوں؟" سپاہی کا چہرہ اس سے بھی زیادہ سرخ ہو گیا کیونکہ وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔
"پہلے اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ...... تاکہ پتہ چلے کہ تم اصلی ہو۔"
سپاہی نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اپنا شناختی کارڈ نکالا اور خاتون کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"یہ...... یہ کارڈ تمہارا ہے؟" اس کا انداز استعجابیہ تھا۔
"اور نہیں تو کیا، آپ کا ہے؟"
"تصویر بھی تمہاری ہی ہے؟" خاتون کی نظر سپاہی کے چہرے کی طرف اُٹھتی اور پھر تصویر پر جم جاتی۔
"آپ کو شک ہے؟" کانسٹیبل اپنا نچلا ہونٹ چبا رہا تھا۔
"ہونا ہی چاہیے...... دراصل آج کل نقلی کارڈ بھی بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ میری سہیلی کے ساتھ پیش آیا تھا...... وہ تنہا ہائی وے پر گاڑی چلا رہی تھی کہ تمہاری طرح کے سپاہی نے ہاتھ دیا اور اس نے......"
سوئے اتفاق کہ ٹھیک اس کار کے برابر ایک اور کار آ کر خراب ہو گئی اور اس طرح پوری سڑک بند ہو گئی...... دونوں کاروں کے پیچھے گاڑیوں کی قطار لگتی چلی گئی۔ پھر کسی گاڑی نے ہارن بجایا۔ دوسری نے اس کی تقلید کی اور پھر چوتھائی منٹ بھی نہ گزرا ہو گا کہ بے شمار گاڑیوں نے کورس کی شکل میں ریں ریں...... پیں پیں، شروع کر دی۔
کانسٹیبل ٹریفک کو جام ہوتے دیکھ کر بوکھلا گیا۔
"آپ میرا شناختی کارڈ واپس کیجئے۔" اس نے کارڈ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن خاتون نے اپنا وہ ہاتھ پیچھے کر لیا جس میں کارڈ دبا ہوا تھا۔
"یہ تمہارا کارڈ ہے؟" خاتون کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔
"خدا کے واسطے میرا کارڈ واپس کر دیجئے اور آپ جائیے۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے آپ کو روکا۔" غصے کے مارے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔
"آئندہ کسی شریف خاتون کو پریشان مت کرنا...... خدا حافظ!" اس نے ایک کھنکھناتا ہوا قہقہہ لگایا اور کار آگے بڑھا دی۔
اور سپاہی......؟ اس بیچارے کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ہی بوٹیاں نوچ ڈالے!

سالگرہ

محمد بشیر چغتائی

سالگرہ کے یادگار لمحوں کی انوکھی اور روح پرورده داستان......

سالگرہ دراصل اعلان ہوتا ہے کہ ایک سال عمر اور کم ہو گئی ہے۔ یوم سالگرہ، یوم حساب ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کیا کیا ہے؟ اور ان کرتوتوں کا انجام کیا ہو گا؟ کیا تعبیر ملے گی اور سزا کیسی ہو گی؟ اس لیے ہر سالگرہ میں زیادہ سے زیادہ توبہ استغفار کی ضرورت ہوتی ہے اور عزم نو کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ آئندہ زندگی...... جو کہ روز بروز کم ہو رہی ہے، قبر کے قریب ہو رہا ہوں اور یوم حساب نزدیک آ رہا ہے...... بہتر انداز میں گزارنی ہے۔ بعض یوم ولادت بڑے یادگار بن جاتے ہیں جیسا کہ 23 اکتوبر 1996ء کو میں صبح صبح تھانہ واہ کینٹ میں تھا۔ یہ میری عجیب سالگرہ تھی۔ بے گناہی کے جرم میں بینظیر کے دور میں حافظ قرآن ایس ایچ او کے ذریعہ قید کر دیا گیا تھا تاکہ 28 اکتوبر 1996ء کے دھرنا اسلام آباد میں شریک نہ ہو سکوں۔ دو دن کے بعد اڈیالہ جیل بھیج دیا گیا تھا اور پندرہ بیس دن اپنے عظیم رفقاء کے ساتھ گزارے تھے کہ نمازیں باجماعت، کھانا اجتماعی اور دن میں کئی کئی تقریریں۔ جیل میں قیدیوں سے خصوصی اور عمومی ملاقاتیں۔ 800 کارکن اور جماعت اسلامی کے کئی لیڈر چند بیرکوں میں لیکن ایک ہی کمپاؤنڈ میں۔ فجر سے مغرب کی نمازوں کے لیے مسجد میں جلوس کی شکل میں جاتے اور جلوس کی شکل میں واپس آتے۔ باہر تو جلوسوں پر پابندی تھی اور تقریروں سے روکا جا رہا

تھا۔ اڈیالہ جیل کے اندر سینکڑوں کا جلوس دن میں کئی بار نکلتا تھا اور نوجوان اور بوڑھے ذکر واذکار کے علاوہ نعروں سے بھی اپنے موجود ہونے کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ پھر بینظیر اپنے ہی جیالے صدر کے ہاتھوں چلی گئی اور ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

ایک سالگرہ تو فیصل مسجد میں ہزاروں فرزندان توحید کے ساتھ گزاری تھی اور عالم اسلام کی اسلامی تحریکوں کے لیڈران مستقبل میں دنیا کے نقشے میں کلمے والے جھنڈے کو لہراتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

ایک سال تو میری سالگرہ اتنی یادگار بن گئی کہ بھول جانا ممکن نہیں اور ایسی سالگرہ کبھی بھی نصیب نہیں ہوگی۔

ہمارے دوست غلام نبی لون سعودی ریاض میں برسوں سے ملازم رہے۔ کئی سال تک ان سے گزارش کرتے رہے کہ وزٹ ویزہ مل جائے تو ''طائف'' بھی دیکھا جائے۔ جو سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک سنگ میل ہے۔ 2006ء میں انہوں نے اچانک اطلاع دی کہ آپ کے لیے وزٹ ویزہ مل گیا ہے اس لیے جلد پہنچنے کی تیاری کریں۔ خوشی خوشی گھر میں اطلاع دی گھر پر میری بیٹی نے بتایا کہ آدھ گھنٹہ پہلے مجھے بھی فون پر اطلاع دی گئی ہے کہ فیملی ویزہ مل گیا ہے اور وہ بھی اپنے شوہر انجینئر شکیل احمد کے پاس جلد پہنچنا چاہتی ہے۔

الحمدللہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق عمرہ ادا کیا۔ دوسرے دن طائف گیا۔ پھر ریاض، ابھا وغیرہ کی سیاحت کے بعد رمضان المبارک سے دو تین دن پہلے مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ بیٹی بھی اپنے شوہر کے ساتھ مدینہ منورہ آ گئی۔ ناقابل بیان خوشی ہوئی۔ ہم سب کو اس جگہ، اس حال میں ملنے کی کبھی امید نہ تھی ایک دن ینبوع...... ان کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا تاکہ صبح تبوک میں جہادِ نبوت کے آثار دیکھوں۔ ابھی راستے میں...... بدر کے مقام سے بس مڑ کر ینبوع جا رہی تھی کہ مبارک مبروک کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ 29 شعبان کے بعد...... یکم رمضان کا اعلان ہو گیا۔ سحری کے وقت ہم تینوں کھانا کھا رہے تھے کہ عجیب منظر تھا۔ ایک سال قبل تو بیٹی کے رشتہ کی...... کوئی بات نہ چلی تھی...... اتنی جلدی ہم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ ماشاءاللہ!

چند دن کے بعد مکہ مکرمہ اور جدہ پہنچ گیا۔ رمضان کے کچھ دن حرم میں گزارے۔ 20 رمضان المبارک عصر سے قبل مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ ہمارے دوست جناب بابر محمود شیرازی صاحب مسجد نبوی کے جنوبی دروازے میں مجھے لینے مسجد سے باہر آ گئے۔ غیر ضروری سامان ان کی رہائش پر رکھا اور ضرورت کا سامان لے کر مسجد نبوی میں اعتکاف کی نیت سے پہنچ گئے۔ یہ مسجد نبوی میں ''پنڈی وال'' حلقہ ہے۔ زیادہ تر راولپنڈی اور گرد ونواح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ لطیف ٹیکسٹائل ملز کے مالکان 400 افراد کے لیے سحر و افطار کا انتظام کرتے ہیں اور سحری اور افطاری کے وقت مسجد نبوی کے شمالی صحن میں کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ کھانا عموماً پیک ہوتا ہے۔ ایک پیکٹ پانچ سے سات آدمیوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔

مقامی لوگوں کی طرف سے مسجد نبوی کے اندر ڈبوں میں بند افطاری کا اہتمام عصر کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا روح پرور منظر ہوتا ہے۔

مسجد نبوی کے اعتکاف میں نبی کریم ﷺ کے روضہ کی زیارت کے مواقع ملتے ہیں۔ تراویح کے علاوہ آخری عشرہ قیام اللیل رکعتیں تو دو چار ہی ہوتی ہیں۔ جس میں ایک پارہ یا زیادہ سے زیادہ قرآن پاک پڑھا جاتا ہے اور پھر وتر کی جامع دعائیں۔ آہ و زاری اور آمین آمین کی صدائیں۔ خصوصاً ستائیسویں کی رات۔ ایسا منظر بھلائیں بھی تو نہیں بھولتا۔

شائع ہو گیا ہے

- قرآنی دُعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالق کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام مسنونہ دُعائیں جو رحمت اللعالمین ﷺ کی ذات برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دُنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز رُوحانی اور ایمانی علاج

قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 7245412

29 رمضان کو عام عادت کے مطابق تمنا ہوتی ہے کہ عید 29 رمضان کے بعد ہو۔ بڑی عجیب بات محسوس ہوئی۔ ہزاروں روپے خرچ کر کے آتے ہیں، مسجد میں اعتکاف کرتے ہیں۔ ہر لمحہ یہاں رحمت برستی ہے۔ گناہوں کی بخشش ہو رہی ہوتی ہے۔ پھر تمنا کہ جلد باہر چلے جائیں۔

میں دعا کرتا رہا کہ یا اللہ روزے تیس ہوں۔ فضائل کے علاوہ ایک خاص وجہ تھی کہ اگر رمضان 29 کے بعد عید ہوتی تو یہ 22 اکتوبر کا دن ہوتا اور اگر 30 روزے مکمل کرنے کے بعد ہوتی تو یہ 23 اکتوبر کا دن ہوتا۔ میری تاریخ پیدائش 23 اکتوبر 1944ء ہے۔ میں چاہتا تھا کہ عید 23 اکتوبر کو ہو۔

سعودی عرب میں عید کا اعلان نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح خاموشی چھا جاتی ہے۔ کچھ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ رمضان المبارک کے خاتمہ کا افسوس...... عید کی خوشی پر بھاری ہو جاتا ہے۔ 29 رمضان المبارک مکمل ہونے پر اگر امام تراویح پڑھا دیں تو روزے 30 ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا کرم ہوا۔ ایسا ہی ہوا۔ 30 روزے 22 اکتوبر کو مکمل ہو گئے۔ 23 اکتوبر کو یکم شوال...... عید بھی اور میری سالگرہ بھی۔ ہمارے دوست جناب بابر محمود شیرازی صاحب نے تجربہ کی بنیاد پر بتایا کہ عید کی نماز اگر مسجد نبوی کے اندر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو سحری کے وقت جلد آ جانا۔ رش بہت ہو گا۔ ذرا سی سُستی کی وجہ سے اندر جگہ نہیں ملے گی۔ رات کو صفائی کے لیے مسجد نبوی بند کر دی گئی اور تہجد کے لیے کھولی گئی۔ بہت جلدی کی پھر بھی 3 بج کر 20 منٹ پر پہنچ سکا۔ مسجد تیزی سے بھری جا رہی تھی۔ میں مشکل سے مسجد نبوی کے پرانے صحن یعنی اندر چھتریوں والی جگہ تک پہنچ سکا۔

اللہ کی بارگاہ میں شکرانے کے مزید نوافل پڑھے کہ مسجد کے صحن سے گنبد خضرا نظر آ رہا تھا۔ فجر کی اذان پر تھوڑے وقت کے بعد نماز فجر ادا ہوئی پھر مسجد کے لاؤڈ سپیکر کے سامنے چند نوجوان کھڑے ہو کر بار بار مختلف وقفوں سے تکبیرات کہتے تھے۔ پھر خاموش ہو جاتے۔ مسجد کے اندر مختلف سمتوں سے تکبیرات کی آوازیں اُٹھتی رہیں۔ کھجوریں تقسیم ہوتی رہیں۔ کہیں کہیں قہوہ کا دور بھی چل جاتا۔ اشراق کا وقت شروع ہوا۔ سورج کی کرنیں نمایاں ہوئیں۔ امام مسجد نبوی نے نماز عید پڑھائی جس کی دو رکعتوں میں سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الغاشیہ کی تلاوت کی گئی۔ خطبہ بھی سنایا گیا۔ خطبہ کے دوران بھی دعائیں کی گئیں۔ چاروں طرف سے آمین، آمین کی صدائیں کچھ زور دار، کچھ آہستہ آہستہ، کچھ آہیں، کچھ سسکیاں...... اب لوگ مسجد کے باہر مختلف دروازوں سے نکل رہے ہیں۔ لاکھوں کا جلسہ ہے۔ کوئی ہڑبونگ نہیں بس ایک عجیب سی خاموشی ہے۔ مقامی لوگ زیادہ تر گھروں میں جا کر سو گئے۔ انجینئر الطاف حسین اعوان حسن ابدال شہر کے ہمارے ساتھی بھی اعتکاف میں شامل تھے۔ انہوں نے حسن ابدال سے آئے ہوئے معتکفین کو ایک ہوٹل میں اکٹھا کر لیا۔ مقامی دوست بھی مع اہل و عیال آ گئے۔ کھانا اجتماعی ہوا جو الطاف صاحب کی طرف سے تھا۔ مذاق و خوشی کے ماحول میں الطاف صاحب نے کہا کہ آج چغتائی صاحب کی سالگرہ کا یہ کھانا ہے اور عید بھی ہے...... میری بیٹی اور داماد شکیل کے علاوہ بہت سے لوگ اس میں شریک ہوئے۔ میں نے تقویم کے لحاظ سے جائزہ لیا۔ رمضان اور اکتوبر کے حوالے سے حساب کیا۔ آئندہ یکم شوال اور 23 اکتوبر۔ میری زندگی میں کبھی بھی اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔ یہ ایک منفرد سالگرہ تھی۔

عید...... مدینہ منورہ...... سالگرہ...... شاید کبھی نہ مل پائیں......!
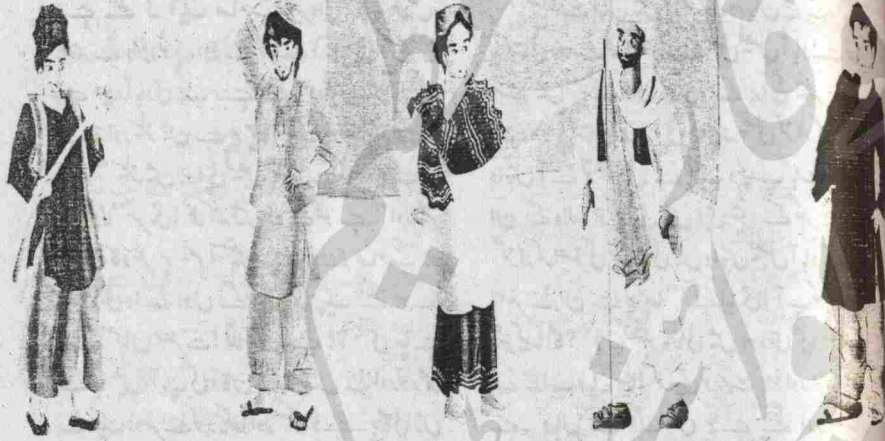
زبان کی چاشنی

رشید قادری

پاکستان کے پانچوں صوبوں میں بولی جانے والی اردو میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اسی لیے اردو کو قومی زبان کہا جاتا ہے جو دراصل تمام صوبوں کے درمیان رابطہ کی زبان ہے لہٰذا اردو کو کسی خاص طبقہ یا جگہ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

زبان کی اہمیت وافادیت بیان کرتی پُراثر تحریر

برصغیر پاک و ہند میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں اردو، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، گجراتی، ہندی، بنگالی، ملیالم، تیلگو یا تلنگی، مراٹھی، کنڑی نمایاں ہیں۔ پاکستان کے ہر صوبہ میں ان تمام زبانوں کے بولنے والے موجود ہیں جو اپنے اپنے لہجہ میں اور پھر مخصوص تلفظ کے ساتھ الفاظ کی ادائیگی کرتے ہیں جو سننے میں بھلی لگتی ہے! آپ یقین کریں ان تمام زبانوں میں موجود مٹھاس، حلاوت اور غنایت کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے۔ گجراتی شپنگ نیوز کے نور محمد لاکھانی، میرے دوست بڑے مرنجان مرنج قسم کے انسان ہیں۔ میری طرح وہ بھی ”مٹھاس“ کے بڑے شوقین ہیں اور وہ باتیں بھی اتنی ہی میٹھی کرتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں ہم دونوں ایک شپنگ ایجنسی میں کام

کیا کرتے تھے۔ یہ اسی دور کی بات ہے وہ اور میں ایک دن صدر میں واقع مٹھائی کی دکان میں بیٹھے ہوئے بنگالی رس گلوں کی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک صاحب شیروانی میں ملبوس، پھندنے والی ٹوپی اوڑھے ہوئے (جو اپنی وضع قطع سے حیدرآبادی لگ رہے تھے) دوکان میں داخل ہوئے اور سیلز مین سے پوچھا ''ایک کلو خلاخند کتنے کا ہے؟'' سیلز مین جو اپنی قمیص شلوار سے پنجابی لگ رہا تھا، بولا ''سر جی! کلاکند بیس روپے کلو ہے۔'' اور پھر کیش کاؤنٹر پر نیم آستین پہنے ہوئے صاحب جو یقیناً دہلی والے ہوں گے، پان کی پیک نگلتے ہوئے بولے ''اماں حضرت! قلاقند چاہیے نا؟ جتنی چاہے لے جائیں، آپ کی دکان ہے!'' میں نے اور نور محمد نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔ بنگالی رس گلوں کا مزا دوبالا ہو گیا تھا، جیسے منہ میں کسی نے ڈھیر ساری شیرینی انڈیل دی ہو! ان تین لوگوں نے جن کا تعلق تین مختلف علاقوں سے تھا ایک ہی مٹھائی کا نام الگ الگ تلفظ کے ساتھ ادا کیا جس کی مٹھاس ہمیں رس گلے سے زیادہ میٹھی لگی! مزے کی بات یہ ہوئی کہ ان تینوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا انہوں نے ایسا کیا کچھ کہا تھا کہ ہم اتنے محظوظ ہوئے ان کے لیے سب کچھ نارمل تھا۔

دراصل انسانی لہجوں کو خوامخواہ تنقید کا نشانہ بنانے والے...... زبانوں کے ارتقاء کی تاریخ اور ان کے بولنے والے لوگوں کے ماحول اور علاقوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ جہاں تک بولے گئے الفاظ کا تعلق ہے ہمیں ان کے حسن ادائیگی سے غرض ہونی چاہیے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس نے جو تلفظ استعمال کیا وہ درست ہے۔ اگر کہی گئی بات ہماری سمجھ میں آ جائے۔ بس! ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ کسی کے بھی لہجے یا تلفظ کو غلط یا صحیح قرار دینا نہ تو ہمارا منصب ہے اور نہ ہی مقصد ہونا چاہیے!

یہاں ایک اور مثال سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔

سلطنت عمان میں قیام کے دوران میرے ایک پاکستانی دوست محمد اصغر جن کا تعلق فیصل آباد سے تھا، مسقط میں ''بینک ڈی پیرس'' کے برانچ منیجر تھے۔ جب وہ پاکستان سے اپنی سالانہ چھٹی گزار کر مسقط واپس آئے تو انہوں نے ایک دلچسپ بات بتائی! ان کے والد جو کراچی میں اپنی بیٹی کے گھر چند ماہ گزار کر اصغر کی موجودگی میں واپس فیصل آباد آئے تو اصغر نے ان سے پوچھا ''کہیئے ابا جی! آپ کو کراچی شہر کیسا لگا؟'' (یہ گفتگو پنجابی میں ہو رہی تھی) ابا جی نے جواب دیا ''بیٹا! کراچی تو بہت بڑا اور اچھا شہر ہے۔ وہاں کے لوگ بھی بڑے چنگے اور ملنسار بندے ہیں لیکن وہاں میرے لیے ایک پرابلم ہوئی تھی۔'' اصغر نے گھبرا کر پوچھا ''خیر تو ہے ابا جی کیسی پرابلم؟ کیا آپ کو وہاں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟'' ابا جی پھر گویا ہوئے ''نہیں پتر! ایسی کوئی بات نہیں۔ وہاں مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ وہاں اردو بول بول کر میرے جبڑے دکھ گئے تھے۔'' بقول اصغر ابا جی کے اس معصومانہ جواب پر گھر کے سبھی لوگ ہنس پڑے تھے۔ ابا جی کے جبڑے ضرور دکھے ہوں گے لیکن کراچی میں اپنے قیام کے دوران وہ اپنا مافی الضمیر اردو میں سمجھانے میں کامیاب رہے ہوں گے اور وہاں لوگوں نے ان کو سمجھا بھی ہو گا اور جواب بھی دیا ہو گا۔ پاک و ہند کے ہر صوبے میں وہاں کے لوگ اپنے اپنے مخصوص لہجے اور تلفظ کے ساتھ اردو بولتے ہیں اور سمجھ بھی لیتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ میں بولی جانے والی اردو اور حیدرآباد، ممبئی اور گجرات میں بولی جانے والی اردو میں واضح فرق ہوتا ہے لیکن وہ ہوتی اردو ہی ہے۔

بالکل اسی طرح پاکستان کے پانچوں صوبوں میں بولی جانے والی اردو میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اسی لیے اردو کو قومی زبان کہا جاتا ہے جو دراصل تمام صوبوں کے درمیان رابطہ کی زبان ہے لہٰذا اردو کو کسی خاص طبقہ یا جگہ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ ہم کراچی میں دیکھتے ہیں کہ ایک پنجابی ٹھیکیدار اپنے پٹھان مزدور سے یا بنگالی کاریگر سے بات کرتا ہے تو اسی (رابطہ کی زبان) اردو میں کرتا ہے جو بہ آسانی ان کی سمجھ میں آ جاتی ہے اور کام بھی خاطر خواہ ہو جاتا ہے۔

ہر لہجہ اور ہر تلفظ کے ساتھ بولی جانے والی ''زبان کی چاشنی'' بہت لذیذ ہوتی ہے!

سب سے پہلے دی گئی مثال جس میں حیدرآبادی، پنجابی اور دہلی والے حضرات نے اپنے اپنے لہجے میں لفظ ''قلاقند'' کو اپنے مخصوص تلفظ یعنی خ، ک اور ق کے ساتھ ادا کیا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ جن جغرافیائی حدود میں یہ لوگ رہتے ہیں وہاں یہ لفظ اسی طرح بولا جاتا ہے۔

میں نے اپنے اس دوست اصغر سے پوچھا تھا ''یار! آپ لوگ ''ق'' کو چھوٹی کاف اور ''ک'' کو بڑی کاف کیوں بولتے ہیں؟'' کہنے لگے ''پھر کیا کہیں؟ جب دونوں حروف کی آواز ایک ہی ہے یعنی ''کاف'' تو اپنے بچوں کو ان دونوں میں تمیز کرنے کے لیے ہم ''ق'' کو چھوٹی کاف اور ''ک'' کو بڑی کاف کہنا سکھاتے ہیں۔''

اس مشکل کا بہترین حل برسوں پہلے یعنی تقسیم ہند سے قبل پروفیسر وحید الدین سلیم نے اپنے مضمون ''ہندوستان کی عام زبان'' (جو ان کے مضامین کے مجموعہ ''افاداتِ سلیم'' میں چھپا تھا) میں تجویز کیا تھا کہ اگر اردو کو واقعی ایک عام فہم زبان بنانا ہے تو اس کے حروف تہجی کو مختصر کرنا ہو گا اور ہم صوت (ایک آواز والے) حروف میں سے کسی ایک کو رکھ کر باقی حروف کو حذف کرنا ہو گا۔ انہوں نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا تھا:

(ا) ث، س اور ص میں سے کسی ایک حرف کو رکھیں اور باقی دو کو نکال دیں۔

سنہری باتیں

☆ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے۔

☆ بُری صحبت سے تنہائی اچھی ہے اور تنہائی سے نیک صحبت اچھی ہے۔

☆ وعدہ خلافی منافقت کی نشانی ہے۔

☆ بدنظری شیطان کے تیروں میں سے ایک خاص تیر ہے۔

☆ دل ایک ایسا آئینہ ہے کہ اگر وہ بدی سے پاک ہے تو اس میں خدا بھی نظر آتا ہے۔

☆ جس نے ارادتاً نماز ترک کی، اس نے کفر کیا۔

☆ غصہ تھوڑی دیر کا اور غرور ہمیشہ کی دیوانگی ہے۔

☆ کسی کی مجبوری سے اتنا فائدہ مت اٹھاؤ کہ اسے مزید مجبور ہونا پڑے۔

☆ جو زندگی کو مقدس فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

☆ مشکل ترین کام سب سے پہلے کرو تاکہ تمہیں سہل پسندی کا طعنہ نہ ملے۔

☆ ہمسائے کی بھیجی ہوئی چیز کو حقیر نہ سمجھو۔

☆ گرے ہوئے انسان کو ٹھوکر نہ مارو کیونکہ آپ بھی گر سکتے ہیں۔

مرتب: ایس۔ امتیاز احمد (کراچی)

(۲) ذ، ز، ظ اور ض میں سے کسی ایک کو حروف تہجی میں شامل کریں، باقی تین کو حذف کردیں۔

(۳) ت اور ط میں سے ایک کو چن لیا جائے۔

اسی طرح ق اور ک میں سے ایک کو! لیکن صد افسوس کہ پروفیسر سلیم کی اس انتہائی معقول تجویز کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ خیر اب تو یہ تجویز بعد از وقت ہو چکی ہے کیونکہ پاکستان کے قیام کے 64 برس بعد اردو قواعد (گرائمر) میں تبدیلی ناممکن ہے۔

سندھ ہائیکورٹ کے ایک سابق چیف جسٹس نے ''انجمن ترقی اردو'' کے ایک اجلاس میں کیا خوب کہا تھا ''بھئی! دہلی اور لکھنؤ تو سرحد کے اس پار رہ گئے ہیں اگر پاکستان میں اردو کو مقبول عام کرنا ہو تو اس میں مکرانی بولی کے الفاظ ''اڑے، وڑے، آدَنی، جاؤنی بھی شامل کرنے ہوں گے۔'' اگرچہ انہوں نے یہ بات ازراہ تفنن کہی ہوگی لیکن انہوں نے درست ہی کہا تھا۔ عام بول چال کی زبان اتنی ہی عام فہم ہونی چاہیے۔

سچ تو یہ ہے کہ مکرانی، سندھی، ہندکو، سرائیکی بولنے والے جب اردو بولتے ہیں تو ان کے کہے ہوئے الفاظ بہت بھلے لگتے ہیں۔

کئی سال قبل بھارت سے اطلاع آئی تھی کہ وہاں کی لوک سبھا میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ''دیوان غالب'' کا ہندی ترجمہ کیا جائے تاکہ ہندی بولنے والے غالب کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس تجویز کی (خوانخواہ) مخالفت کرتے ہوئے بیسویں صدی کے خوشتر گرامی مرحوم نے طنزیہ انداز میں غالب کے مندرجہ ذیل اشعار کو بطور نمونہ ہندی لباس پہنا کر اس تجویز کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی تھی۔

اردو:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

ہندی:

مرتیو کا ایک روز ہے نشچت
ندرا کیوں راتری بھر نہیں آتی

اردو:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہندی:

مورکھی من تجھے ہوا کیا ہے
تیرے اس روگ کی دوا کیا ہے

اردو:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہندی:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مکھ پر شوبھا
وہ سمجھتے ہیں کہ روگی کی دشا ہے اُتم!

خوشتر گرامی کی مخالفت یا موافقت سے ہٹ کر ایک بات ضرور ہے کہ ان کے اس ہندی ترجمہ سے بھی زبان کی چاشنی نہیں گئی، اس کی حلاوت اپنی جگہ ہے اور مزا دیتی ہے۔

میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں اردو میں شائع ہونے والے بے شمار اخبارات، رسائل اور جرائد کو اور ان تمام اردو ٹی وی چینلوں کو جن کی وجہ سے اردو کی ترویج و تشہیر میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے ہر صوبہ کے لوگ بھی لائق تحسین ہیں جو اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو کسی ایک علاقہ یا طبقہ کی زبان نہیں۔ اردو سرکاری زبان نہ ہونے کے باوجود درحقیقت ایک وسیع تر رابطہ کی زبان بالفاظ دیگر قومی زبان ہے!!!

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com
www.facebook.com/sayyaradigest

(تحریر: فاطمہ چودھری)

اس ماہ ہم آپ کو ماہ رمضان اور عیدالفطر کے حوالے سے خصوصی ڈشز کی تراکیب فراہم کر رہے ہیں۔

گولڈن ایگز
Golden Eggs

اجزاء:

انڈے اُبلے ہوئے	4 عدد
آلو اُبلے ہوئے	2 عدد
chedder cheese	3 کھانے کے چمچ
میدہ	2-3 کھانے کے چمچ
بریڈ کرمبز	ایک کپ
نمک + کالی مرچ	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کیلئے
کچا انڈہ	اوپر لگانے کیلئے

ترکیب: اُبلے اور میش کئے ہوئے آلو،
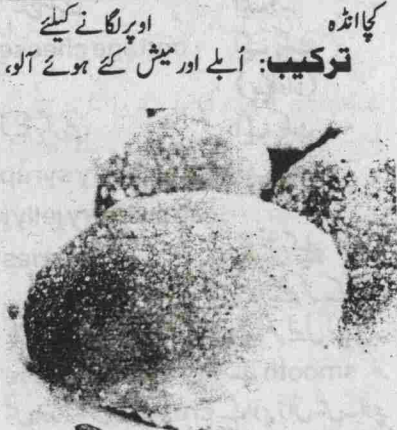
میدہ، نمک اور کالی مرچ کو اچھی طرح مکس کر لیں۔ ایک چوتھائی اُبلا ہوا انڈہ لے کر اس پر تھوڑا سا cheese رکھیں۔ آلو کے مکسچر کو اس انڈے اور

cheese کے اردگرد اس طرح لگائیں گے چھوٹے چھوٹے انڈے کی شکل بن جائیں۔ اب ان انڈوں کو کچے انڈے میں اور پھر بریڈ کرمبز سے رول کرتے جائیں اور فرائی کرتے جائیں۔ گولڈن ہونے پر نکال

کر chilli sauce کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆☆

No Bake Cake

اجزاء:

میٹھے بسکٹ	ایک ڈبہ
نمکین بسکٹ	ایک ڈبہ
cottage cheese	ایک پیکٹ (پھیکا والا)
فریش کریم	ایک پیکٹ
strawberry syrup	ایک پیکٹ
یا strawberry jelly	
cherries	گارنش کیلئے

ترکیب: دونوں بسکٹس کو اکٹھے کر کے کرش کرلیں اور ایک flat ڈش میں بچھا کر لیول کرلیں۔ cheese اور کریم کو مکس کر کے smooth کر لیں اور بسکٹس کے crust کے اوپر ڈال لیں۔ اوپر strawberry syrup یا strawberry jelly بنا کر جما کر ہلکی سی تہہ لگالیں اور cherries سے گارنش کرلیں۔ ٹھنڈا ہونے کیلئے فرج میں رکھ دیں۔ خوب ٹھنڈا ہو تو پیش کریں۔

(تحریر: صائمہ عمران)

شوال کا چاند ہمارے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آتا ہے۔ عیدالفطر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزہ داروں کے لیے انعام ہے۔ عیدالفطر سب مسلمان بہت جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ عید کے دن ایک دوسرے کے گھر کیک اور مٹھائیاں لے جائی جاتی ہیں۔ مہمانوں کی تواضع بھی زیادہ تر میٹھی ڈشز سے کی جاتی ہے کیونکہ عیدالفطر کو میٹھی عید کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اس لیے اس عید کے موقع پر ہم آپ کو دو مزیدار میٹھے بنانا سکھا رہے ہیں جنہیں آپ اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کر کے داد وصول کرسکیں گی۔ سب سے پہلے ہم آپ کو سکھائیں گے ہمارا روایتی میٹھا جو ہر چھوٹے بڑے سب کی پسند ہے جی ہاں اور کچھ نہیں وہ ہیں مزیدار گلاب جامن۔

گلاب جامن

اجزاء:

سوکھا دودھ	آدھا کپ
میدہ	2 کھانے کے چمچ
دہی	2 کھانے کے چمچ
میٹھا سوڈا	ایک چٹکی
گھی (پگھلا ہوا)	ایک کھانے کا چمچ
پیلا رنگ	تھوڑا سا
گھی	تلنے کیلئے

شیرے بنانے کیلئے سامان:

چینی	2 کپ
پانی	2 کپ
الائچی	2 عدد
زعفران	آپشنل

چینی، پانی، الائچی اور زعفران کو پتیلی میں ڈال کر پکنے رکھ دیں۔ اُبال آنے کے بعد دس سے بارہ منٹ تک پکائیں۔

ترکیب: سب خشک چیزوں کو ایک برتن میں مکس کریں۔ اب اس میں دہی اور گھی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ گوندھنے کے بعد 5 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ اب دوبارہ اس آمیزے کو گوندھیں۔ اگر پانی کی ضرورت پڑے تو پانی کا ہاتھ لگالیں۔ اس آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنالیں اور گھی میں تل لیں۔ تلنے کے بعد ان گلاب جامنوں کو جو شیرہ تیار کیا تھا اس میں ڈال دیں۔ مزیدار گلاب جامن تیار ہیں۔ بادام پستہ اور ورق سے سجا کر روایتی انداز میں پیش کریں۔

....

پہلی ریسپی میں ہم نے آپ کو روایتی میٹھا بنانا سکھایا ہے اب ہم آپ کو ایسی ڈش سکھا رہے ہیں جو ہے تو جدید انداز کا میٹھا لیکن اس میں بھی ہمارا روایتی رنگ جھلکتا ہے۔ گرمی کا موسم ہو اور آم کا سیزن ہو اور ایسے میں اس کا فائدہ نہ اٹھایا جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تو لیجئے پیش ہے آم سے بننے والی مزیدار مینگو مور کی جھٹ پٹ ریسپی۔

☆☆☆

مینگو مور

اجزاء:

آم	ایک کلو (گودا نکال لیں)
دودھ	750 ملی لیٹر
کریم	500 ملی لیٹر
چینی	250 گرام
جیلٹن پاؤڈر	1½ کھانے کا چمچ
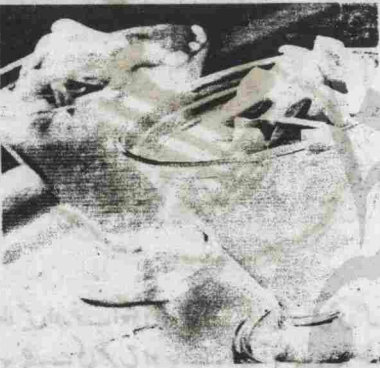
ترکیب: دودھ اور چینی کو ملا کر گرم کریں۔ اب اس میں جیلٹن شامل کریں۔ تینوں چیزوں کو مکس کریں۔ کریم کو پھینٹ کر فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اب آم اور تھوڑے سے جیلٹن والے آمیزے کو بلینڈ کریں۔ اب باقی کے آمیزے میں مکس کردیں۔ اس میں کریم بھی مکس کردیں۔ فریج میں دو سے تین گھنٹوں کے لیے رکھ دیں۔ اب آم کے chunks کاٹ کر گلاسوں میں ڈالیں۔ ان کے اوپر آمیزہ ڈالیں اور set ہونے کے لیے رکھ دیں۔ مزیدار مینگو مور سے لطف اندوز ہوں۔

☆☆☆

پیسٹری

اجزاء:

میدہ	8 اونس
نمک	ایک چٹکی
مارجرین	2 اونس
گھی	2 اونس
ٹھنڈا پانی	ملانے کیلئے

ترکیب: میدہ اور نمک کو ملا کر اس میں گھی

ملائیں اور خوب اچھی طرح ان کا یکجان کرلیں حتیٰ کہ یہ چورے کی طرح ہو جائے۔ اب آہستہ آہستہ ٹھنڈا پانی ملائیں اور اچھی طرح سخت آٹا گوندھ لیں۔ پیڑے پر ہلکا سا میدہ چھڑک کر بیل اور پیسٹری کے رول کے لیے کاٹ لیں۔

☆☆☆

چکن سینڈوچ

اجزاء:

ڈبل روٹی (باریک سلائس کرلیں) ایک
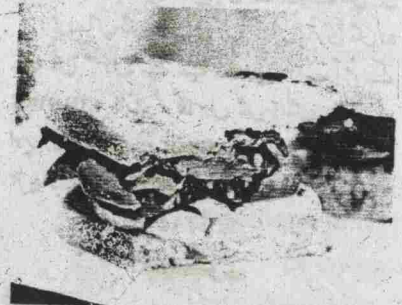
مرغی کا گوشت (خوب اُبلا ہوا)	2 پیالی
پیاز، بڑی (باریک کاٹ لیں)	ایک
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں)	ایک
ککڑی (کدوش کرلیں)	آدھی
مایونیز	ایک پیالی
مکھن	ایک ٹکیا، چھوٹی
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب: مرغی کے گوشت میں ٹماٹر، ککڑی، نمک، کالی مرچ اور پیاز ملا دیں۔ اس کے بعد مایونیز ملائیں۔ ایک سلائس پر مکھن لگائیں اور دوسرے سلائس پر تھوڑا آمیزہ رکھیں۔ پھر دونوں کو ملا کر دبا دیں۔ اس کے بعد آڑا کاٹ لیں۔ تولیہ گیلا کر کے نچوڑ لیں اور سینڈوچ پر رکھیں تاکہ وہ سخت نہ ہوں۔

☆☆☆

انڈے اور پنیر کلب سینڈوچ

اجزاء:

سخت ابلا ہوا انڈہ ایک عدد

مکھن لگے ہوئے سلائس	3 عدد
کریم (چیز)	حسب ضرورت
سیب (اچھی طرح کچلا ہوا)	ایک عدد

ترکیب: انڈے کے ٹکڑے کر کے سلائس پر رکھ دیں۔ اس پر نمک، کالی مرچ چھڑک کر دوسرا سلائس رکھ دیں۔ پنیر میں سیب ملا دیں۔ ذائقے کے لیے اس میں نمک ملا دیں۔ اس کو سلائس پر لگائیں اور تیسرا سلائس اس کے اوپر رکھ دیں۔ لیجیے مزیدار سینڈوچ تیار ہے۔

بزمِ شاعری

نظم

ملنے کی تڑپ تھی سفر کا سامان بھی تھا
کشتی میں قدم رکھا تو دریا بپھر گئے
ان محفلوں میں جانے کا اب یارا نہیں رہا
یادوں کے حسین خواب تھے فضا میں بکھر گئے
شب فرقت کی کلفتوں میں ہم ڈوبے رہے مدام
بے خودی کا عالم تھا کہ گھر سے نکل گئے
پھولوں کی روشیں قدموں میں چمن میں چہچہاتی بلبلیں
آفتیں اتنی پڑیں کہ زندگی کے ترانے وسر گئے
وقت زخموں کی مرہم وقت کے فیصلے بے بدل
وقت پر پتہ چلا جب سب چھوڑ گئے بچھڑ گئے
زندگی میں تکمیل مقاصد کی کبھی منزل نہ پا سکے
نقطۂ عروج پر جب بھی پہنچے پاؤں اکھڑ گئے
کچھ اس انداز سے ہوئیں راہیں جدا جدا
سازشوں کے زہریلے تیر تھے سینے میں اتر گئے
کہنے کو چند روز تھے مگر یوم حشر سماں
صبر بنی آدمؑ کا خاصہ ہے وہ بھی گزر گئے

(قاضی محمد یوسف۔ مسقط)

غزل

تمنا ہے تجھے اک بار دیکھوں
تمہیں دیکھوں نہ پھر سنسار دیکھوں
فسانے تو سنے ہیں تیرے لیکن
میں چاہوں پر ترا کردار دیکھوں
میں دیکھوں جو تجھے جل جائے دنیا
میں جیت اپنی کسی کی ہار دیکھوں
مسافت طے کروں اور کرتی جاؤں
نہ خود کو میں کبھی لاچار دیکھوں
میں رو دیتی ہوں اکثر بے حسی پر
کبھی بھولے سے جب اخبار دیکھوں
گزرتا جا رہا تھمتا نہیں ہے
میں بیٹھی وقت کی رفتار دیکھوں
مجھے معلوم ہے میں کچھ نہیں ہوں
میں اپنے کو کیوں بے کار دیکھوں
میں اس کو بھول کر بھولی نہیں ہوں
لکھے حرفوں کو میں سو بار دیکھوں
خفا تھی زندگی سے میں کنول تو
یہ کیسے ہو گیا ہے پیار دیکھوں

(یاسمین کنول، پسرور)

گھروالی کی یاد

اک بھلا مانس کہیں تھا سیر کو آیا ہوا
شہر تھا وہ اجنبی ہوٹل میں آ کر وہ رہا
ایک دن اک شوخ سی ویٹر سے یہ اس نے کہا
آج میرے واسطے لاؤ تم ایسا ناشتہ
ایک انڈہ وہ بھی گندا اور کچا سا تلا
توس ہو یوں جل کے کالا جیسے کہ ہو دل جلا
اور جب رنگیں ادا نے ناشتہ حاضر کیا
سانس ٹھنڈی بھر کے اس نے یہ کہا
سامنے بیٹھ میرے اور گالیاں کچھ مجھ کو دو
ایک چمچہ بھی اٹھا کر میرے سر پر مار دو
آج جو کچھ منہ میں آتا ہے تمہارے وہ کہو
ہر طرح لعنت ملامت سے نہ کچھ پیچھے ہٹو
میں ہر اک ارشاد پر کرتا رہوں گا صاد صاد

آ رہی ہے آج مجھ کو اپنی گھر والی کی یاد
(پروفیسر محمد ظریف خان، کراچی)

اب پھر وہ اختر یاد آنے لگے ہیں
(وسیم اختر، راولپنڈی)

غزل

خس وخاشاک میں گم ہوگئے وہ وفا کے موتی ڈھونڈنے لگا ہوں
ایک سنہرے خواب کی آرزو میں اپنی آنکھیں موندنے لگا ہوں
چمن میں، محفلوں میں، گزرگاہوں میں، خواب گاہوں میں
ایک مخصوص مہک کی تلاش ہے میں اسی کو سونگھنے لگا ہوں
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ یہ کہنا ناامیدی ہے!
میں غنچہ ہائے امید لے کر وفا کے ہار گوندھنے لگا ہوں
بصیرت افروز ہیں آنکھیں میری، اوجھل چیزوں کو دیکھ لیتا ہوں
زندگی کی حقیقتوں کو اپنی تیز نظروں سے کھوجنے لگا ہوں
اختر نارسا کی کوشش سے زندگی کی طنابیں کھنچنے لگی ہیں
آخری سانسوں کو گن گن کر میں اک لڑی میں پرونے لگا ہوں
(رشید اختر قادری۔ کراچی)

غزل

جنہیں ڈھونڈنے میں زمانے لگے ہیں
ملے تو پھر پل بھر میں ملے ہیں
ایسی تنہائی سے خدا ہی بچائے
جسے دیکھ کر لوگ ڈرنے لگے ہیں
باغبان پہ کیسے اعتبار کریں ہم
اس چمن کے جب سارے شجر کٹے ہیں
کس سے کہوں کس کو کیا سناؤں
اک وہ نہیں میرے بہت اور مرے ہیں
شہر کی گلیوں میں خون یہ کیسا
لگتا ہے جیسے یہاں قاتل پھرے ہیں
دھوپ کی تیزی کا پتہ چلتا ہے
مرے آنگن کے پھر سارے شجر جلے ہیں
بھولے تھے مدتوں میں انہیں ہم

غزل

دولت نہ ملک و مال نہ عزو وقار دے
میں تیرا بن سکوں، مجھے یہ افتخار دے
تم سے کوئی سوال نہیں، حاکمانِ وقت!
جو کچھ میں چاہوں، وہ مجھے پروردگار دے
خاموش رہ کے میں نے گزاری تمام رات
میرے لبوں کو نغمہ، صبح بہار دے
ہے بے قرار جس کے لیے روح شاعری
یا رب! وہ شعر تو میرے دل میں اُتار دے
عمر عزیز جیسی کٹی، کٹ گئی امتیاز
باقی ہے جو وہ اس کی طلب میں گزار دے
(ایس۔امتیاز احمد، کراچی)

غزل

خوابِ عکس بن کر آئینۂ سحر سے اُتر گئی میں
اب ڈھونڈو گے تم کہاں فضاؤں میں بکھر گئی میں
یاد کرو اس وقت دی صدائے نوید تم نے مجھے
کہ شکستہ پا تیری دہلیز سے جب اُتر گئی میں
رات بہا لے گئی تھی مرے خواب و خیال سبھی
صبح ہے کہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے وہ کدھر گئی میں
بھولا ہوا اک راگ چھیڑا ہے پرندوں نے آج
یوں لگتا ہے جیسے خیال میں انکے ٹھہر گئی میں
اب یاد نہیں وہ آداب و اطوار تری محفل کے
ایک مدت ہوئی رابطوں کے سفر سے گزر گئی میں
بارشیں اس طرح برسیں صحرا کی ریکھاؤں پر
کرب آلود بادلوں کی رگ و پے میں اُتر گئی میں
بہاروں کے رنگ بھی مٹا نہ سکے دل کے داغ کو
یہ خلش تو سائے کی طرح ساتھ گئی جدھر گئی میں

تری تقدیس کی گواہ بنی تاریخ ایک بار پھر
اگرچہ شہر یزید وقت ننگے سر گئی میں
(عصمت اقبال عین، منگلا ڈیم)

غزل

پنچھی کوئی قفس میں بیزار تو نہیں
میرا وجود راہ کی دیوار تو نہیں
سورج سے اختلاط کی ہو منتظر وہاں
دنیا کوئی افق کے اس پار تو نہیں
کھینچی ہے مجھ پہ تیغ ستم کس لئے حضور
الفت کا ایک میں ہی "سزاوار" تو نہیں
میں نے کہا وفا و جفا میں ہو اعتدال
کہنے لگی یہ پیار ہے بیوپار تو نہیں
پھینکا ہے جس نے پھول کی زد میں چھپا کے تیر
دشمن کی صف میں کوئی میرا یار تو نہیں؟
شب بھر میں آہِ سرد سے بے چین سا رہا
بچہ کوئی پڑوس میں بیمار تو نہیں؟
ہر ایک بات پر جو انہیں اختلاف ہے
زاہد کہیں یہ پیار کا اظہار تو نہیں؟
(زاہد محمد علی، شکر گڑھ)

زردرُت میں آواز نہ دینا ہمیں

زردرُت میں آواز نہ دینا ہمیں
ہم مڑ کے نہ دیکھیں گے
کہ زردرُتوں کے
بہت سے زخموں کا
حساب لینا ہے ہمیں
جواب پوچھنا ہے ہمیں
ہم سے روٹھے ہوئے ہیں
نصیب ہمارے!......
ان نصیبوں کو منانا ہے ہمیں
کسی کو اپنا بنانا ہے ہمیں
کوئی صدا وا نہیں سہارا نہیں
کوئی پیارا نہیں
پھر بھی پکارتا ہے ہمیں
کسی سے کچھ کہنا ہے ہمیں
طوفانوں سے لڑنا ہے ہمیں
دلوں کو موم کرنا ہے ہمیں
زردرُتوں سے
وابستہ ہیں جو یادیں
ان کو سنانا ہے ہمیں
نصیب اپنا جگانا ہے ہمیں
زردرُت میں آواز نہ دینا ہمیں
نہ بلانا ہمیں
نہ پکارنا ہمیں
ہم مڑ کے نہ دیکھیں گے
(مہر نسیم، لاہور کینٹ)

اجنبی اجنبی

ہم سفر بن کے ہم ساتھ ہیں آج بھی
پھر بھی ہے یہ سفر اجنبی اجنبی
راہ بھی اجنبی، موڑ بھی اجنبی
جائیں گے ہم کدھر اجنبی اجنبی
زندگی ہو گئی ہے سلگتا سفر
دُور تک آ رہا ہے دھواں ہی نظر
جانے کس موڑ پر کھو گئی ہر خوشی
دے کے درد جگر اجنبی اجنبی
ہم نے چمن چمن کے تنکے بنایا تھا جو
آشیاں حسرتوں سے سجایا تھا جو
ہے چمن میں وہ آشیاں آج بھی
لگ رہا ہے مگر اجنبی اجنبی

کس کو معلوم تھا دن یہ بھی آئیں گے
موسموں کی طرح دل بھی بدل جائیں گے
دن ہوا اجنبی رات بھی اجنبی
ہر گھڑی، ہر پہر، اجنبی اجنبی
(مدن پال)

پیار کا رشتہ

کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تنہا کیوں ہے
وہ جو اپنا تھا وہی اور کسی کا کیوں ہے
یہی دنیا ہے تو پھر ایسی یہ دنیا کیوں ہے
یہی ہوتا ہے تو پھر ایسا ہی ہوتا کیوں ہے
اک ذرا ہاتھ بڑھا دیں تو پکڑ لیں دامن
اس کے سینے میں سما جائے ہماری دھڑکن
اتنی قربت ہے تو پھر فاصلہ اتنا کیوں ہے
دل برباد سے نکلا نہیں اب تک کوئی
اک نئے گھر میں دیا کرتا ہے دستک کوئی
آس جو ٹوٹ گئی پھر سے بندھاتا کیوں ہے
تم مسرت کا کہو یا اسے غم کا رشتہ
کہتے ہیں پیار کا رشتہ ہے جنم کا رشتہ
ہے جنم کا یہ رشتہ تو بدلتا کیوں ہے
(کیفی اعظمی)

دو عادتیں

میری دو عادتیں تھیں
ایک سگریٹ......ایک محبوبہ
کہا احباب نے مجھ سے
کہ محبوبہ کو چھوڑا جا بھی سکتا ہے
مگر سگریٹ نہیں چھٹتا
کہا میں نے
اے میرے جہاں دیدہ رفیقو، دوستو
سن لو!
تمہارے تجربوں سے معذرت کرتے ہوئے
سگریٹ کو چھوڑا آج سے میں نے
مگر وہ میری محبوبہ......؟
وہ اب دہرا سرور زندگی دینے کو
سگریٹ کی طرح میرے لبوں کی لاج رکھے گی
نہ ہونے دے گی سگریٹ کی کمی محسوس وہ مجھ کو
میری اب ایک ہی عادت ہے
محبوبہ......
(قتیل شفائی)

کچھ لوگ

دنیا کی لمبی راہوں پر ہم یوں تو چلتے جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو یاد ہمیشہ آتے ہیں
وہ راہ بدلتے ہیں اپنی اور مڑ کر ہاتھ ہلاتے ہیں
لیکن وہ دلوں کو یادوں کی خوشبو بن کر مہکاتے ہیں
ایسے ہی سفر کرتے کرتے ایک شخص ملا ہم کو بھی کہیں
دنیا میں اچھے لوگ بہت لیکن اس کی سی بات نہیں
وہ دھیمے لہجے والا تھا اور دھیرے سے ہنستا تھا
جتنے بھی لوگ ملے ہم کو سچ مانو سب سے اچھا تھا
تھی لاگ نہ اس کے بولوں میں، کی بات نہ کوئی لگاوٹ کی
اسکے فقرے ٹوٹے ٹوٹے، اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی
کہہ کر ہی نہ دے جو ہم چاہیں، سوچا ہی کرے بیٹھا بیٹھا
پر دیکھے ایسی نرمی سے ایک بار تو ہو جائے دھوکہ
گو ساتھ ہمارا خوب رہا اس کو نہ ہوئی پہچان بہت
گر بوجھ لے دل کی بات کبھی ہو جاتا تھا حیران بہت
اور ہم اس کی حیرانی پر شرمندہ ہو کر رہ جاتے
کچھ اور ہمارا مطلب تھا پھر دیر تلک سمجھاتے
اب چہرہ اُجلا ہو یا آنکھیں اس کی ہوں گہری
یا اس کے پیارے ہونٹوں کی ہر بات لگے ٹھہری

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک منفرد
تحقیقی اور عظیم پیشکش
قرآنی وظائف نمبر
شائع ہو گیا ہے

- یہ وظائف ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں، الجھنوں اور مشکلات کا حل ہیں۔
- قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل یہ وظائف آسان، سادہ اور عام فہم زبان میں اس طور سے پیش کیے جا رہے ہیں کہ ہر قاری بھی ان پر بغیر کسی دشواری کے عمل پیرا ہو کر ان قرآنی وظائف سے اپنی بگڑی بنا سکے۔
- اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مصدقہ آزمودہ اور پُراثر قرآنی وظائف۔
- انشاء اللہ یہ نمبر بھی ماضی کی طرح آپ کی امنگوں پر پورا اُترے گا۔

قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 7245412

کچھ لوگ جو اچھے ہوتے ہیں اور راہوں میں مل
جاتے ہیں
ہیں ان کو اپنے کام بہت، کب اپنا وقت گنواتے ہیں
کب پیاسے پیاسے رہتے ہیں
کب جی کو روگ لگاتے ہیں

(فہمیدہ ریاض)

یاد

کبھی کبھی کوئی یاد
کوئی بہت پرانی یاد
دل کے دروازے پر
ایسے دستک دیتی ہے
شام کو جیسے تارا نکلے
صبح کو جیسے پھول
جیسے دھیرے دھیرے زمین پر
روشنیوں کا نزول
جیسے روتے روتے اچانک
ہنس دے کوئی ملول
کبھی کبھی کوئی یاد
کوئی بہت پرانی یاد
دل کے دروازے پر
ایسے دستک دیتی ہے

(عبیداللہ علیم)

کوئی اپنا نہیں

اس دنیا میں سب ہیں اکیلے۔
کوئی کسی کا نہیں
کیسی محبت، کیسی وفائیں، کیسے پیار کے سپنے
آج خیالوں میں بھی نہیں ہیں ساتھ جو تھے کل اپنے
جھوٹے ہیں سب جگ کے میلے
سایہ بھی اپنا نہیں
کاغذ کی ایک ناؤ ہے، جیون کا کوئی نہیں ہے مانجھی
بیچ بھنور میں کون بنا ہے ڈوبتے من کا ساتھی
کہتے ہیں موجوں کے ریلے
کوئی کنارا نہیں

(صہبا اختر)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

نام:............ تعلیمی قابلیت:............
عمر:............ پسندیدہ شاعر:............
پسندیدہ غزل/نظم:............
مشاغل:............ تاریخ پیدائش/برج:............
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:............ پتہ:............
ای میل:............

یہاں اپنی
تصویر
منسلک کریں

نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا 'مزاج' اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

انٹرنیٹ فراڈ کے نت نئے طریقے

عارف محمود اپل

پاکستان میں ستر فیصد سائبر کرائم کا تعلق جعلی کریڈٹ کارڈ فراڈ سے ہے، نت نئے طریقوں سے سادہ لوح لوگوں کو لوٹا جا رہا ہے!

کمپیوٹر کی ایجاد سے جہاں لوگوں کو بے شمار فوائد حاصل ہوئے ہیں اور ان کے لئے ترقی کی ایسی نئی راہیں کھلی ہیں جن سے وہ اس سے پہلے واقف نہ تھے، وہیں بے شمار فراڈ کے نت نئے طریقوں نے انہیں پریشان کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے فراڈ کرنے والے جرائم پیشہ افراد کی ایک نئی نسل سامنے آ رہی ہے جو پاکستان سمیت پوری دنیا میں آباد ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے

فراڈ کرنے والے اپنے نت نئے طریقوں سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو کثیر رقوم سے محروم کر چکے ہیں۔ مالی فراڈ کرنے والے ہر بار کوئی نیا طریقہ ڈھونڈتے ہیں اور جب کوئی طریقہ پرانا ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے آشنا ہو جاتے ہیں تو ان کا شاطر دماغ پھر کوئی نیا طریقہ دریافت کر لیتا ہے۔ انٹرنیٹ کرائم کی چند بڑی اقسام میں آکشن فراڈ، کریڈٹ کارڈ فراڈ، ملازمت اور کاروباری مواقع سے متعلق فراڈ، آن لائن لاٹری، نائیجیرین خط (ای میل)، کسی شخص کی ہیک کی ہوئی ای میل کے ذریعے فراڈ، آن لائن بینک اکاؤنٹ کی جعلی ای میل وغیرہ شامل ہیں لیکن اب کچھ عرصے سے ان فراڈیوں نے فیس بک کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

آن لائن یا انٹرنیٹ فراڈ میں اگرچہ غلط نام وغیرہ استعمال ہوتا ہے لیکن ان میں زیادہ تر خواتین کے نام اور تصاویر استعمال کی جاتی ہیں مگر اب فراڈیوں نے خواتین کی تصاویر کی بجائے امریکی اور برطانوی فوجی افسروں کی تصویریں استعمال کرنا شروع کر دی ہیں اور خود کو ایک لڑکی ظاہر کرنے کی بجائے فوج کا ایک اعلیٰ افسر ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔ چند سال پہلے تک نائیجیریا یا کسی دوسرے افریقی ملک کی رہنے والی ایک لڑکی کی طرف سے ای میل آیا کرتی تھی کہ وہ اس ملک کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے والدین ایک حالیہ بغاوت میں مارے جا چکے ہیں۔ اب وہ اس ملک میں نہیں رہنا چاہتی اور چاہتی ہے کہ کسی طرح اس ملک سے باہر نکلا جائے مگر اس کے پاس اس کے والدین کی طرف سے ملنے والے ورثے میں کئی سو ملین ڈالر ہیں جو وہ چھوڑنا نہیں چاہتی کیونکہ وہی اس کا اثاثہ ہے وگرنہ اس کے بغیر وہ کسی دوسرے ملک میں کیسے رہ پائے گی۔ اسے کسی دوست یا ساتھی کی ضرورت ہے جو اس خزانے کو ملک سے باہر لانے میں اس کی مدد کر سکے اور اس مدد کے عوض اسے 20 فیصد سے 50 فیصد کمیشن دینے کا بھی وعدہ کرتی ہے۔

اگر کسی ایک یا کئی افراد کی طرف سے اسے جواب مل جائے تو وہ لڑکی اپنی اگلی میل میں بتاتی ہے کہ وہ رقم ایک بیگ میں اس نے کسی طریقے سے ایک کوریئر کمپنی کے ویئر ہاؤس میں رکھوائی ہوئی ہے اور اسے وصول کرنے کے لیے اس کمپنی سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کمپنی یہ بیگ صرف اسی شخص کے حوالے کرے گی جو پن کوڈ جو اس کمپنی نے اس مال یا بیگ کی وصولی کے وقت الاٹ کیا تھا بتائے۔ ساتھ ہی وہ لڑکی یہ بھی بتاتی ہے کہ کیونکہ وہ ابھی نوعمر ہے اور اسے کوئی زیادہ تجربہ نہیں ہے اس لیے وہ یہ نہیں جانتی کہ کس پر یقین کیا جائے اور کس پر یقین نہ کیا جائے کیونکہ اسے یہ خدشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جس شخص پر یقین کر رہی ہو وہی ساری رقم وصول کر کے خود ہڑپ کر جائے اور اسے کچھ نہ مل سکے۔ جب کوئی شخص اس لڑکی کی باتوں میں آ جاتا ہے اور اسے اپنے ایماندار ہونے کا یقین دلاتا ہے تو وہ لڑکی اسے اس کمپنی کا ایڈریس اور فون نمبر بتاتی ہے کہ اس کمپنی سے رابطہ کر کے اس نام کے ریفرنس سے معلومات حاصل کرے کہ اس بیگ کی اب کیا پوزیشن ہے اور اسے کیسے وصول کیا جا سکتا ہے۔ فون یا ای میل کے ذریعے جب اس کمپنی سے رابطہ کیا جاتا ہے تو کمپنی کی طرف سے جواب آتا ہے کہ اس بیگ کو مس فلاں نے رکھوایا ہے اور اسی خاتون کو دیئے گئے پن کوڈ کے ذریعے وصول کیا جا سکتا ہے مگر مس فلاں نے یہ بیگ چھ ماہ قبل یا دس ماہ قبل رکھوایا تھا اور ویئر ہاؤس کے اخراجات اتنے (500 ڈالر یا پھر کچھ بھی اماؤنٹ بتائی جاتی ہے) اور ساتھ ہی کوئی ایڈریس یا اکاؤنٹ نمبر بتایا جاتا ہے کہ یہ اخراجات جمع کروا دیں اور پن

کوڈ بتا دیں تو وہ بیگ آپ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر روانہ کر دیا جائے گا پھر ایسا بھی ہوتا کہ اس کمپنی کی طرف سے بتایا جاتا تھا کہ آپ کے ملک میں بھی ہمارا نمائندہ ہے۔ آپ اس سے رابطہ کر لیں، وہ آپ کو بیگ کی وصولی کا تمام طریقہ بتائے گا۔ اس طرح بے شمار لوگ اتنی بڑی رقم کے لالچ میں اور بعض نوعمر لڑکی کی مہمان نوازی کی خاطر ان کے چکر میں آ جاتے ہیں اور کمپنی کو اخراجات کی مد میں رقم جمع کروا دیتے ہیں اور اس لڑکی کو ای میل بھیجتے ہیں کہ رقم جمع کروا دی ہے۔ اب کوڈ نمبر بھیج دو تاکہ بیگ وصول کیا جا سکے مگر اس کے بعد اس لڑکی کا کبھی جواب نہیں آتا۔ اب چونکہ لڑکیوں کی ای میل کا طریقہ پرانا ہو چکا ہے اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والے اس فراڈ کو سمجھ چکے ہیں لہٰذا حال ہی میں فیس بک پر ان فراڈیوں نے ایک اور طریقہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ چند دن پہلے Micheal Jones نامی ایک شخص نے فیس بک استعمال کرنے والے بہت سے لوگوں کو ایک میسج بھیجا کہ وہ برطانوی فوج کا لیفٹیننٹ کرنل ہے اور یو این او کے مشن پر افغانستان میں تعینات ہے اور اب وہ چند ماہ بعد واپس اپنے ملک جا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ سماجی نوعیت کے کام کرے۔ اس نے لکھا، مجھے معلوم ہے کہ افغانستان سے ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین پاکستان میں پناہ گزین ہیں خصوصاً ان کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس وسائل بھی موجود ہیں مگر ان کا استعمال میں اکیلا نہیں کر سکتا اور چاہتا ہوں کہ کوئی سماجی کام کرنے والے افراد اس خیراتی مشن میں اس کا ساتھ دیں کیونکہ پہلے ہی دو سال سے افغانستان میں جنگ میں مصروف ہوں لہٰذا میں زیادہ وقت تو اپنے گھر اور اپنے بچوں کو دوں گا اور یہاں پر سماجی کاموں کی دیکھ بھال کے لیے ساتھی درکار ہیں۔“

جب کچھ لوگوں نے مذکورہ برطانوی لیفٹیننٹ کرنل کے میسج کا جواب دیا تو انہوں نے آن لائن آ کر یہی کچھ بتایا جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ مزید وہ اپنے مستقبل کے کام کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کے سماجی کاموں کے لیے کیسی این جی او بنائی جائے گی اور اس میں کیسے لوگ شریک ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں کہتا ہے کہ میں اس وقت فوجی کیمپ میں ہوں اور میرے ماتحت افسر آ رہے ہیں لہٰذا باقی باتیں پھر کریں گے کیونکہ ابھی میرے یہاں افغانستان میں مزید تین ماہ ہیں اور ساتھ ہی وہ آف لائن ہو جاتا ہے۔ چند روز کے توقف کے بعد وہی لیفٹیننٹ کرنل ایک اور میسج کرتا ہے اور سب سے پہلے معذرت کرتا ہے کہ اس روز مجھے آف لائن ہونا پڑا اور تمام باتیں نہ ہو سکیں۔ وہ بتاتا ہے کہ افغانستان کے صوبے خوست میں طالبان کے ساتھ ایک جھڑپ میں جب ان کے ٹھکانے پر قبضہ کیا گیا تو وہاں سے بہت سا مال و اسباب ہمارے ہاتھ لگا۔ جب امریکی حملے کے بعد طالبان کابل سے فرار ہوئے تو سرکاری خزانے سے بے شمار دولت بھی لے گئے تھے جس میں کئی من سونا بھی شامل تھا۔ اسی سونے کی کھیپ میں سے 150 کلوگرام سونا ان طالبان کے گروپ کے حصے آیا ہو گا جنہیں ہماری فوج نے خوست میں شکست دی اور ان کے ٹھکانے پر قبضہ کیا۔ آگے وہ لکھتا ہے کہ جب طالبان کے اس ٹھکانے پر قبضہ کیا گیا تو یہ ایک زیر زمین پہاڑی میں مختلف سرنگوں پر مشتمل تھا جس کی ایک سرنگ میں یہ سونا بھی تھا جو میں نے دیگر فوجی ساتھیوں کی نظر میں آئے بغیر وہیں چھپا دیا جبکہ باقی قبضہ شدہ مال کو فوج کے دیگر ساتھیوں نے بانٹ لیا اور اب میں چاہتا ہوں کہ اس سونے کو استعمال میں لا کر ایک تو باقی کی زندگی اچھی گزاری جائے اور دوسرے کوئی این جی او یا ایسا ہی

کوئی ادارہ بنالیا جائے جس سے دکھی انسانیت کی خدمت کی جاسکے اور اس مقصد کے لئے پاکستان سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوسکتی کیونکہ ایک تو پاکستان کے شہری پہلے ہی پاکستان کے دہشت گردی کی جنگ میں ملوث ہونے کی وجہ سے زبوں حالی کا شکار ہیں اور دوسرے سیلاب نے رہی سہی کسر پوری کردی ہے۔"

جب اس برطانوی لیفٹیننٹ کرنل کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ہم اس کے ساتھ ہیں اور مل کر کوئی این جی او بنانا چاہتے ہیں تو اس کرنل نے ایک میل کی اور بتایا کہ اس نے یہ سونا افغانستان میں کام کرنے والی ڈپلومیٹک کوریئر سروس کے پاس رکھوایا ہوا ہے جس کا نمائندہ اسلام آباد میں بھی موجود ہے مگر بہتر ہے کہ اس کمپنی کی ای میل آئی ڈی dipcc@fastservice.com پر بات کی جائے یا پھر فون نمبر 543520071-233+ پر، جو اس کرنل نے اپنے میسج میں روانہ کیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے دیگر معلومات مہیا کیں۔ چونکہ یہ بھی ایک فراڈ تھا لہٰذا جب اس میل کا ذکر ایف آئی اے کے شعبے سائبر کرائم میں کام کرنے والے ایک دوست سے کیا تو سب سے پہلے اس نے fastservice.com کے حوالے سے بتایا کہ اس ڈومین کے بارے میں پہلے بھی ایسی اطلاعات تھیں کہ یہ فراڈ اور جعلسازی میں ملوث ہے لہٰذا یہ ڈومین اب بند ہو چکی ہے اور اس نمبر کے بارے میں انہوں نے معلومات حاصل کیں تو بتایا کہ یہ ایک افریقی ملک گھانا کا نمبر ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس فراڈیے کا تعلق بھی افریقی ملک سے ہی ہے مگر اب ان لوگوں نے لڑکی بننے کی بجائے فوجی بننا شروع کردیا ہے۔

پاکستان میں سائبر کرائم کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی کو سائبر ٹیررازم اور مالیاتی سکیم کے مقدمات کی تفتیش میں خاصی مشکلات کا سامنا ہے کیونکہ ملک میں الیکٹرانک سائبر اور مالیاتی جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی کرنے کی ذمہ دار وزارت انفارمیشن ٹیکنالوجی ماہرین سے محروم ہے اور چند برس قبل بنایا جانے والا پری وینشن آف الیکٹرانک کرائم آرڈیننس ایک مدت گزرنے کے بعد ناقابل عملدرآمد ہے اور پرانے الیکٹرانک ٹرانزیکشن آرڈیننس سے کام چلایا جارہا ہے۔ انٹرنیٹ فراڈ کے حوالے سے ایف آئی اے سائبر کرائم ونگ کے آپریشنل انچارج نے بتایا کہ پاکستان میں انٹرنیٹ پر ہونے والے ستر فیصد جرائم کا تعلق پلاسٹک منی ٹرانزیکشن فراڈ یعنی جعلی کریڈٹ کارڈ فراڈ سے ہے جس کے ذریعے لوگوں کے کریڈٹ کارڈز کے نمبروں کو مختلف طریقوں سے چوری کر کے پیسے نکلوا لئے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ پاکستان میں کریڈٹ کارڈ کے مالک زیادہ تر لوگ اس حقیقت کا ادراک نہیں رکھتے کہ وہ رقم کی ادائیگی کے لیے جب کسی کو اپنا کریڈٹ کارڈ دیتے ہیں تو ان کے ساتھ فراڈ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پاکستان میں 2007ء سے پہلے انٹرنیٹ جرائم (سائبر کرائم) پر قابو پانے کا کوئی واضح قانون موجود نہیں تھا اور پری وینشن آف ای کرائم آرڈیننس کا قانون کافی عرصہ تک متنازعہ رہا تاہم 2007ء میں قانون نافذ ہونے کے بعد بھی انٹرنیٹ جرائم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اس قانون پر عملدرآمد کا اختیار ایف آئی اے کو دیا گیا تھا جو کسی بھی مشکوک شخص یا ادارے کا کمپیوٹر سسٹم، لیپ ٹاپ، موبائل فون، کیمرہ وغیرہ شک کی بنیاد پر اپنی تحویل میں لے سکتی ہے اور متعلقہ شخص کو

سیارہ ڈائجسٹ کی حسبِ روایت ایک اور عظیم پیشکش

والدین نمبر

شائع ہوگیا ہے۔

- ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔
- جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:
- والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایانِ شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کردیا گیا ہے۔

قیمت: 160 روپے

خود بھی پڑھیئے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے

ہر گھر میں پیار و محبت کی تحریک کا آغاز کیجئے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور
فون: 042-7245412

گرفتار بھی کر سکتی ہے۔ ایف آئی اے حکام نے انکشاف کیا کہ پاکستان میں مبینہ طور پر سمگل ہو کر آنے والے "وائٹ کارڈز" پاکستان میں پلاسٹک منی فراڈ یعنی جعلی کریڈٹ کارڈ فراڈ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ یہ وائٹ یا سفید کارڈ جنہیں بعد میں جعلی کریڈٹ کارڈز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، چین، اٹلی، جنوبی افریقہ، سنگاپور، تھائی لینڈ اور ملائیشیا کی مارکیٹوں میں دستیاب ہیں اور انہیں وہاں سے کسی روک ٹوک کے بغیر پاکستان لایا جا رہا ہے۔ دوسرے طریقے میں دکاندار یا تاجر ہیکرز کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ جب گاہک خریداری کرنے کے بعد دکان کے کاؤنٹر پر جا کر رقم ادا کرنے کے لئے اپنا کریڈٹ کارڈ دیتا ہے تو دکاندار گاہک کے کریڈٹ کارڈ پر موجود کوڈ کو پوائنٹ آف سیلز مشین کے ذریعے کاپی کر لیتے ہیں۔ ایک رسید پر خریدار کے دستخط لے کر خود رکھ لیتے ہیں اور دوسری رسید گاہک کو دے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مشین پر موجود ڈیٹا کو میگنیٹک سٹرپ ریڈر یا رائٹر (ایم ایس آر) کے ساتھ منسلک کر کے کمپیوٹر پر اُتار لیا جاتا ہے اور وائٹ کارڈ استعمال کرتے ہوئے اسی طرز کا ایک اور جعلی کریڈٹ کارڈ تیار کر لیا جاتا ہے اور کریڈٹ کارڈ کے مالک کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کے کارڈ کی طرز کا ایک اور کارڈ تیار ہو چکا ہے جس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے۔

ایف آئی اے حکام کے مطابق اس کے علاوہ پاکستان میں ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں جہاں گاہک نے پٹرول ڈلوانے کے لئے پٹرول پمپ کے عملے کو اپنا کریڈٹ کارڈ دیا تو سکر مشین کے ذریعے کارڈ کوڈ (ٹریک ون ٹو) چوری کر لیا گیا اور بعد میں عملے نے رقم کے عوض یہ کوڈ ہیکرز کے حوالے کر دیا۔ ان کے مطابق جرائم پیشہ افراد کے اس طرح کے ہتھکنڈوں کی وجہ سے غیر ملکی سیاح پاکستان آ کر اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرنے سے کتراتے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ملکی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ ملک بھی بدنام ہوتا ہے۔ سائبر کرائم ونگ کے ڈائریکٹر کے بقول پاکستان میں پلاسٹک منی فراڈ کے سب سے بڑے ملزم محمد خان کو چند برس قبل گرفتار کیا گیا جس کے قبضے سے درجنوں وائٹ کارڈز اور ان سے تیار کئے گئے جعلی کریڈٹ کارڈز برآمد کئے گئے۔ محمد خان نے بیرون ملک سے کمپیوٹر میں ماسٹرز (ایم سی ایس) کر رکھا ہے۔ تادم تحریر عدالت نے محمد خان کو چالیس سال قید کا حکم سنایا ہے اس کے علاوہ گزشتہ برسوں میں ایف آئی اے نے سائبر کرائم کے کئی کیسز رجسٹر کئے جن میں سے زیادہ تر کیس جعلی کریڈٹ کارڈز سے متعلقہ تھے۔ حکام کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں درجنوں افراد کو گرفتار کیا گیا ہے اور کروڑوں روپے کی بازیابی کی گئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس فراڈ سے بچا کس طرح جائے؟ پہلا طریقہ جس کے تحت جرائم پیشہ افراد کسی بینک کے کمپیوٹر نیٹ ورک تک رسائی حاصل کر کے اس کا ڈیٹا چوری کرتے ہیں اور ان معلومات کو اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کرنے کے بعد سادہ کارڈ یعنی وائٹ کارڈز پر کوڈنگ کر کے جعلی کریڈٹ کارڈز تیار کر لیتے ہیں، اس سے ایف آئی اے حکام کے مطابق عام آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ دوسری صورت جس میں لوگ اپنا کارڈ دکانوں یا پٹرول پمپوں پر رقم کی ادائیگی کے لیے دیتے ہیں اس میں فراڈ سے بچنے کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ جب آپ دکان یا پٹرول پمپ پر کارڈ دیتے ہیں تو اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل مت ہونے دیں۔ سیلز مین پر نظر رکھیں یعنی اس کارڈ کے ذریعے رقم کی ادائیگی اپنے سامنے کروائیں۔ واضح رہے کہ پاکستان کے علاوہ جعلی کریڈٹ کارڈ فراڈ تقریباً پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔

سیارہ مشورہ کلینک (قسط 3)

ڈاکٹر ندیم چوہدری

ڈاکٹر ندیم چوہدری 28 سال سے لاہور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ آپ نے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، آیورویدک سائنس اور یونانی سسٹم آف میڈیسن کا بغور مطالعہ کر رکھا ہے۔ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے آپ تمام طریقہ ہائے علاج میں سے مناسب ترین ادویہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس گروپ کی دوائی تجویز کی جاتی ہے بالکل اسی گروپ کی غذا بھی مریض کو استعمال کروائی جاتی ہے۔ نتیجتاً مریض کی تکلیف بہت جلد کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور مریض اپنے مرض سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ ہر طرح کے مرض کا علاج کرتے ہیں لیکن بالخصوص آپ کو معدہ، جگر اور جنسی امراض کے علاج میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ہزاروں مریض آپ کے ذریعے سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس فن میں مزید ترقی دے (آمین)

آپ میڈیکل ریسرچ سکالر بھی ہیں۔ آپ کے مضامین کئی نیشنل اور انٹرنیشنل اخبارات اور رسالوں مثلاً حکایت، نوائے وقت، دبئی نیوز وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بہت زیادہ طبی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے ان معلومات پر عمل کیا اور نتیجتاً وہ صحت مند زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سیارہ ڈائجسٹ نے آپ کی طبی خدمات سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو دعوت دی ہے کہ اپنی طبی قابلیت کے جوہر ان صفحات کی زینت بنائیں۔ اس ماہ کا مشورہ کلینک آپ کے سامنے ہے۔

ڈپریشن کا مریض ہوں

اس ماہ کا پہلا خط ملتان سے موصول ہوا ہے۔ خط بھیجنے والے میاں منیر احمد صاحب ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ میں محکمہ ٹیلی فون میں ملازمت کرتا تھا۔ جب گولڈن شیک ہینڈ سکیم آئی تو میں نے بھی اپلائی کر دیا۔ یوں میری ریٹائرمنٹ عمل میں آئی اور مجھے اچھی خاصی رقم محکمہ کی طرف سے ملی۔ کاروبار کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کئی لوگوں کی طرف سے کاروبار میں پارٹنرشپ کی پیشکش ہوئی لیکن میرا اعتماد کسی کے اوپر نہیں تھا۔ بہرحال کافی چھان پھٹک کے بعد دو

بندے منتخب کئے۔ ان بندوں کو کاروبار میں اضافہ کرنے کے لئے میں نے اپنی تین گنا رقم دے دی۔ شروع شروع میں ان دونوں نے مجھے منافع کی مد میں ایک معقول رقم کئی ماہ تک دی لیکن بعد میں دونوں نے کہا کہ کاروبار میں نقصان ہو گیا ہے یعنی منافع کے ساتھ ساتھ میرا اصل زر بھی انہوں نے ہڑپ کر لیا۔ میری باقی ماندہ رقم بھی رفتہ رفتہ مکمل طور پر خرچ ہو گئی۔ اب میری بیٹیاں جوان ہیں اور میرے گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ ان مسائل کی وجہ سے میں مکمل طور پر ڈپریشن کا شکار ہو چکا ہوں۔ رات کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو چین میسر ہے۔ دماغ میں طرح طرح کے وہموں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ طبیعت بجھی بجھی سی رہتی ہے۔ ہر وقت مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ کیا آپ میرا علاج کر سکتے ہیں اور کیا کوئی ایسی دوائی بتا سکتے ہیں کہ جس کو استعمال کرنے سے مجھے سکون میسر آ جائے؟

☆میاں صاحب! آپ کا خط پڑھ کر انتہائی دُکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت دے جو دوسروں کی جمع پونجی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ آج کے زمانے میں کسی پر اعتماد مشکل سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ دنیا میں اچھے لوگ بھی موجود ہیں لیکن تعداد میں تھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کی اچھے لوگوں سے ملاقات کرائے۔ آپ ہمت نہ ہاریں اور کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لیں۔ اس سے آپ کا دل بھی لگ جائے گا اور کچھ آمدن بھی شروع ہو جائے گی۔ نماز پنجگانہ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ مندرجہ ذیل ہومیو پیتھک ادویات ساختہ جرمنی استعمال کریں۔

(۱) Ignatia 30 پانچ پانچ قطرے صبح دوپہر شام ڈائریکٹ زبان پر ڈالیں۔ (۲) اس دوائی کے دس منٹ بعد Kali Phos 12x کی چار گولیاں چوس لیں۔

....

زیادہ نمک کھانے کو دل چاہتا ہے

امجد اقبال سمبڑیال سے لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا مشورہ کلینک ایک عمدہ اور مفید سلسلہ ہے۔ پریشان مخلوق اس سے بہت راہنمائی حاصل کرتی ہے۔ اللہ آپ سب کو بہت ترقی دے (آمین)۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گھر میں جو بھی سالن پکتا ہے اس میں نمک مجھے کم محسوس ہوتا ہے حالانکہ میری والدہ اور بہنیں سخت حیران ہیں کہ ہم تو پہلے ہی عام گھرانوں سے زیادہ نمک مرچ سالن میں ڈالتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ میرے کہنے پر وہ گوندھے جانے والے آٹے میں بھی نمک ملاتی ہیں لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ سالن بھی پھیکا ہے اور روٹی بھی پھیکی ہے۔ ازراہِ کرم اس کا کوئی علاج بتائیں تاکہ میں بھی عام لوگوں کی طرح نارمل کھانا کھا سکوں۔

☆امجد بیٹے! پریشان مت ہوں۔ واقعی کچھ لوگوں میں زیادہ مقدار میں نمک استعمال کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ بہرحال آپ کا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ Nat Mur 12x گولیاں صبح دوپہر شام چوسیں۔ انشاء اللہ آپ کی زیادہ نمک کھانے کی خواہش ختم ہو جائے گی۔ اگر کسی کا بلڈ پریشر بھی ہائی ہو تب بھی یہی دوائی استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس دوائی کے استعمال سے رفتہ رفتہ بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

....

بھوک نہیں لگتی

کراچی سے عماد الدین قریشی لکھتے ہیں، ڈاکٹر

صاحب میں بھوک کی کمی کا شکار ہوں۔ میرا وزن دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے میرا وزن 75 کلو تھا جو کہ اب کم ہو کر 60 کلو رہ گیا ہے۔ طبیعت میں عجیب چڑچڑا پن ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں۔ نیند بھی ٹھیک طرح سے نہیں آتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آ جاتا ہے۔ پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے اور رفع حاجت کے لیے دن میں کئی بار واش روم جانا پڑتا ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی اچھا سا نسخہ تجویز کر دیں۔ تازندگی آپ کا مشکور رہوں گا۔

☆عماد الدین صاحب! آپ کے لئے کچھ ہومیو پیتھک ادویات لکھی جا رہی ہیں انہیں پابندی سے استعمال کریں۔ انشاء اللہ آپ تندرست ہو جائیں گے۔

(۱) Alfalfa Q کے دس دس قطرے آدھا کپ پانی میں صبح دوپہر شام کھانے سے آدھا گھنٹہ پہلے پی لیا کریں۔

(۲) Nux Vomica 200 کی ایک خوراک رات کو سوتے وقت ایک ماہ تک استعمال کریں۔

....

بلڈ پریشر کی تکلیف ہے

گجرات سے نصیر وڑائچ صاحب لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! میں ایک پریشان حال آدمی ہوں۔ خدارا میرے لئے کچھ کیجئے۔ پچھلے سال میری پوری فیملی یعنی بیوی اور بچے اپنی کار پر راولپنڈی سے گجرات کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں ایک ٹرک کے ساتھ حادثہ ہو گیا۔ گاڑی بھی مکمل طور پر تباہ ہو گئی اور میرے گھر کے تمام افراد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ خبر سن کر میرے اوپر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن...... میں سکون کی نیند نہیں سو سکا۔ میرا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے اور دل کی بے چینی اور گھبراہٹ سے بُرا حال ہے۔ میرے لئے کوئی نسخہ تجویز کیجئے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆جناب وڑائچ صاحب! آپ کی کہانی واقعی رُلا دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپنے دل کو سکون میں رکھیں۔ پریشانیاں اور مصیبتیں تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور ولیوں پر بھی آتی رہی ہیں۔ اپنے آپ کو اللہ کی یاد کی طرف موڑ لیجئے۔ وہی سب سے بہتر پناہ دینے والا ہے۔ اگر حالات اجازت دیں تو کوئی خدمت خلق کا کام شروع کر لیجئے۔ رفتہ رفتہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے گا اور آپ پرسکون ہو جائیں گے۔ اپنا بلڈ پریشر باقاعدگی سے چیک کرواتے رہیں۔ ذہنی پریشانی اور جسمانی محنت سے بچیں۔ نمک کا استعمال کم کریں اور اپنا وزن بھی کم کرنے کی طرف توجہ دیں۔ چکنائی، تمباکو اور کافی سے پرہیز کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں:

(۱) Glonoinum 30 دوائی کے پانچ قطرے صبح دوپہر شام زبان پر ٹپکائیں۔

(۲) اگر بلڈ پریشر کم یا زیادہ ہو جاتا ہے تو Crategus Q کے 10 قطرے دن میں تین مرتبہ پانی میں ڈال کر پی لیں۔

....

ٹھنڈی چیزیں کھانے سے اسہال ہوتے ہیں

خالد جمال صاحب دیپالپور سے لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! ویسے میرا معدہ ٹھیک ہے۔ پیٹ میں گیس بھی نہیں بنتی۔ بھوک بھی خوب لگتی ہے لیکن جب بھی میں کوئی ٹھنڈی یا برف والی چیز کھا پی لوں تو فوراً اسہال شروع ہو جاتے ہیں مثلاً اگر میں آئس کریم کھا لوں یا کوئی بوتل پیوں تو مجھے فوراً یہ مسئلہ ہو

جاتا ہے۔ میں ان چیزوں کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا چنانچہ اکثر بدپرہیزی ہو جاتی ہے اور مجھے بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔ اس سے مجھے بہت جسمانی کمزوری ہو جاتی ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی دوائی تجویز کریں جس سے میں اس پریشانی سے بچ سکوں۔

☆خالد صاحب! آئندہ جب بھی کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جائے تو آپ ہومیو دوائی ARS-ALB-30 کی چند خوراکیں لے لیا کریں۔ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ شکایت آپ کے نظام انہضام کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایسا عموماً ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو عام طور پر بیٹھے رہتے ہیں اور محنت مشقت کا کوئی کام نہیں کرتے۔ آپ کوئی کسرت کا کام کیا کریں یا روزانہ ورزش کو اپنا معمول بنا لیں جب آپکے جسم کی طبعی حرارت پوری ہو جائے گی تو آپ کا یہ مسئلہ مکمل طور پر ختم ہو جائے گا اور آپ ایک نارمل اور صحتمند زندگی گزار سکیں گے۔

....

نیند کی حالت میں خراٹوں کا مسئلہ

ساہیوال سے عبدالرحمٰن رندھاوا لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! اللہ آپ کو خوش رکھے اور سیارہ ڈائجسٹ کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ میرے والد صاحب جب رات کو سوتے ہیں تو اونچی آواز میں خراٹے لیتے ہیں۔ ان کی اس شکایت کی وجہ سے پورے گھر والے تنگ ہیں۔ ہمارا مشترکہ خاندانی نظام ہے اور ہم ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان خراٹوں کی آواز پورے گھر میں گونجتی ہے۔ مہربانی فرما کر ان کے لئے کوئی دوائی تجویز فرمائیں تا کہ ان کو اس شکایت سے نجات مل جائے۔

بیٹے عبدالرحمٰن! پہلی بات تو یہ کہ آپ اپنے والد صاحب کو پہلو کے بل سونے کی تلقین کریں کیونکہ عام طور پر سیدھا لیٹنے والے لوگوں میں خراٹوں کی شکایت پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ان کا وزن زیادہ ہے تو اسے کم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ان کو معدے کی کوئی تکلیف ہے مثلاً پیٹ میں گیس وغیرہ بنتی ہے تو اس کا علاج کرایا جانا ضروری ہے۔ اگر ان کے منہ میں پانی زیادہ آتا ہے تو اس کا بھی مناسب علاج ہونا چاہیے۔ اگر قبض موجود ہو تو اس کے تدارک کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل دوائی استعمال کریں۔ OPIUM 6 صبح شام استعمال کریں۔ انشاء اللہ وہ خراٹوں کی شکایت سے نجات حاصل کر لیں گے۔

....

مثانے کے کینسر کا شکار ہوں

عباس علی احمد پور شرقیہ سے لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! میں ایک پیچیدہ مسئلے کا شکار ہوں۔ خدارا میری مدد کیجئے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے مثانے میں کینسر کے غدود ہیں جن سے خون رستا ہے۔ یہ دن کو خون سے بھر جاتے ہیں پھر خود بخود پھٹ جاتے ہیں۔ میں نے اس مسئلے کے حل کے لیے آپریشن بھی کرایا ہے لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بعض اوقات بستر میں پیشاب نکل جاتا ہے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلتا۔ براہ مہربانی ہومیو پیتھک طریقہ علاج کے مطابق کوئی دوائی تجویز فرما کر ممنون فرمائیں۔

☆عباس صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو شفا عطا فرمائے۔ آپ مندرجہ ذیل دوائیاں ایک ماہ تک استعمال کریں۔

CAUSTICUM ،ARNICA 200 200 اور CONIUM 200 تینوں دوائیں دن میں ایک مرتبہ استعمال کریں۔ ہر ایک دوائی کے

جھوٹ سچ

ایک صاحب جو ملک بھر میں بہت جھوٹے مشہور تھے، کسی شہر میں آئے تو ان کی شہرت سن کر ایک پچاس سالہ بوڑھی عورت اس سے ملنے آئی اور بولی: ''کیا تم وہی ہو جس سے بڑا جھوٹا اور کوئی نہیں؟''

جھوٹے نے جواب دیا: ''محترمہ چھوڑیے اس بات کو۔ میں تو آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ کمال ہے۔ یہ عمر اور اس پر یہ حسن، یہ جمال، یہ کشش۔ جواب نہیں آپ کا۔''

وہ خاتون شرما کر بولی ''ہائے لوگ کتنے جھوٹے ہیں جو ایک اچھے خاصے آدمی کو جھوٹا کہہ دیتے ہیں۔''

☆☆☆

درمیان چار گھنٹے کا وقفہ رکھیں یعنی صبح دوپہر شام ایک ایک خوراک استعمال کریں۔ اگر علامات برقرار رہیں تو اپنی رپورٹس کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کریں۔ انشاء اللہ آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔

....

بے خوابی کا شکار ہوں

سعید احمد چوہدری چشتیاں سے لکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! میری عمر 38 سال ہے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں کلرک کے طور پر کام کرتا ہوں۔ کام کا بہت زیادہ بوجھ ہے۔ بعض اوقات تو رات گئے تک اوور ٹائم لگانا پڑتا ہے۔ مسلسل کام کرنے سے آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگتے ہیں۔ علاوہ ازیں تفکرات بھی بہت ہیں۔ رات کو نیند بالکل نہیں آتی۔ آدھی رات تک جاگتے جاگتے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ رات کے پچھلے پہر تو نیند کا آنا اور بھی محال ہو جاتا ہے۔ پھر صبح کے وقت اپنے ٹائم کے مطابق اٹھنا انتہائی دشوار محسوس ہوتا ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسی دوائی تجویز کریں جس سے میں پرسکون نیند سو سکوں۔

☆چوہدری صاحب! آپ کام کی زیادتی کی وجہ سے بے خوابی کا شکار ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو ورزش کرنے کا بھی ٹائم نہیں ملتا ہو گا حالانکہ دفتری کام کرنے والے لوگوں کے لیے باقاعدہ ورزش عام لوگوں کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے ایمپلائر سے بات کریں کہ کام کا بوجھ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک یا دو کلرک اور بھرتی کیے جائیں۔ ایسا ہو جانے سے آپ کے کام کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ مزید برآں رات کو سونے سے پہلے ہلکی پھلکی ورزش کو اپنا معمول بنائیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ کمزور اعصابی نظام کے مالک افراد کو خالی پیٹ ورزش نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی غذا پر بھی بھرپور توجہ دیں۔ روزانہ ایک سیب کھائیں۔ کھانا ہمیشہ ٹائم پر پیٹ بھر کر کھائیں۔ دیسی انڈے بھی استعمال کریں۔ کشمش اور بادام بھی آپ کے مسئلے کے حل کے لیے مفید غذائیں ہیں۔ اس کے ساتھ آپ KALI PHOS 30 کے پانچ پانچ قطرے آدھے کپ پانی میں ملا کر صبح دوپہر شام اور رات یعنی دن میں چار ٹائم استعمال کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ رات کو پرسکون نیند سونے لگیں گے اور اپنے آپ کو بالکل نارمل محسوس کریں گے۔

ہر قسم کے ضدی اور پیچیدہ امراض کے مستقل شافی علاج کے لیے ڈاکٹر ندیم چوہدری سے ان فون نمبرز پر رجوع کریں۔

0333-4450636,0313-4450636

سونامی

آسناتھ کنول

پہلی بار کسی نے مجھے خط لکھا تھا تو بھلا نہال کیوں نہ ہوتی۔ میری لکھی گئی سو نظموں کے جواب میں یہ خط جیسے میں نے سنبھال کر رکھا۔ مگر فائدہ کیا ہیرے موتی چھپانے کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں یہ تو دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ لوگ ہماری بیش بہا دولت سے متاثر ہوں اور میرے پاس تو سب سے قیمتی چیز یہی تھی۔

ایک عورت کی کہانی، اک اجنبی نے اچانک اسکی زندگی میں طوفان برپا کر دیا تھا

عجیب سی بات ہے اور حیرت انگیز بھی۔ خیر یہ تو سب کا اپنا اپنا نظریہ ہے کہ وہ کسی بات پر کس حد تک یقین کرتا ہے۔ نہ کریں یقین۔ میں بھی تو نہیں کرتی۔ آپ نے کبھی ہوائی محبت کا نام سنا ہے؟ جی ضرور سنا ہو گا بلکہ اب تو آپ دیکھ بھی رہے ہیں الیکٹرانکس محبت، ٹیلیفونک لو، انٹرنیٹ چیٹنگ کے ذریعے ہونے والی محبت وغیرہ وغیرہ۔ کچھ پرانی محبتیں ہوا کرتی تھیں۔ محبوب کو محض کبھی کبھار ایک نظر دیکھ کر آہیں بھرنا، وصل کی خواہش میں ہجر کا دریا پار کرتے کرتے خود پار ہو جانا۔ کچھ دھانسو قسم کی بڑی عظیم محبتیں بھی ہوئیں جو بے حد مشہور ہیں اور ہزاروں ان سے متاثر ہوئے۔ کئی لوگوں نے تو جانیں گنوا دیں۔

ویسے اگر محبت کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا جائے تو یہ جان لیوا بہت ہے۔ اسکے جان لیوا اثرات کی وجہ سے ہی تو صنف ادب تخلیق ہوئی۔ شاعری، افسانہ، ناول، داستان، کہانی، قصے، سینہ بہ سینہ چلنے والے قصے اور راز، غرض جو کچھ تخلیق ہو سکتا

تھا۔ اس محبت کافر ادا نے تو کئی ایک کیا ہزاروں کو کافر بنایا۔ محبت کے جملہ ستم کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ہر انسان زندگی میں ناکام یا کامیاب، پوشیدہ یا ظاہری کسی نہ کسی محبت کا شکار ضرور ہوتا ہے، وہ لمحاتی محبت ہو، پہلی نظر کی محبت ہو یا پھر طویل مدت تک چلنے والی جو مر کر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کئی تو ایسے سورما گزرے ہیں جن کے لیے ایک محبت کافی نہیں ہوئی۔ وہ ایک زندگی میں کئی محبتیں کرتے اور ان میں کامیاب ہوتے رہے۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں محبت کی ساری گرائمر کھول کر بیٹھ گئی ہوں اب اس کی اقسام بیان کروں گی، اس کے منفی اور مثبت نتائج کو اخذ کروں گی تو قارئین ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ تو بس ایک تمہید باندھنے کی کوشش تھی تا کہ اپنی ہوائی قسم کی محبت کو بیان کر سکوں۔ ابھی تک یہ راز تھا۔ اب خود اسے افشاء کر رہی ہوں۔ ویسے بھی عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو پھر خود ہی کیوں نہ ظاہر کر دوں اور پھر جس بات کا کوئی انجام ہی نہ ہو اس سے ڈر کیسا؟

نام سے واقف تو تھی کہ وہ ایک بڑی شخصیت ہے مگر اس سے ذاتی واقفیت نہیں تھی۔ خواہش تو ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں سے ملا جائے، انہیں دیکھا جائے، ان سے بات کی جائے۔ پھر مجھ جیسے مڈل کلاس لوگوں کے اندر تو یہ خواہش اور بھی تیزی کے ساتھ پنپتی ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ اپنی ادبی دنیا کے درخشاں ستاروں سے ملوں جن کی تحریروں کو پڑھ کر ہم اپنے جملے سنوارتے ہیں، جن کے بے تحاشا علم کی وجہ سے ہم اپنی راہیں تیار کرتے ہیں تا کہ آگے چل کر ان جیسے بن سکیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں میں خود کو تلاش کرتے کرتے میں بھی ایسی بے شمار تمناؤں کی اسیر ہوتی رہی۔ تحریر کی دنیا سے رابطہ بھی تو کوئی ایسی بات نہیں جو ہر شخص کو متاثر کرے اور ہمارا فرمایا ہوا اتنا بھی مستند نہیں ہوتا کہ کوئی مقام دلا سکے۔ بس اسی تگ و دو میں زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی...... گھرداری، بچے، اپنی سوشل مصروفیات، شوہر کی ملازمت کی بے تحاشا مصروفیات، زندگی نے کبھی کھل کر کسی سے محبت کرنے کا وقت ہی نہیں دیا۔ جو چھوٹی موٹی محبتیں راستے میں آتی رہیں وہ کبھی راہ کی دیوار نہ بن سکیں۔ کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو دامن پکڑتا جو راہ روکتا۔ کسی کی آہیں میرے لیے نہیں تھیں۔ کسی نے آنسو نہیں بہائے۔ لمحاتی اور جذباتی بہاؤ سمجھ کر میں بھی یہ ندی نالے عبور کر گئی۔ بالآخر شادی ہو گئی اور پھر زندگی ایک سطح پر ٹھہر گئی۔ اس کی زیریں لہروں میں بے شک کبھی کبھی ہلچل تو ہوتی رہی۔ زندگی کے ٹھہراؤ سے بغاوت ہو سکے یا کچھ ایسا جو تبدیلی پیدا کرے، home sickness مٹا سکے۔ کچھ بھی نہ ہو سکا۔ زمین پر چھائی دھند اور جسم کی تھکن تھپک تھپک کر سلا دیتے۔ بچوں کے کام، مسائل، دیکھ بھال میں اپنا آپ بچتا کہاں ہے۔ میں خود بھی اپنی ذات کے اندر کہیں گم ہو گئی۔ کبھی کبھی موڈ میں ہوتی، وقت ملتا تو خود کو جھاڑ پونچھ کر دیکھتی۔ خود سے سوال کرتی، کیا ہوں؟ کون ہوں؟...... جواب ندارد۔

جب اپنی خوبصورتی اور ہنر مامتا میں ڈھل جائے تو پھر عورت کے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔ سلگنے اور سسکنے کا یہ عمل عملی طور پر ذہن و دل کے ساتھ جسم بھی تباہ کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ ماں کے اندر ایک جیتی جاگتی عورت بھی تھی جو لامحدود خواہشات کو محدود کے پیمانے میں ڈھانپتی رہتی تھی۔ سارے پھیلاؤ سمٹ کر آنکھوں کے اندر قید ہو گئے۔ لفظوں نے زنجیریں پہن لیں۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ اپنے لیے نہیں تھی۔ پھیلتا ہوا بدن بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا۔ دراصل عورت کا کوئی

قصور نہیں۔ یہ سارا قصور اس شعور اور آگہی کا ہے جو ہمیں اندر سے تبدیل کرتی ہے۔ اس خود آگہی نے بے تحاشا اعتماد نے علم نے مجھے بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ پھر زندگی کی اس طویل مشقت میں آنے والے حادثات بھی تو اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ کچھ گہرے صدمات نے ذہنی تباہی میں حصہ ڈالا۔ ایسا کہ میں گھنٹوں دنوں مہینوں اور سالوں کی زندگی نہیں گزارتی، لمحاتی زندگی جس میں کوئی منصوبے نہیں، پلاننگ نہیں، ترقی نہیں، خود پر ہنسی آتی ہے کہ زندگی ایسے بھی گزرتی ہے بھلا۔ اس کے لیے تو بہت سے جذبات کی شدت چاہیے، تعلق چاہیے، محبت چاہیے، جذبہ چاہیے۔ مجھ جیسی سوچنے والی عورت خود کو ہارنے لگے تو زندگی غم کی آماجگاہ بن جائے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمارے لبوں پر ایک شاندار قہقہہ سجا دے تو کیا لگے گا۔ یہی ہوا تھا میرے ساتھ۔

ایک گرم تپتی دوپہر میں جب میں بچوں کو دوپہر کا کھانا کھلا کر فارغ ہوئی تو اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ایک خوبصورت گھمبیر سی آواز نے جیسے دل پر دستک دی۔ گرم دوپہر میں جیسے زیارت کی ساری ٹھنڈک لاہور میں آ گئی ہو۔ ایک آواز نے سماعت کو باندی بنا لیا۔ ہیلو میڈم آپ کیسی ہیں؟ میں گل خان بات کر رہا ہوں۔ میری ایک کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ آپ بہت شاندار لکھتی ہیں۔ میں بے حد متاثر ہوا۔ وہ بولتا رہا اور میں اپنے پسندیدہ لکھاری کی آواز کے زیر و بم میں ڈوبتی ابھرتی رہی، حیرت کے آسمان پر چڑھی۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ بس شکریہ کہتی رہی۔ اس نے خدا حافظ کہا اور میں زندگی میں واپس آ گئی۔ میں بے تحاشا خوش ہوئی۔ زندگی میں شاید پہلی بار میں بے حد خوش اور حیران تھی۔ پہلی بار محسوس ہوا زندگی اتنی بُری چیز بھی نہیں کہ اسکی قدر نہ کی جائے۔ زندگی اداس رہی ہے تو یہ خوش بھی تو کرتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے۔ بہت ساری باتیں، گپ شپ، زندگی اور دیگر مسائل پر گفتگو، علمی، ادبی، سماجی، ثقافتی، مذہبی، روایتی، گفتگو گویا اک چلن اک وطیرہ سا بن گئی۔ جب بھی وقت ملتا مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا۔ میں جیسے ہلکی پھلکی ہو جاتی۔ میں نے اس سے گفتگو کے بارے میں اپنے شوہر کو بتایا تھا۔ بلکہ اکثر کئی باتیں میں اپنے شوہر کو بھی بتاتی۔

یوں زندگی نارمل تو تھی ہی ذرا خوبصورت بھی ہو گئی کہ مجھے اپنے ہونے کا احساس ہونے لگا۔ کئی ان کہی کئی جذباتی باتیں میرے دل کو گدگدانے لگیں۔ کبھی اسکا فون نہ آتا یا وہ مصروف ہوتا تو میں بے قرار ہو اُٹھتی۔ خود سے ناراض ہونے لگتی۔ اسکی آواز کو سننے کے لیے ترسنے لگتی۔ یوں لگا جیسے مجھے اس آواز سے محبت ہو گئی ہے بلکہ آواز سے کیوں اس پوشیدہ شخصیت سے جسے میں نے دیکھا تھا نہ اسکے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ صرف ٹیلیفون پر گفتگو نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

تحریروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ گل خان نے اپنی ساری کتابیں مجھے بھیجیں۔ میں نے بھی روانہ کیں۔ تبصرے، تذکرے، تجربے، تعریفیں، غرض خواہشوں کا ایک پلندہ تھا جو میں ہاتھوں میں تھامے زندگی کے کسی خوبصورت موڑ کی منتظر تھی۔ میرا اس سے مل پانا بہت مشکل تھا۔ وہ ہزاروں میل دور اپنی دنیا اور کام میں مگن اور میں گھرداری اور بچوں میں مصروف۔ ملاقات ہو بھی تو کیسے...... بس اک یاد اک نامعلوم محبت کا دیا جلنے لگا تھا جو میری روح کو روشن کر رہا تھا۔ کبھی کبھی بہت ساری باتیں جن کی کوئی ضرورت زندگی کو نہیں ہوتی وہ زندگی کو پروقار اور شاندار بنانے لگتی ہیں۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی

مجھے محسوس ہوتا کہ شاید میں کچھ غلط کر رہی ہوں۔ شاید اپنے شوہر کے ساتھ دھوکہ لیکن پھر سوچنے لگتی کہ میں تو صرف لفظوں اور حرفوں کے گھر بناتی اور ان میں رہتی ہوں۔ ان لفظوں سے جو نہایت بے ضرر ہیں، کسی کو کیسے دکھ پہنچ سکتا ہے۔ یوں خود کو مطمئن کر لیتی پھر ایک دن میری بھیجی گئی نظموں کا اُس نے تحریری طور پر شکریہ ادا کیا۔ ایک خوبصورت خط، خوبصورت لفظ، لفظ جو زندگی دیتے ہیں۔ مجھے بھی خوشی ملی۔ وہ جو نایاب ہوتی جاتی ہے ختم ہوتی جاتی ہے ہمارے ہاں ایک سوچ شدت کے ساتھ موجود ہے کہ کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان تعلق صرف غلط ہی ہوسکتا ہے یا گناہ ہی ہوسکتا ہے۔ کوئی بھی دوسرے لوگ دوست نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ سینکڑوں ایسے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں، وفادار ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ وہ عاشق ہی ہوں اور اگر لفظوں کے ہیر پھیر میں کہیں عشق شامل ہو بھی جائے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ عشق گناہ میں مبتلا کرے۔ یہ وضاحت اس لیے کر رہی ہوں کہ میرے اس تعلق میں محبت کا گہرا احساس تو تھا مگر گناہ نہیں کہ نہ کبھی ملے نہ آمنے سامنے ہوئے نہ ایسی کوئی خواہش رکھی، کبھی موقع ملا تو ہلکی پھلکی گپ شپ ہوگئی۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے خط لکھا تھا تو بھلا نہال کیوں نہ ہوتی۔ میری لکھی گئی سو نظموں کے جواب میں یہ خط جیسے میں نے سنبھال کر رکھا۔ مگر فائدہ کیا ہیرے موتی چھپانے کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں یہ تو دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ لوگ ہماری بیش بہا دولت سے متاثر ہوں اور میرے پاس تو سب سے قیمتی چیز یہی تھی۔ گل خان کے خوبصورت خط۔ خط سے پہلے وہ نظم بھی تو پڑھیے جو میں نے لکھی تھی۔ پھر اس کا جوابی خط آپ کو سناتی ہوں۔ میں کیا لکھوں۔

میں کیا لکھوں کہ گلشن دل گل گلزار کرتے ہو
پرندوں سے پہاڑوں سے ہواؤں سے سمندر سے
کناروں سے فضاؤں سے جب بھی تم پیار کرتے ہو
حسین پھولوں کے نازک رنگ، تیرے ہونٹوں کی زینت ہیں
وہ خوشبودار جنگل اب بھی تیری پہلی چاہت ہیں
حروف بے اماں یہ جان دیتے ہو
وہ سارے لفظ جب گریہ لئے تیری ہتھیلی پر اُترتے ہیں
تو کاغذ اور قلم سے حیرتیں پرواز کرتی ہیں
میں کیا لکھوں
حسیں سنگلاخ بے آب وگیاہ
ویراں پہاڑوں میں ابھی تک ڈھونڈتے ہو
وہ ساری خوشبوئیں
وہ ساری افسردہ فضائیں
کئی بے ربط جملے کئی بے رنگ لمحے
کہیں حسن وادا کی آبشاریں
تیرے اندر معانی کی نئی دنیاؤں کو آباد کرتے ہیں
میں کیا لکھوں
تری تحریر کے سارے ستارے
میری پلکوں پہ اُترے جاگتے ہیں
ترے لفظوں کے سائے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں
ترے احساس کی خوشبو میری سانسوں میں بھرتے ہیں
مجھے چھو کر گزرتے ہیں
تیرے دلبر حرف میرے بدن میں گنگناتے ہیں
تیرے بے باک لہجے کی سخاوت نے
سہانے خواب کی پریاں بہت سے یاد کے جگنو
میرے اندر اُتارے ہیں
کئی بے نام لمحوں میں تجھی کو سوچتے جانا
عجیب سی اک حقیقت ہے، عجیب سی بے قراری ہے

میں کیا لکھوں کہ دامن میں صنوبر کے کئی جنگل مہکتے ہیں
سر مژگاں زیارت کے کئی تارے چمکتے ہیں
کئی دن سے میری سوچوں نے کتنے رنگ بدلے ہیں
مگر میں کیا کروں ہر راستہ تیرے پہاڑوں میں اترتا ہے
شبہ بن کر میری آنکھوں میں ڈھلتا ہے
وہ لفظوں اور حرفوں میں نئی تعمیر کرتا ہے
میں کیا لکھوں مجھے آنکھوں میں وہ تصویر کرتا ہے

میں نے نظم لکھ دی۔ ہر چیز کا ہر ایک پر علیحدہ تاثر ہوتا ہے۔ اس پر کیا اثر ہوا اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا۔ وہ اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس کا بس چلتا تو مجھے اغوا کر کے لے جاتا۔ کہیں چھپا دیتا پھر اس دیوی کی پوجا کرتا۔ وقت اور حالات اسکے ہاتھ میں نہیں تھے۔

وہ اکثر کہتا، کنول کاش میں تم سے شادی کر سکتا۔ وہ اکثر اس خواہش کا اظہار کرتا اور برملا اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ اس کا پرجوش رویہ مجھے اچھا لگتا مگر میں اس سے زیادہ کی قائل نہیں تھی۔ بچوں والی عورت ایسی باتوں کا جواب کیسے دے سکتی ہے۔ مجھے اس کی دیوانگی پہ ہنسی آتی۔ بالآخر اسے سمجھ آگئی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ میں تو اختتام کی طرف چل پڑی ہوں۔

اس کا خط تو پڑھ لیں۔

ڈیئر کنول!

بہت ہی پیاری، بہت ہی رومانوی بہت ہی thought provoking، بہت بہت symbolic نظم ملی۔ میں نے بار بار پڑھی۔ اسکی فوٹوسٹیٹ بھی بنوالی۔

بعض اوقات خوبصورت، اچھی، قیمتی چیزیں چرا لی جاتی ہیں۔ تخلیق کار کچھ ابنارمل یا پھر سپر ابنارمل لوگ ہوا کرتے ہیں ورنہ وہ تخلیقی عمل کیوں کریں؟ کچھ اور کام کریں۔ تم بخوبی آگاہ ہو کہ شاعری، افسانہ نگاری گھر پھونک تماشہ ہے۔ اس آگ کو وہ تاپتا رہتا ہے، سلگتا رہتا ہے۔ نہ تو عنقا کی مانند جل کے راکھ ہوتا ہے اور نہ ہی جلنا چھوڑ دیتا ہے۔ بس جلتے ہی رہ جاتا ہے۔ ہزاروں برس سے لکھاری سلگتا رہتا ہے۔ ہومر کو دیکھ لو کیا بنا اس عظیم شاعر کا۔ کھانے کو روٹی بھی نہ تھی۔ ایک لوہار کے گھر میں رہتا تھا۔

اور تم سپنے دیکھنے والی ہو۔

جاگتی آنکھوں سے خواب بننے والی۔

تمہاری نظم ایک گراں قدر تحفہ ہے اور یہ کہ خوش خوش رہا کرو۔ لکھا کرو۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا پورا فائدہ اُٹھایا کرو۔

اور مجھ سے جنگ نہ کیا کرو۔

تمہارا اپنا..........

میں نے کچھ اور نظمیں لکھیں۔

پھر اسکا جواب آیا۔

ڈیئر کنول!

ظالم کیا شاعری کی ہے۔ دل نکال لیا ہے۔ ایسی سوچ جگا دینے والی شاعری کہ انسان صحراؤں میں کھو جائے۔ میں سنبھال سنبھال کے پڑھتا ہوں۔ جستجو ہوتی ہے۔ میں ایک ایسے junction پر آ گیا ہوں جہاں تم نے ایک گلشن سجا رکھا ہے اور تم تو یوں لگتا ہے کہ بلوچستانی ہو اور تم نے بنا دیکھے ایسا گہرا مشاہدہ کیا ہے کہ الفاظ میں تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ بہرحال میں تمہیں طویل خط لکھتا رہوں گا۔ میری بن کے رہو۔

محفل انکی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

میری بننے کا مطلب ہے کہ اپنی آنکھیں اپنی سوچ مجھے دے دو۔

میں دیکھوں تو تمہیں دنیا بھلا کیسے ستاتی ہے

کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو
تمہارا اپنا.........

پھر تواتر سے اسکے کئی خط ملے۔ میں خط لکھنے میں ہمیشہ کنجوس رہی۔ پھر ایک عورت ہونے کے ناطے مجھ میں اتنی جرأت ہی نہ تھی کہ اسے جواب دے پاتی۔ جواب میں کیا لکھتی۔ محبت تو میرے دل میں بھی تھی۔ اسے اس بات کا پتہ چل چکا تھا۔

ڈیئر کنول!

یہ تم کیسے اچانک ہی میری زندگی میں آ گئی ہو۔ سونامی کی طرح اور ایسی محبت کا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اکسویں صدی میں کوئی دلربا داستانی محبت کرے گی۔ حانی والی، سموں والی۔ یوں لگتا ہے کہ تم کہیں کبھی مجھ سے بچھڑ چکی ہو۔ تمہارا نام مجھے اچھا لگا، اپنا اپنا سا اور کنول...... تمہاری پہلی نظم ملی تو مجھے بہت فخر ہوا۔ کسی بھی مرد کے لیے عورت کی محبت باعث مسرت ہوا کرتی ہے۔ چاہنے والی کی چاہت کو چاہنا بہت اچھا اچھا سا لگتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ تم میری زندگی کی گواڑخ ہو۔ دل کی اتھاہ وادیوں میں حکمراں شمشوب ہو۔

"I am glad that there are you in this world of ordinary people"

تمہارا اپنا.........

ایک اور خط دیکھیں۔

ڈیئر کنول!

ایسے ہی بس یونہی تم یاد آتی ہو خاموشی سے جیسے slit سے روشنی گزر جائے، چپ چاپ غیر محسوس، اور ہمارا تعلق خالصتاً ذہنی اور ادبی ہے یعنی کوئی کسی سے demanding نہیں ہے سوائے توجہ کے اور غرناطہ کی ایک کہانی ہے کہ محبوبہ رقص کیئے جاتی ہے اور وہ ستار بجائے جاتا ہے۔ خدا نے انہیں امر کر دیا۔ صدیوں سے نخلستانوں میں وہ یونہی جئے جاتے ہیں۔

بلوچستان کی حانی اور اسکے عاشق شہ مرید کو بھی خدا نے امر کر دیا۔ دونوں جواں سال اونٹ پر صحراؤں میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

تمہاری خوبصورت شاعری کی راہ دیکھتا ہوں بہت دنوں سے۔

تمہارا اپنا.........

خط تو اور بھی کافی ہیں جو میرے نام مجھے موصول ہوئے۔ کچھ دیر کو دل دھڑکا پھر خاموش ہو گیا۔ بہت سی نئی انوکھی باتیں اچھی بھی لگیں لیکن وہ تو ممکن ہی نہیں تھا جو اس نے چاہا جو سوچا یوں اس رشتے اس تعلق کے آگے بہت آگے بڑھ جانے سے پہلے میں نے اس کا اختتام کر دیا۔

زندگی میں بہت ساری کمی تو ہمیشہ رہتی ہے اور ضروری نہیں کہ زندگی میں وہ سب کچھ میسر بھی ہو جس کی ہم خواہش کریں۔ زندگی جہاں بہت کچھ دیتی ہے وہاں بہت کچھ طلب بھی تو کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنی موجودہ زندگی اور حالات سے بہت سی شکایات ہیں، بہت سی باتیں میری پسند اور مرضی کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا سو میرے حصے کا یہی جہاں ٹھیک ہے۔ میرے لیے مجھے کبھی زیادہ کا لالچ نہیں رہا۔ ایک ہی زندگی میں اور آخر کیا حاصل کروں گی۔

سو گل خان کی محبت میرے لیے صرف لفظی محبت رہی۔ عملی نہیں۔ کبھی کہیں کوئی کسک کوئی کمی تو رہتی ہی ہے۔ میں گل خان کی توجہ اور محبت کے لیے اس کی شکر گزار رہوں گی۔ بس اسے میں یہی دے سکتی ہوں۔ ہاں مگر محبت کا سونامی بہت کچھ بہا لے گیا ہے۔

بھکاوا

محترمہ شوکت افضل اس ماہ ایک اور یادگار کہانی لیکر آئی ہیں۔ یہ کہانی بھی ان کی دیگر تحریروں کی طرح بے حد اثر انگیز اور سبق آموز پیغام لیے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی اس مشہور مقولے ”باپ پہ پوت، پتا پر گھوڑا...... کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا“ کے مفہوم کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ کہانی کے کرداروں اور سحر انگیز حالات و واقعات قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ کہانی پڑھتے ہوئے دل و دماغ خوشگوار تاثر لیے رہتے ہیں اور سنجیدہ موضوع کے باوجود ذہن پر بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ شوکت افضل نے کہانی کے کرداروں کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے انسانی فطرت اور اس کے مختلف زاویوں کی عکاسی کی ہے، نیز شیطان کے بہکاوے میں آکر اچھے بُرے کی تمیز بھول جانے والوں کے انجام سے آگاہ کیا ہے۔

یہ گھر عام بستی سے ذرا ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ ڈوبے چاند کی درمیانی رات کے اس تاریک و پراسرار سمے میں دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چھپے جھینگر آوازیں نکال رہے تھے۔ آج آصف کا سب سے قریبی دوست زاہد شام سے یہاں آیا بیٹھا تھا۔ آصف آج دبئی سے واپس آرہا تھا۔ اسکے پاس دبئی سے منگوائی ہوئی کچھ چیزیں بھی تھیں۔ اس نے زاہد کو فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ آج کی شام اسے اسی گھر میں ملے گا جو کہ اس کی بہن اور بہنوئی کا گھر تھا۔ اس لیے زاہد وہاں اس سے ملنے اور اپنی مطلوبہ چیزیں وصول کرنے شام سے آیا بیٹھا تھا مگر ابھی تک آصف وہاں نہ پہنچا تھا۔ نہ ہی فون پر اس سے کوئی رابطہ قائم ہو رہا تھا۔ شدت کے انتظار کے بعد جب زاہد واپس جانے کے لیے اُٹھا تو دروازے کے قریب جاتے جاتے اس نے سوچا کہ ایک بار پھر آصف سے فون ملا کر دیکھ لے۔ ہو سکتا ہے کہ آصف سے بات کرنے میں کامیاب ہو ہی جائے۔

اس نے ہاتھ میں سلگتے سگریٹ کا آخری کش لگا کر زمین پر پھینکا اور پاؤں سے مسلتے ہوئے زاہد کا
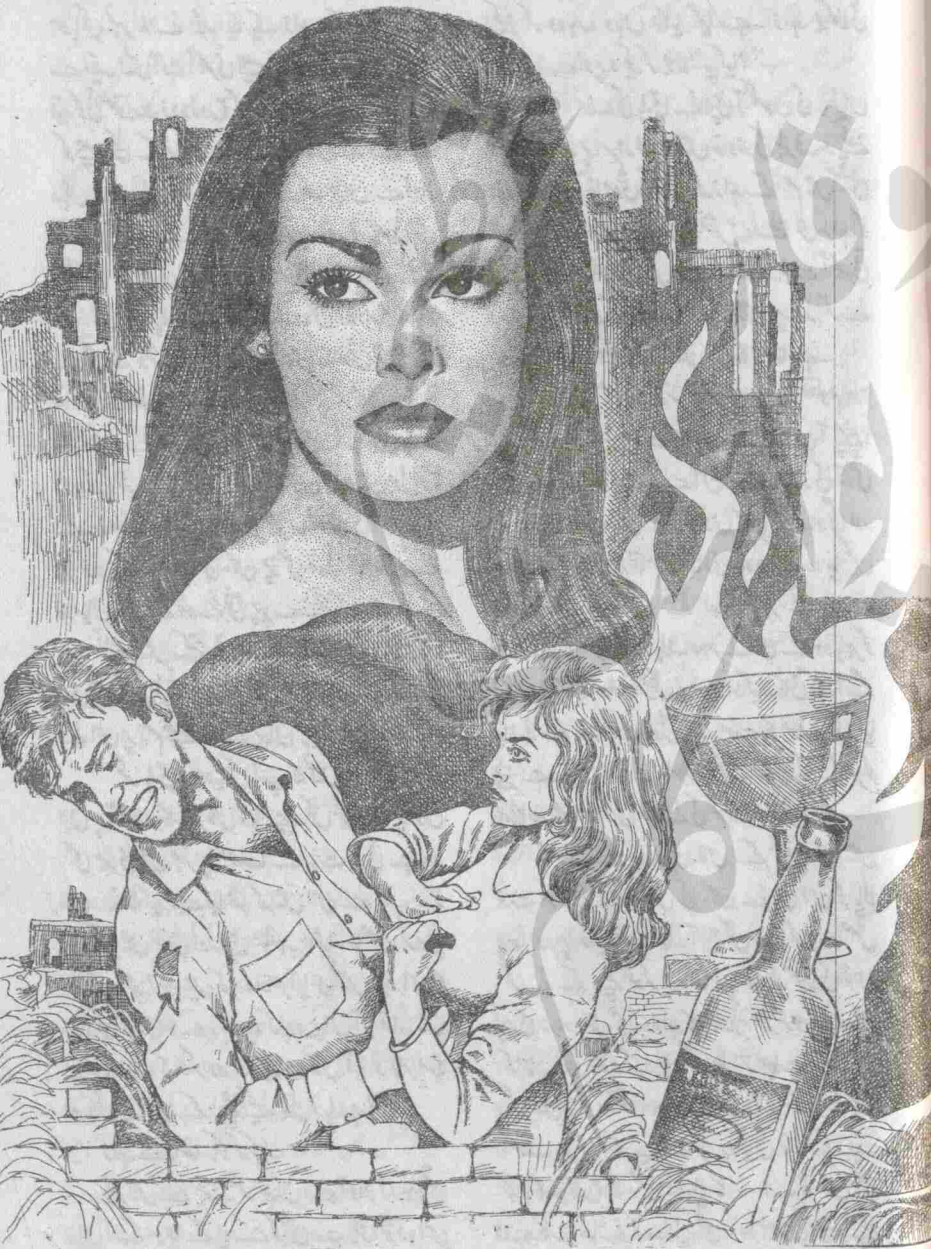
موبائل نمبر ملانے لگا۔ یکایک زاہد کے پاؤں تلے سے ایک ایسی آواز اُبھری جیسے پاتال کی گہرائیوں میں قید کوئی عقوبت زدہ روح کراہ رہی ہو۔ زاہد کے پاؤں کو جیسے بجلی کے کرنٹ نے چھوا ہو۔ اس نے جھٹکے سے وہاں سے پاؤں ہٹا کر اس جگہ کو دیکھا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ ایک بے جان و بے روح چھوٹی سی مشینری جو بیٹری پر چلنے کی مرہون منت ہوتی ہے۔ زیرِ زمین پکار پکار کر اپنے مالک سے حق وفاداری ادا کر رہی تھی اور گوشت پوست کا جیتا انسان خاموش تھا کیونکہ وہ قصوروار تھا۔ زاہد نے فون کاٹ کر پھر کال ملائی تو پھر وہیں سے بیل کی آواز سنائی دی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ آصف کا فون زیرِ زمین بول رہا ہے۔ زاہد نے عقب سے تیز تیز سانسوں کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا۔ آصف کی بہن چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان ہکلاتے ہوئے فق چہرے لئے کہہ رہی تھی:

"بھیا میں کتنے دنوں سے اپنا یہ موبائل تلاش کر رہی تھی مگر یہ مل ہی نہ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بچے نے اس پر گیم کھیلتے ہوئے یہاں پھینک دیا ہوگا۔"

"مگر باجی یہ موبائل آپ کا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس پر آصف کا نمبر چل رہا ہے۔ کل بھی اور پرسوں بھی میری اسی نمبر پر آصف سے بات ہوئی ہے اور اس نے تاکید سے کہا تھا کہ میں اس سے آپ کے اسی گھر میں ملوں اور اپنی مطلوبہ اشیاء حاصل کروں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ ادھر آیا ہی نہیں جبکہ اس کا موبائل گواہی دے رہا ہے کہ وہ یہاں آیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اگر وہ خود یہاں نہیں آیا تو پھر اسکا موبائل جھاڑی کے نیچے کیسے بول رہا ہے؟"

زاہد نے ماتھا پکڑ کر کہا۔

پھر اس نے جھک کر جہاں سے آواز آ رہی تھی وہاں آگے موتیا کے پودے کو ٹہنی سے پکڑا تو وہ اس کے ہاتھ میں اکھڑ کر چلا آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اکھیڑ کر دوبارہ وہاں لگایا گیا ہے۔ زاہد بوکھلائی نظروں سے اوپر دیکھ کر بولا "یہ کیا؟"

جواباً آصف کی باجی نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر ایسے پراسرار انداز میں خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے بزبانِ خاموشی کچھ کہا کہ زاہد کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ادھر بیوی سے نظریں ملتے ہی زاہد کو اسکے خاوند کی نظروں میں بھی کچھ ایسی کیفیت اُبھرتی دکھائی دی جیسے کوئی درندہ اپنے شکار پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے پچھلے کھر زمین میں گاڑھتا ہے۔

سناٹا چیخا "اس کے سر پر تو خون سوار معلوم ہوتا ہے۔ تم یہاں اپنی موت کو دعوت دینے کیوں آ پہنچے؟ میاں بھاگ نکلو یہاں سے اس ڈوبے چاند کی آدھی رات کے سکوت میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی اور تمہارے بیوی بچے تمام عمر تمہاری راہ دیکھتے رہ جائیں گے۔" اس کی آگہی نے اسے باہر نکلنے والے دروازے کی طرف دھکیلا۔ دوسرے ہی لمحے وہ باہر کو لپکا اور زقند لگا موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ کافی دور آگے جانے کے بعد اسے ہوش آیا۔ موت کا خوف بھی کیا چیز ہے۔ وہیں اس نے موٹر سائیکل کھڑی کر کے سر کو جھٹکا اور پھر اسکا رُخ تھانے کی طرف موڑ دیا۔

آصف کے والدین اس کے بچپن ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ اس کی بہن نے ہی اس کو پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا تھا۔ آج کل وہ نوکری حاصل کرنے کے لیے ٹھوکریں کھا رہا تھا مگر من کی آس پوری نہ ہو رہی تھی۔ زاہد کا بہنوئی نشہ کرتا تھا اور جو کماتا نشے کی نذر کر دیتا۔ گھریلو اخراجات پر روزانہ گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ آ جا کر سارا نزلہ آصف پر گرتا کہ یہ مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا...... اب تو بہن بھی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ وہ طعنوں سے بچنے کے لیے پورا پورا دن گھر نہ جاتا۔ اس کی تو دفتروں

کے چکر لگا لگا کر جوتیاں بھی گھس گئی تھیں۔ پھر بھی گھر میں سب لوگ اسے ہی قصوروار سمجھتے۔ اس دن وہ پارک میں ایک بینچ پر بیٹھا نصیبوں کو کوس رہا تھا کہ اس کا پرانا دوست آ نکلا۔ زاہد، آصف کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے ملگجے کپڑے بڑھی ہوئی شیو، اس کے اندرونی اضطراب کی خبر دے رہے تھے۔ اس کے روکھے چہرے پر پپڑی جمے ہونٹ کب سے خالی پیٹ ہونے کی داستان کہہ رہے تھے۔ زاہد سے اس کا حال دیکھا نہ گیا۔ وہ اسے گھر لے گیا۔ اتفاق سے زاہد کا کزن جو دبئی میں کاروبار کرتا تھا آج کل آیا ہوا تھا۔ آصف کی کہانی سن کر اسے اپنے ساتھ دبئی لے جانے پر تیار ہو گیا۔

وہاں جا کر آصف نے اپنی شرافت اور محنت سے ہر ایک کے دل میں اپنا مقام بنا لیا اور اس کی قسمت کا ستارہ گردش سے نکل کر پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔

جب آصف کی بہن کو بھائی کی طرف سے بھیجا گیا پہلا 5 ہزار کا چیک ملا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔

"دیکھا خدا جب دیتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔" اس نے خاوند کے سامنے چیک لہراتے ہوئے کہا "تم ہمیشہ میرے بھائی کو برا بھلا کہتے رہے کہ وہ کام سے جی چراتا ہے، طعنوں سے اس کا دل ہمیشہ چھلنی کرتے رہے۔ ارے وہ تو ہیرا ہے ہیرا مگر ہیرے کی قدر تو جوہری ہی جانتا ہے۔ تم جیسے مورکھ کیا جانیں۔"

"ارے تو میں نے کب انکار کیا کہ وہ ہیرا نہیں۔ مگر اس وقت تو وہ اندھیری کان میں چھپا ہوا ہیرا تھا نا۔ اب تو واقعی میں جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو شرم سے سر جھک جاتا ہے۔ سچ مچ ہم اس کے ساتھ بہت زیادتی کرتے رہے۔ میں تو چلو غیر تھا مگر تم تو اس کی بہن تھی۔ تم نے بھی اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کسر نہیں چھوڑی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ بن ماں کا بچہ تمہارا بھائی ہے۔ خیر اب اس قصے کو جانے دو اور مجھے بھی اس رقم سے کچھ دان کر دو۔ قسم سے جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور منہ سوکھ کر مکڑی ہو رہا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہیں اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ کپڑوں پر پیوند لگنے کی نوبت آئی کھڑی ہے۔ بچوں کے اخراجات الگ ہم سے پورے نہیں ہوتے۔ تمہیں فضول خرچی کی پڑی ہے۔" آصف کی بہن بھنا کر بولی۔

"تو پھر کیا ہوا۔ اب تمہارا بھیا راجہ جو کمانے لگا ہے۔ سب کمزوریاں دُور کر دے گا۔ آخر ہم بھی تو اتنا عرصہ اس پر خرچہ کرتے ہی رہے ہیں۔"

"تمہیں وہ خرچ یاد آ رہا ہے مگر یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ جس مکان میں تم رہ رہے ہو وہ آصف کا ہی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پھر تم بدبودار تنگ گلی میں کسی بھوت بنگلے نما گھر میں رہ رہے ہوتے جس کا تم ہر ماہ کرایہ بھی دیتے۔ جس طرح سے یہ باغ باغیچے والا گھر جس میں تمہارے بچے کھیل کھود لیتے ہیں ہمارے پاس ہے یہ کسی نعمت سے کم نہیں۔"

"مان لیا بھئی مان لیا۔ تم تو ایک بات کے پیچھے ہی لٹھ لے کر پڑ جاتی ہو۔ چلو اور نہیں تو آج منہ کا ذائقہ ہی بدلوا دو۔ گوشت چکھے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ روز روز تمہاری باغیچے میں اُگی سبزی اور دال کھا کھا کر پیٹ میں ابھارہ ہی ہو گیا ہے۔ قسم سے! ادھر دیکھو تو کیا پھول کر کپا ہو رہا ہے۔" بہنوئی نے پیٹ پر سے قمیص ہٹا کر اس پر ڈھولکی بجاتے ہوئے کہا۔

آصف کی بہن نے ہونٹوں پر آئی ہنسی روکنے کی کوشش میں منہ پھیر لیا اور اٹھتے ہوئے بولی "اچھا لے آؤ بازار سے گوشت بھی۔ تمہارے پیٹ کا دوزخ بھی بھرے دیتی ہوں۔ اللہ میرے بھائی کی خیر کرے۔ اب پردیس سدھارا ہے تو امید لگ گئی

ہے۔ کچھ نہ کچھ تو مدد کرتا ہی رہے گا۔“

”او نجی تیری خیر۔ لا نکال مال ابھی اور اسی وقت۔ کھانا پکنے میں دیر نہ ہو جائے۔ ابھی چلتا ہوں قصائی کی دکان پر۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔“

بہنوئی نے بیوی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے مسخرے پن سے کہا تو بہن نے دوپٹے کے پلو سے ایک مڑا تڑا سو روپے کا نوٹ کھول کر اس کی طرف زمین پر پھینکا جسے اٹھا کر وہ چومتے ہوئے بولا ”دھن واہ ہو بچہ چل رام تیرا بھلا کرے گا“ اور ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔

”ہنہ! رام کیا بھلا کرے گا پڑوسیوں کے کپڑے سی سی کر کمر دہری ہوئی جا رہی ہے۔ یہ آخری بچا کھچا نوٹ بچا تھا سو روپے کا چلو وہ بھی گیا ہاتھ سے۔“

اس کے بعد بھی آصف اپنے بہن بہنوئی کو کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا۔ اب اس کے بہن بہنوئی اس سے بڑے خوش تھے۔ ان کے درمیان خط و کتابت بھی چلتی تھی اور فون پر بھی بات چیت ہوتی رہتی۔ بہن آصف کو اصرار کرتی رہتی کہ وہ ایک دفعہ اسے ملنے پاکستان آئے مگر فی الحال ذہنی طور پر آصف تیار نہ ہو پاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بہت پیسہ کمائے اور ایک دولت مند انسان کی حیثیت سے دوبارہ اپنوں میں جائے۔ وہی اپنے لوگ جو اس کی تنگدستی میں اسے مضحکہ خیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ اپنے عزیزوں میں سے ہی آصف ایک لڑکی کو پسند کرتا تھا اور شاید وہ بھی...... مگر اس وقت تعلیم یافتہ ہو کر بھی نوکری نہ ملنے کی وجہ سے آصف کی شخصیت متنازعہ حیثیت کی حامل تھی۔ اس کی خوبصورتی، اس کی شرافت اور کردار کو اس کی بیروزگاری نے مسئلہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب جبکہ اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ دولت اور ثروت انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں تو وہ دولت کمانے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ کام کام کام، صبح شام کام۔ اس نے زندگی کا مقصد کام بنا لیا ہوا تھا۔ اس دن رات کی محنت نے اس کی زنگ آلود صلاحیتوں کو اُجاگر کر دیا جو اس کے اندر پوشیدہ تھیں۔ وہ حکام بالا کا منظور نظر بن گیا اور انہوں نے اسے کمپنی میں منیجر کے عہدے پر فائز کر دیا اور اگلے ماہ گھر اور گاڑی دینے کا وعدہ کر کے انہوں نے آصف کو ایک ہفتے کی چھٹی دے دی۔

اس نے یہ خوشخبری اپنی بہن کو سنائی اور پھر اسے پوچھنے لگا کہ اس لڑکی کی کہیں اور شادی تو نہیں ہو گئی جسے وہ پسند کرتا تھا۔

”نہیں ابھی کہاں شادی ہوئی اس کی۔ اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ آج کل اچھا رشتہ اتنی جلدی کہاں ملتا ہے۔ اگلے دن ایک شادی میں اس کی ماں تمہارے بارے میں ہی پوچھ رہی تھی۔“

”اور اگر باجی آپ میرے لیے اس کا رشتہ مانگیں تو کیا اب وہ رضامند ہو جائیں گے؟“

”کیا بات کر رہے ہو آصف۔ تم جیسا رشتہ ان کو کہاں سے ملے گا۔ خوبصورت لڑکا جو پڑھا لکھا بھی ہو اور کماؤ بھی ہو تو وہ تو پاؤں پڑ کر بھی رشتہ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔“ بہن بولی۔

”تو ٹھیک ہے۔ میں جب چھٹی پر آؤں گا تو آپ ان کو بتا دینا کہ میں روز روز دبئی سے نہیں آ سکوں گا اس لیے وہ نکاح کر کے لڑکی میرے ساتھ کر دیں۔ اتنے میں میں اپنے دوست کی بیوی کو ساتھ لے کر ضروری خریداری کر لوں گا اور ساتھ پاکستان لیتا آؤں گا۔ یہاں پاکستان کی نسبت سونا سستا بھی ہے اور زیورات بھی خوبصورت ہوتے ہیں اور کپڑوں کا تو جواب ہی نہیں ہے۔“ آصف نے خوش ہو کر کہا۔

جب آصف چھٹی لے کر پاکستان پہنچا تو اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

شام کے قریب دروازے پر ایک مانوس ہلکی سی دستک کی آواز سن کر روشن نے چونک کر دیکھا۔ وہاں آصف کھڑا تھا مگر یہ کون سا آصف تھا۔ وہ آصف تو جب یہاں سے گیا تھا تو آنسو بھری آنکھیں، بڑھی ہوئی شیو، میلے بوسیدہ کپڑے اور گرد آلود پھٹے پرانے چپل پہنے ہوئے اضمحلال اور خستہ حالی کی مکمل تصویر تھا لیکن یہ آصف تو کلین شیو، زندگی سے بھرپور، دمکتا ہوا چہرہ لئے چمکدار ہنستی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہوا دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے قیمتی چرمی بیگ لئے جنہیں وہ پہیوں پر گھسیٹتا چلا آ رہا تھا، اس کے جسم پر جدید فیشن کا بہترین لباس اور جوتے اسے کلاس ون کا ایک آفیسر ظاہر کر رہے تھے۔

نجانے کیوں روشن کے دل کے ساحل سے رشک وحسد کی ایک تند لہر آ کر ٹکرائی اور وہ خشک گلے میں تھوک نگلتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی ”آصف تم نے تو کل آنے کا کہا تھا۔“

”وہ وہ باجی دراصل میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔“ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

”چل ہٹ! تم نے تو مجھے حیران ہی کر کے رکھ دیا ہے۔ آؤ اب بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو بناتی ہوں۔ پانی پیو گے؟“

”ارے ارے آپ کاہے کو ٹینشن لیں گی۔ بھائی جان کو بھیجیں۔ ہوٹل سے کھانا اور بوتلیں لے آتے ہیں۔ سب مل کر کھائیں گے۔ کہاں ہیں وہ؟“ آصف نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے اس نے کہاں ہونا ہے۔ پھر رہا ہو گا اس وقت اپنے لفنگے نشئی دوستوں کے ساتھ۔ لو وہ آ ہی گیا۔“ روشن نے کہا۔

آصف اٹھ کر بہنوئی کو گلے ملا اور جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے 500 کا نوٹ بہنوئی کو دیتے ہوئے بولا ”بھائی جان! آپ ہوٹل سے کھانا لیتے آیئے گا۔ ساتھ بوتلیں اور پھل مٹھائی بھی لیتے آئیں اور اگر پیسے کم ہیں تو مزید لے لیں۔ وہ دوسرا 500 کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

بہنوئی نے دونوں نوٹوں کو تعجب اور حرص کی نظروں سے دیکھا اور پھر دانت نکالتے ہوئے پرانی چپل گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد آصف نے اپنی اس پسندیدہ لڑکی روبینہ کے بارے میں پھر ذکر چھیڑا۔

”ارے بھئی میں نے بتایا تھا کہ فی الحال وہ کنواری ہے اور اس کے والدین کسی مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں اور اب اگر وہ مناسب سا رشتہ خود ہی ان کے دروازے پر چل کر آ گیا ہے تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بس صبح ہو جانے دو۔ میں کل ہی اس کام کے لیے اس کے گھر جاؤں گی۔ گھبراؤ مت۔“

”اور تو کچھ نہیں بس چونکہ میری چھٹی زیادہ نہیں ہے اس لیے میں کہہ رہا تھا کہ ان کو بھی صلاح مشورے کا موقع مل جائے۔“ آصف نے کچھ شرما کر کہا۔

رات کو سب کام کاج سے فراغت پا کر روشن اندر گئی تو وہاں آصف اس کو ساتھ لایا ہوا سامان دکھانے کے لیے منتظر بیٹھا تھا۔ اتنے خوبصورت ملبوسات، زیورات، نقدی، یہ چیزیں تو روشن نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔

”تم ان چیزوں کو کس خوشی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو روشن؟ یہ سب تو وہ اپنی ہونے والی بیوی روبینہ کے لیے لایا ہے جو اس کے ساتھ دبئی جائے گی اور پھر کیا وہ آصف کو ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے دے گی؟“ روشن کے دل سے آواز آئی۔ میں نے اس لڑکے کے لیے کیسے کیسے دُکھ اٹھا کر اسے پڑھایا لکھایا۔ ماں کے مرنے کے بعد اسے

ماں بن کر پالا پوسا۔ خاوند کی جھڑکیاں اور طعنے سنے اور جب وہ کسی قابل ہوا تو اتنا کچھ ایک غیر لڑکی کے لیے لے آیا۔ مجھ دکھیا کی زندگی ایک نشئی خاوند کے ساتھ تنگ دستی کی نذر ہو گئی۔ کوئی سکھ نہ پا سکی۔ میں تو ویسی ہی تہی دامن رہی۔ ارے اس سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ ایک میرے لیے بھی ایسا ہی زیور کا سیٹ لے آتا۔ یہ جو میرے لیے کپڑے لایا ہے وہ بھی روبینہ کے کپڑوں کے پاسنگ نہیں۔ عورت کی فطرت کے حسد اور جلن کے جذبہ نے اس کا تن من سلگا کر رکھ دیا۔ نارسائی کا دکھ اس کے اندر آتش فشاں بن کر پھٹنے لگا اور آصف سے نفرت کے بچھو نے پہلی دفعہ روشن کے پہلو میں ڈنک مارا۔

"باجی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" آصف اس کی متغیر حالت دیکھ کر بولا "ہاں بیٹا صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔" روشن نے ماتھا پکڑ کر آزردگی سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے باجی کل میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ آپ یوں بھی کمزور دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی وٹامن ہی کھانے کو لکھ دے گا ڈاکٹر۔ بس اب آپ آرام کریں۔" آصف تمام سامان سمیٹ کر دوبارہ سوٹ کیس میں رکھنے لگا اور روشن اُٹھ کر مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی جہاں اس کا خاوند اپنا چہرہ دونوں ہتھیلیوں پر ٹکائے کسی سوچ میں گم تھا۔ آصف کپڑے تو بہنوئی کے لیے بھی لایا تھا مگر اس کی نظروں میں آصف کا پہناوا ہی چبھے جا رہا تھا۔ روشن ٹھنڈی آہ بھر کر چارپائی پر ڈھے سی گئی۔ بہنوئی نے نگاہ اٹھا کر روشن کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ وہ بھی اسی طرح سوچ رہی ہے۔ وہ اس کے نزدیک ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کے ماتھے کو چوم کر بولا،

"کیوں غبارے کی طرح منہ پھلا رکھا ہے؟"

روشن نے اس کا ہاتھ اپنے ماتھے سے جھٹک کر پرے پھینک دیا اور غرا کر بولی،

"دیکھا لوگ کس طرح اپنی بیویوں کو عیش کراتے ہیں لیکن تم نے ساری زندگی مجھے کیا دیا؟ بھوک اور ننگ؟"

"حوصلہ میری جان حوصلہ۔ ٹھیک ہے میں نے کچھ نہیں دیا نہ سہی کیونکہ میری حیثیت ہی کچھ نہیں تھی مگر اس وقت جو تمہارا بھائی لاکھوں میں کھیل رہا ہے اس نے کیا انصاف کیا تمہارے ساتھ؟"

آصف کے بہنوئی نے جب سارا سامان دیکھا تو اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اب وہ اس سوچ میں گم تھا کہ کب اس مال پر ہاتھ صاف کرے اور اسے بیچ باچ کر اس رقم سے اپنے جوئے اور نشے کی حرص پوری کرے۔ اس لیے بھی وہ بیوی کو بھڑکائے جا رہا تھا۔ اس کی سوچ مجرمانہ تھی۔

"تم کس انصاف کی بات کرتے ہو اظفر جو اس بیچارے سے بن پڑتا ہے کیے تو جا رہا ہے۔ تم تو خوامخواہ حجت بازی کر رہے ہو۔" وہ جیسے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"حجت بازی کی بھی ایک ہی رہی۔ ارے وہ کپڑے تمہیں نظر نہیں آ رہے جو کپڑے وہ دلہن کے لیے لایا ہے اور جو کپڑے وہ تمہارے لیے لایا ہے۔"

"آخر دلہن اور دوسروں کے کپڑوں میں فرق تو ہوتا ہی ہے نا اظفر۔" روشن نے رُخ پھیر کر کہا۔

"اور جو ملازموں جیسے وہ ہمارے کپڑے لایا ہے۔ کیا وہ شادی میں بھی پہننے کے لائق ہیں؟ آخر ہم نے بھی تو کبھی اس کے لیے کچھ کیا ہی ہو گا نا یار۔" وہ کم ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہم آصف کو بتا سکتے ہیں کہ ہمیں کس طرح کے کپڑے چاہئیں۔" روشن نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس طرح

کہا جیسے اس کی آواز کنویں میں سے آ رہی ہوں۔

"لیکن ایمان سے بتاؤ کہ دلہن کے لیے یہ ملبوسات اور قیمتی زیورات دیکھ کر تمہیں بھی کچھ محسوس ہو رہا ہے یا نہیں۔ میرا تو جانو کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔" اظفر نے بھرائے ہوئے گلے سے کہا تو روشن کے صبر کے بھی بند ٹوٹ گئے اور حسد کا ناگ اسے ڈسنے لگ پڑا۔ اس کے آنسو نکل آئے اور کہنے لگی

"آصف تو پہلے ہی اس پر مرمٹا ہے۔ جب شادی کر کے ساتھ دبئی چلی گئی تو ہمیں کون پوچھے گا۔ پر دیکھو اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر حال میں یہ قیمتی زیورات اور لباس روبینہ ہی پہنے گی۔"

"لو خوامخواہ میں! ساری زندگی ہم نے آصف کے ساتھ محنت کی اور اس کا پھل ایک اور عورت لے جائے جس کی نہ ہینگ لگی نہ پھٹکڑی۔" اظفر نے انتہائی کمینگی سے کہا۔ وہ روشن کو بھڑکائے جا رہا تھا۔

"یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے اظفر۔" روشن نے پسپا لہجے میں سسک کر کہا۔

"پر میں تو یہ تمام زیورات اور ملبوسات تمہارے جسم پر سجے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اظفر نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی تو روشن نے زخم خوردہ نگاہوں سے خاوند کی طرف دیکھا اور بے بسی سے نگاہیں جھکا لیں۔

"قسم سے ملکہ لگو گی ملکہ۔ کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔" مکڑی نے مزید جال پھیلایا۔ "میری مانو تو میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔" اظفر کے چہرے سے خباثت ٹپکنے لگی۔

جب ایک انسان نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے اور اگر بدی کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اس کے لیے راہیں ہموار کر دیتا ہے۔ لگتا تھا کہ حرص و ہوس کے ناگوں کی آتشیں پھنکار گھیرا ڈال رہی ہے۔ ہر رات کے سیاہ لبادوں میں لپٹی سوگوار ہوائیں بین کر رہی تھیں۔ میاں بیوی نے اپنے ناپاک منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا اور انکے اردگرد خبیث طاقتیں اپنے شیطانی رقص میں ہمہ تن مصروف ہو گئیں۔ مکان کی چھت پر بلیاں لڑ رہی تھیں اور انکی آوازیں فضا میں ایک ڈراؤنا المناک تاثر پھیلا رہی تھیں جیسے بدروحیں رو رہی ہوں۔

یکایک وسیع آسمان کی پنہائیوں میں سے ایک روشن ستارہ ٹوٹ کر لمبی لکیر چھوڑتے ہوئے افق کے پاتال میں گم ہو گیا۔ بے گناہ، نامراد جواں مرگ آصف نے حیرت سے اپنے پیارے قاتلوں کو دیکھا اور پھر اپنی ناکام حسرتوں کی آغوش میں منہ چھپا کر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

☆..........☆..........☆

بہرحال تمام ثبوت مل جانے کے بعد کیس عدالت تک پہنچ گیا مگر ان سفاکوں کے لیے تو کوئی ضمانت دینے کو بھی تیار نہ ہوا جنہوں نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنے روشن مستقبل کی ایک آخری امید بھی اپنے ہاتھوں ہی ختم کر لی، ایک ہی بار مرغی حلال کرنے کی کوشش میں سب کچھ گنوا بیٹھے۔ اگر دونوں میاں بیوی کچھ صبر سے کام لیتے تو آصف جیسے شریف النفس انسان سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ماضی میں اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کو فراموش کر کے اپنی بہن اور بہنوئی کے حالات سدھارنے میں بھی ان کی مدد کرتا۔ لیکن روشن اور اس کا شوہر پوری طرح شیطان کے بہکاوے میں آ چکے تھے، ہوس زر نے ان کی آنکھیں اندھی کر دی تھیں۔

ایک دن زاہد ماں سے باتوں باتوں میں کہنے لگا، "امی جان یہ سب جو ہوا مجھے ایک خواب کی طرح لگتا ہے۔ میرا تو ابھی بھی دل نہیں مانتا کہ ایک بہن اتنی سفاکی سے بھائی کی جان لے سکتی ہے۔ آصف کی بھری جوانی اور معصوم چہرے کا اب بھی مجھے خیال

آتا ہے تو سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ کیا ایسے بھی کبھی خون سفید ہوا ہے؟"

"بیٹا اب تو مجھ سے وعدہ لینے والی اس دنیا میں نہیں ہے اور اتنا کچھ ہو بھی چکا ہے اس لیے میں یہ راز چھپانے کی پابند نہیں رہی۔" وہ آہ بھر کر بولیں۔ "تمام زندگی میں میرے دل پر یہ بوجھ پڑا رہا۔"

"کون سا راز امی؟ آپ کیا چھپا رہی ہیں مجھ سے۔ بتائیں نا امی جان۔" زاہد نے بے قرار ہو کر کہا۔

"اب مجھے بتانا ہی پڑے گا میری جان۔ سنو غور سے سنو۔ روشن کے خون کے بارے میں جو ابھی تم نے ذکر کیا کہ سفید ہو گیا تھا دراصل وہ خون آصف کے والدین کا خون تھا ہی نہیں۔ وہ تو کسی ایسے بدکار انسان کا خون تھا جو اس کا وارث نہ بنا اور بچی کی ماں کو اسے کسی کے دروازے پر پھینکنا پڑا۔ یہی بچی آگے جا کر روشن بنی مگر اپنی بدکار ماں اور باپ کے ناپاک خون کی وجہ سے اپنے پالنے والوں کے گھر کی شمع بجھا کر وہاں تاریکی پھیلنے کا باعث بنی جو کہ ناجائز اولاد تھی۔"

"مگر یہ سب ہوا کیسے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی۔" زاہد نے پریشانی سے کہا۔

"میں بتاتی ہوں۔ دراصل کافی عرصہ سے آصف کے والدین کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بڑے پریشان رہتے تھے۔ ایک دن آصف کے باپ نے مسجد جانے کے لیے صبح کے ملگجے اندھیرے میں دروازے کھولا تو یہ بچی ان کو دروازے کے قریب کپڑوں میں لپٹی ہوئی ملی۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور بچی کو لے کر اندر چلے گئے اور بچی کو بیوی کی گود میں ڈال دیا۔ دوسرے دن وہ اس علاقے کو ہی چھوڑ گئے تا کہ محلے والوں کی بازپرس سے بچ سکیں کہ بچی کس کی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ میری آصف کی ماں سے بچپن کی دوستی تھی اور ان کے گھر میرا اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا ہوا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کروں گی کہ یہ بچی میرے پیٹ سے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب اللہ نے ان کو آصف کی صورت میں اولاد دی تو آپس میں ان کو بھی کبھی علم نہ ہو پایا کہ وہ بہن بھائی نہیں ہیں۔ آصف کی امی نے روشن پر بڑی محنت کی تھی چونکہ ان کو اس کی بیک گراؤنڈ کا پتہ تھا اس لیے انہوں نے اس کی ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی۔ گھر کے اندر بھی سلیقہ، رکھ رکھاؤ، مذہب کی طرف رجحان سکھایا مگر بے سود۔ جوان ہوتے ہی نجانے کس طرح روشن کی زندگی میں ایک نوجوان آ گیا جس کے ساتھ بدنامی کے ڈر سے اس کی شادی کرنی پڑ گئی جو کہ بعد میں معلوم ہوا کہ نشئی ہے۔ اسی دوران والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور روشن اس لڑکے کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی اور بالآخر آصف کے والدین جو اس کے محسنوں میں شمار ہوتے تھے، ان کے گھر کا آخری چراغ بھی بجھا کر لعنت کا طوق گلے میں ڈال لیا۔"

"لیکن پھر بھی امی، روشن کے لیے تو آصف ایک بھائی تھا...... اس نے کیسے اتنی سفاکی سے آصف کو شوہر کے ساتھ ملکر قتل کر دیا۔"

"دیکھو زاہد بیٹے ہوس اور لالچ انسانی عقل کے سب سے بڑے دشمن ہیں جو انسان کو انتہائی قبیح فعل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اس کے علاوہ شیطان انسان کو بہکاتا ہے اور اس کے بہکاوے میں آ کر بھی انسان گناہ کر بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے پہلے تمہیں بتایا ہے کہ روشن آصف کی حقیقی بہن نہیں تھی۔ اس حوالے سے میں تمہیں ایک واقعہ سناتی ہوں جسے سن کر تمہیں ساری بات سمجھنے میں آسانی ہو گی:

"کہتے ہیں کہ ایک ملک کا بادشاہ بہت انصاف پسند اور رحم دل تھا۔ اس کی بادشاہت میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ رعایا اسے

سیارہ ڈائجسٹ کی سالانہ خریداری کیلئے
بیرونِ ملک بدلِ اشتراک

(1) سعودی عرب، کویت، اُردن، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت۔ — 4500/- روپے

(2) سوڈان، یوگنڈا، لیبیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، ملائشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی۔ — 4500/- روپے

(3) آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نودو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، میکسیکو، گریناڈا۔ — 5500/- روپے

- بیرونِ ملک وی پی نہیں جاتی۔ رقم پہلے بھجوائیں۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار کو ادا کرنا ہوگا۔
- ڈرافٹ سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے نام ارسال کریں۔

سیارہ ڈائجسٹ
240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور۔
فون: 0423-7245412
E.mail: sayyaradigest@gmail.com

دل سے پسند کرتی تھی اور اس سے بہت خوش تھی مگر فلک کج رفتار نے جب پینترا بدلا تو یوں محسوس ہونے لگا کہ کسی کی نظر ہی کھا گئی۔ وہ شہر جو امن اور آسودگی کے گہوارے میں جھولتا ہوا خوشیوں کے شادمانے بجاتا نظر آتا تھا اب اس کی گلیوں میں تلواروں کی جھنکار، زخمیوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا کی صدائیں گونجنے لگیں۔

ڈوبے چاند کی اندھیری رات میں گھڑ سوار ڈاکوؤں کا ایک جتھا بلائے ناگہانی کی طرح نجانے کس طرف سے نمودار ہوتا اور لوٹ مار، قتل وغارت اور تباہی مچا کر چلا جاتا۔

بادشاہ نے ان ڈاکوؤں کی روک تھام کے لیے بہتیرے اقدامات کئے مگر یہ سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ چاند کی آخری تاریک راتوں میں کدھر سے آتے ہیں اور لوٹ مار کر کے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ اتنا تو پتہ چل گیا کہ وہ واردات کے بعد قریبی پہاڑوں کا رُخ کرتے ہیں لیکن تعاقب کرنے کے باوجود وہ نہایت پراسرار انداز میں چھلاووں کی طرح یکدم ایسے غائب ہو جاتے کہ پیچھا کرنے والے یقین و بے یقینی کی سرحد پر کھڑے معلوم ہی نہ کر پاتے کہ ان ڈاکوؤں کو زمین کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا۔

آخر بادشاہ نے نہایت چابکدست اور ماہر جاسوسوں کی خدمات حاصل کیں جنھوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر نہایت کوششوں سے آخر ان ڈاکوؤں کے ٹھکانوں کا کھوج نکال ہی لیا۔ یہ ڈاکو سرنگ نما غاروں میں رہتے تھے۔ ان غاروں کے منہ بڑی بڑی ایسی چٹانوں نے ڈھانپ رکھے تھے جو کہ بوقت ضرورت سرکائی جا سکتی تھیں۔ اندر سے ہی کھل بھی سکتی تھیں اور بند بھی ہو جاتی تھیں اور یہی وہ راز تھا جس کو معلوم کرنے کے بعد سراغ رسانوں نے بادشاہ کو ڈاکوؤں کے ٹھکانوں سے باخبر کیا۔ پس سراغ ملتے ہی بادشاہ کے حکم پر ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے راتوں رات فوج بھیجی گئی۔ کافی خون ریزی کے بعد جبکہ فوج کے کئی سپاہی بھی کام آئے کچھ ڈاکو تو رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ نکلے، جو ہاتھ لگے ان کا قتل عام کر دیا گیا۔ بادشاہ کے فوری حکم پر اسلحہ سے بھرے غار پر سرکاری قبضہ کر لیا گیا اور عوام کا چھینا، لوٹا ہوا مال و زر ان کے حقداروں تک پہنچا دیا گیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد جب دربار لگایا گیا اور نقارچی کی باملاحظہ باادب ہوشیار کی آواز کے ساتھ بادشاہ سلامت تخت پر براجمان ہو چکے تو بادشاہ نے وزیر باتدبیر کو مخاطب کر کے پوچھا ''کیا تمام ڈاکو ختم کر دیئے گئے؟''

وزیر اٹھ کر سامنے آیا اور اپنی مرصع پیٹی اور تلوار والی کمر جھکا کر کورنش بجا لایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا ''جی جہاں پناہ! عزت مآب کے حکم کے مطابق تمام ڈاکوؤں کو نیست و نابود کر کے ان کے غار خالی کرا لیے گئے ہیں۔ بس ایک لڑکا زندہ بچ گیا ہے۔''

''اور اس ڈاکو زادے کو آپ نے کس خوشی میں زندہ چھوڑ دیا؟ کیا آپ کو پتہ نہیں کہ سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے۔ ان ڈاکوؤں نے جو ستم ہماری بے گناہ رعایا پر ڈھایا ہے وہ ہم قیامت تک نہیں بھول سکتے۔'' بادشاہ نے برہم ہوتے ہوئے آنکھیں نکال کر کہا۔

وزیر تھرتھر کانپنے لگا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ''بادشاہ سلامت جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟''

''امان ہے۔'' بادشاہ نے منہ پھیر کر کہا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔

''حضور ہمیں اس بچے کے قتل کے لئے آپ کی خصوصی اجازت چاہیے تھی کیونکہ اسلام میں عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت ہے تو آپ جیسے انصاف اور اصول پرست بادشاہ کے دور میں اس حکم کی خلاف ورزی آپ کے شایان شان نہ تھی۔ ان

غاروں میں اور تو کوئی عورت اور بچہ نہیں تھا شاید ڈاکوؤں نے اپنے اہل وعیال کو کہیں اور چھپا رکھا ہو۔ صرف یہی ایک لڑکا غار کے ایک گوشے میں چھپا ہوا سسک رہا تھا کہ سپاہیوں کی اس پر نظر پڑ گئی۔ میں نے ان کو اس کے قتل سے روکا اور ساتھ لے آیا اور اب آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ جو کچھ آپ اس لڑکے کے بارے میں فیصلہ کریں۔''

''ہوں......!'' بادشاہ نے لمبا ہنکارا بھرتے ہوئے وزیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکا ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔''

جب جلاد کی سونتی ہوئی تلوار کے سائے تلے وہ لڑکا دربار میں لایا گیا تو وزیر نے کورنش بجا لاتے ہوئے کہا ''جہاں پناہ یہ رہا وہ لڑکا۔''

جب بادشاہ نے سوچ میں ڈوبی نگاہیں اُٹھا کر اس سانپ کے بچے سنپولیے کو دیکھا تو چونک اٹھا۔ یہاں اس کے سامنے ایک لڑکی نما کمسن و نابالغ لڑکا کھڑا تھا جس کے چہرے پر ڈاکوؤں والی وحشت، بربریت اور اکھڑ پن کی جگہ رعنائی اور معصومیت اپنے حسن کا سونا بکھیر رہی تھی۔ جب وہ شاہانہ جاہ و جمال و جلال اور درباری طمطراق کے کروفر کو اپنی خوبصورت غزالی آنکھیں گھما گھما کر حیرت سے تک رہا تھا تو بادشاہ اس کے چہرے سے بمشکل اپنی نظریں ہٹا پایا۔ سچ پوچھیں تو بادشاہ کو یہ نابالغ لڑکا ایک ایسی نوخیز دوشیزہ کی طرح لگا جو منہ بند کلی کی طرح بہار کے اولین توانائی بخش جھونکے کی منتظر ہو۔

تب بادشاہ کے ادراک نے اسے اس فہم سے روشناس کرایا کہ اس کے وزیر باتدبیر نے اس لڑکے کو قتل کرنے میں حیل و حجت سے کام کیوں لیا تھا۔ اگرچہ وزیر کی دلیل بھی اپنی جگہ صحیح تھی۔ اس کے غصہ پر ترس کا چھینٹا پڑا اور ہمیشہ کے مدبر اور خداترس بادشاہ نے اس معاملہ کو اس طرح نظرانداز کیا کہ وہ تمام درباری جن میں وزیر کے بدخواہ اور حاسد لوگ بھی تھے، منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ لڑکا سرکاری خرچ پر وہیں پرورش پانے لگا۔ لڑکا ایک ماہ تک تو بے حد ڈرا سہما رہا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا اور وہ کسی کونے کھدرے میں چھپنے کی کوشش کرتا لیکن رفتہ رفتہ اس کا خوف دُور ہوتا گیا اور وہ اس ماحول میں رچنے بسنے لگا۔ پہلے تو پہاڑوں کے غاروں میں بنی سرنگوں میں چھپی جفاکشی اور مار دھاڑ کی زندگی تھی جس کے سر پر ہر دم خطرے کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ کبھی کھانے کو مل گیا تو کبھی فاقہ بھی ٹھیک مگر اب اسے یہاں شاہی مہمان جیسی زندگی میسر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچھی خوراک اور مناسب دیکھ بھال کی وجہ سے اس کی شخصیت تبدیل ہوتی گئی۔ وہ دل کو موہ لینے والا ایک پُرکشش اور خوبرو نوجوان نظر آنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ ماضی کے بھیانک دور سے ناطہ توڑ چکا ہے۔ اسے ایک اعلیٰ نسل خوبصورت گھوڑا مہیا کیا گیا تھا جس پر بیٹھا وہ کسی شہزادے سے کم نہ لگتا تھا۔ وہ گھڑسواری کرتے ہوئے دُور دُور تک نکل جاتا۔

اب وہ ایک مسرور پنچھی کی طرح فضاؤں میں ڈولتا پھرتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے کئی استاد رکھے گئے تھے جو اسے اعلیٰ اخلاقی درس دینے پر معمور تھے۔ ایک بہترین انسان بننے کے کیا قواعد و ضوابط ہوتے ہیں، یہ چیز نا صرف اسکے ذہن و دماغ پر نقش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی بلکہ ان اصولوں سے انحراف کیا کیا نقصانات عمل میں لاتا ہے، یہ امر بھی اسے پوری طرح باور کرانے کی کوشش کی جاتی رہی۔

بادشاہ اکثر اس کے اتالیقوں سے خود مل کر اس کے بارے میں معلومات لیتا جو کہ امید افزا ہونے کی نوید دیتے۔ بادشاہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ وہ ایک معصوم انسان کو گناہوں اور قتل و غارت کی دلدل میں دھنسنے سے بچا رہا ہے اور معاشرے کا کارآمد

فرد بنا رہا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بادشاہ نے لڑکے کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے ایک جاسوس بھی مقرر کر رکھا تھا جس کی مطلق کسی کو خبر نہ تھی۔ ایک دن ایک سیاہ پوش خاتون لڑکے کو ملنے آئی۔ اپنے طور اطوار اور چال ڈھال سے وہ عام عورتوں سے منفرد دکھائی دیتی تھی۔ اس کے حسین سراپے پر ملکاؤں جیسا حسن تھا اور جس والہانہ وارفتگی سے اس نے لڑکے کو گلے لگایا اور دیر تک چومتی رہی، اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہے۔ وہ کافی دیر تک ایک گوشے میں چھپے بیٹھے باتیں اور سرگوشیاں کرتے رہے۔ جب وہ خاتون جا رہی تھی تو جب تک اس کا گھوڑا نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا وہ لڑکا گھوڑے کے سموں سے اٹھتی گرد پر بھی نظر جمائے وہیں کھڑا رہا۔ بعد میں جب جاسوس نے ویسے ہی سرسری طور پر لڑکے سے پوچھا کہ وہ کون تھی تو پہلے تو وہ لڑکا گھبرا گیا لیکن گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا "نجانے آپ کس عورت کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہاں تو کوئی نہ تھا اور آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔" جس طرح وہ لڑکا اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کے منہ پر غلط بیانی کر رہا تھا وہ جاسوس کو بہت برا لگا۔ اس نے بادشاہ کو یہ بات بتائی۔ بادشاہ نے تاکید کی کہ اس کی بدستور نگرانی جاری رکھی جائے مگر اس کے بعد وہ لڑکا محتاط ہو گیا۔ وہ بڑے پراسرار انداز میں گھڑسواری کے لیے نکلتا اور کافی دیر بعد واپس آتا۔ اکثر وہ پہاڑ کی چوٹی کو غور غور سے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ اب وہ کھویا کھویا سا رہتا اور تعلیم میں بھی دل نہ لگاتا۔ بس ہر وقت اُکتایا سا رہتا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن بھی آ گیا اور ایک دن جب وہ گھڑسواری کے لیے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا۔ نہ تو شاہی مراعات اس کا دل لبھا سکیں نہ ہی اس پر کی گئی تعلیم و تربیت کی محنت اس کے پاؤں کی زنجیر بن سکی اور وہ دوبارہ واپس اپنی دنیا میں چلا گیا۔ شیخ سعدیؒ کا یہ قول سچ ہی نکلا کہ

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

یعنی بھیڑیئے کا بچہ بھیڑیا ہی بنتا ہے چاہے وہ انسانوں کے اندر ہی پرورش پا کر بڑا ہوا ہو۔

شیخ سعدیؒ جو کہ فارسی کے مشہور دانشور اور شاعر گزرے ہیں، ان سے یہ حکایت منسوب کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ایک شعر کے پیرایہ میں اس موضوع پر اس طرح فرما گئے ہیں کہ بغیر حسب نسب معلوم کیے کوئی بچہ گود نہ لیا جائے جبکہ وہ اتنا کمسن ہو کہ اپنے دنیاوی وجود کے بارے میں خود بھی کچھ نہ جانتا ہو۔ مسجد کی آخری سیڑھی پر رکھا گیا نوزائیدہ بچہ ہو یا ٹرین کی بوگی میں سیٹ پر پڑا رہ جانے والا بھوک سے بلکتا گمنام بچہ یا کسی بے اولاد جوڑے کے دروازے پر رکھا نوزائیدہ بچہ کیونکہ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ کل کو یہی بچہ اپنے پالنے والے کے لئے باعث خیر و برکت ہو گا یا مصائب کا پیش خیمہ کیونکہ جو بیج وہ اپنے ساتھ وراثت میں اپنے وجود اور دماغ کے ہارمونز میں بسا کر لائے گا وہی اس کی باڈی لینگوئج ہو گی۔ اس کا کردار اور اس کا مستقبل بھی ویسا ہی ہو گا۔ وہ جو کہاوت ہے: باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا، کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا"

☆.........☆.........☆

"سو یہی بات روشن پر صادق آتی ہے، اگرچہ اس کی پرورش اچھے ماحول میں ہوئی اور آصف اور وہ حقیقی بھائی بہن کی طرح زندگی گزارتے رہے لیکن اس نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنے پرائے کی تمیز بھی بھلا دی اور قتل جیسے گناہ کی مرتکب ہوئی۔"

آج روشن عمر قید کی سزا کاٹنے کے لیے جیل میں مخبوط الحواس قیدیوں جیسی زندگی گزار رہی ہے اور اس کا خاوند اظفر پھانسی کی سزا پا کر اپنی تمام خباثتوں سمیت دنیا سے رخصت ہوا۔

❀.........❀.........❀